تسہیلِ

برہان القرآن

جس میں قرآن مجید کے بے مثل و بے نظیر
ہونے پر حیرت انگیز دلائل دیئے گئے ہیں،

ازافادات

مفکرِ قرآن مجددِ عصر حضرت خواجہ احمد امرتسری رحمہ اللہ تعالیٰ

تسہیل

برہان القرآن

جس میں قرآن مجید کے بے مثل و بے نظیر
ہونے پر حیرت انگیز دلائل دیئے گئے ہیں،

ازافادات
مفکر قرآن مجدد عصر حضرت خواجہ احمد امرتسری رحمۃ اللہ تعالیٰ

دوست ایسوسی ایٹس
پرنٹرز۔ پبلشرز۔ سپلائرز
الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور

نام کتاب	تسہیل برہان القرآن
مصنف	حضرت خواجہ احمدؒ امرتسری
طبع اول	جنوری 1983
طبع دوم	مئی 1995
پبلشرز	دوست ایسوسی ایٹس
	الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
قیمت	-/150

اس کتاب کی اشاعت کے لئے ہم مکتبہ معارف القرآن گارڈن ایسٹ کراچی
کے تعاون کے شکر گزار ہیں

عرضداشت

بحضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا سَیِّدِیْ یَا رَسُوْلَ اللہِ
اَرْوَاحُنَا لَکَ الْفِدَاءُ

یارسول اللہ! ہم اور ہمارے ماں باپ آپ پر قربان، اس کتاب کے مؤلف و مرتب و ناشر نے اس کتاب کے پیش کرنے کی جرأت اس لئے کی ہے کہ خود آپ ہی نے بلا خوفِ لومۃ لائم حق کہنے کا سبق ہم غلاموں کو سکھایا ہے۔ آپ کی لائی ہوئی وحی (قرآن مجید) تو اس کا قدم قدم پر سبق دیتی ہی ہے کہ خدائی اطاعت کے ہمسر کوئی اطاعت نہیں۔ پیغمبر کی اطاعت، انتظامی اطاعت ہے نہ کہ خدا کی عابدانہ اطاعت کے برابر۔ اور یہ کہ تحلیل و تحریم کا حق صرف اللہ کو ہے کیونکہ عالم الغیب صرف وہی ہے، اصلی مالک و مطاع وہی ہے۔ احکم الحاکمین وہی ہے، اس لئے شارعِ حقیقی بھی صرف اور صرف اللہ ہی ہے۔ پیغمبروں کو تحلیل و تحریم اور شریعت بنانے کا حق حاصل نہیں۔ ان کا منصب تو تحلیل و تحریم اور شریعت کے الٰہی احکام کو پہنچا دینا اور انہیں عملاً نافذ کر دینا ہے اور بس۔

ان قرآنی احکامات کی توضیح میں آپؐ بھی ہمیشہ یہی اعلان فرماتے رہے اور اسی لئے عام روایات بھی آپؐ کا یہ سبق پیش کرنے پر مجبور ہوئیں اور ان میں آپؐ کا یہ ارشاد آج بھی موجود ہے کہ آپؐ نے قرآن کی اس آیت
اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَھُمْ ...... وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ (9/31-32)
ترجمہ:۔ ٹھہرا لیا انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب۔ اور اسی طرح مسیحؑ ابنِ مریم (نبی) کو بھی۔ حالانکہ

ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی عابدانہ اطاعت کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا کوئی اِلٰہ (عابدانہ اطاعت کا حقدار) نہیں سوائے اس کے۔ وہ پاک ہے ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی (وحیِ الٰہی) کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں۔ مگر اللہ اپنی روشنی (وحی الٰہی) کو مکمل غالب کئے بغیر ماننے والا نہیں ہے۔ خواہ منکروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو

کی تشریح میں یہی فرمایا کہ پیغمبروں اور فقہاء وصوفیاء کے ارشادات کو اللہ کے کلام کے برابر قرار دینا دراصل ان انبیاء وفقہاء وصوفیاء کو خدا کے برابر سمجھ لینا ہے جو قطعاً شرک ہے جیسا کہ آپؐ نے حضرت عدی بن حاتمؓ کے سوال کے جواب میں فرمایا تھا (ملاحظہ ہو ترمذی شریف اور اس آیت کی شرح میں تمام اہم تفاسیر)

اے رسولِ امین، اے خاتم النبیین، اے ہمارے آقا و سرتاج آپؐ کے اسی ارشاد کے پیشِ نظر ہم نے خدا اور رسول کی اطاعت کے درمیان فرق کو اس کتاب میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اگر آپ کی وحی (قرآن) اور آپ نے یہ فرق ہمیں نہ بتایا ہوتا۔ تو آپ کے رب کی قسم ہم اس کی کبھی جرأت نہ کرتے۔ اب اگر ہم اس فرق کو واضح کرنے میں کامیاب ہیں تو یہ آپؐ کی اور آپؐ کی لائی ہوئی وحی کی برکت ہے اور اگر ناکام ہیں تو اپنی کوتاہ عقلی پر شرم سار ہیں اور آپؐ کے حضور طلب گارِ عفو۔

غلامِ غلامانِ رسولؐ

مُرتب و ناشر

فہرس

حضرت خواجہ احمد کے شاگرد اور معتقدین

باب اول — اصل کتاب

باب دوم

باب سوم

باب چہارم

باب پنجم

باب ششم

تتمہ

کلماتِ عرشی

باسمہٖ تعالےٰ

عزیزِ[۱] گرامی! اسلام و رحمت

دریا کا پانی جو گذرتا جا رہا ہے، قیامت تک واپس نہیں آئے گا۔ کوئی قوت اور کوئی سائنس ایسی نہیں جو وقت کے بیتے ہوئے لمحات کو موڑ لائے۔ لیکن آپ نے یہ کتاب مجھے دے کر یہ معجزہ بھی کر دکھایا۔ میں اس کے مسودے کو پڑھ رہا ہوں اور اپنے آپ کو آج سے نصف صدی سے زیادہ پہلے کے اُس زمانے میں محسوس کر رہا ہوں۔ جب میں حضرت خواجہ احمد الدین[۲] رحمۃُ اللہ کے دروس و خطبات کی مجالس میں حاضر ہوتا اور ان کی زبان وحی ترجمان سے کتاب اللہ المجید کی تشریح و تفسیر میں ایسے ایسے نکتے سُنتا جن سے ہمارے تمام تفسیری ذخائر خالی ہیں۔ گویا وہ ماضی بعید حال بن کر میرے سامنے آگیا ہے۔

حضرت خواجہ رحمۃُ اللہ محض قال کے مرد میدان نہیں تھے۔ صاحبِ حال تھے۔ ان کی رگ رگ میں قرآن بسا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی محبت و خشیت سے ان کا سینہ معمور تھا۔ مجھ پر ان کے درس میں ایک موقع ایسا بھی آیا کہ قلب و روح پر ایک خاموش و عمیق وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی جو عارضی و ہنگامی نہیں تھا۔ اس نے میرے اندر قرار و استقلال حاصل کر لیا۔ پارۂ عمّ کے سورۂ انفطار میں ایک آیت ہے یٰٓاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ الخ[۳]

---

[۱] مولانا ابن قرآن سندھی کے نام حضرت خواجہ احمدؒ کے جانشین علامہ عرشی امرتسری کا گرامی نامہ

[۲] خواجہ صاحب کا اصل نام اگرچہ احمد تھا لیکن گھر والے انہیں اپنے ماحول کے زیر اثر احمد دین کہتے تھے اور اسی نے شہرت پائی۔ [۳] اے انسان! کس چیز نے تجھے اپنے مہربان آقا کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا؟ (۸۲/۶)

اس کی تفسیر میں ایک گھنٹے سے زیادہ صرف ہوا۔ اس میں کیا کیا علوم (تشریح الابدان وظائف الاعضا، حواس ظاہرہ و باطنہ۔ انسان کا کائنات سے رشتہ۔ قوت تسخیر بطن مادر میں تغیرات اور نشو و نما وغیرہ) بیان ہوئے اور ان پر ماہرانہ کلام ایسا کہ گویا ہر علم کے متخصص (سپیشلسٹ) ہیں۔ اس کے ساتھ ربوبیت اور کریمی کی ایسی پیاری کرم گسترانہ محبت و رافت و رحمت کی تجلیات، گویا جنیدؒ کا سلوک و عرفان ابن سینا کی طبی تحقیقات اور غزالی کی فقہ آمیز اخلاقیات حضرت خواجہؒ کے ایک وجود میں مجتمع و مرتکز معلوم ہوتی تھیں، کیا عرض کروں۔ کاش اُس زمانے میں ٹیپ ریکارڈ ایجاد ہو چکا ہوتا تو ان کے خطبات کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کیا جا سکتا۔ وہ قرآن کی بے مثلیت کے منکروں کے خلاف عدالتِ الٰہیہ میں قرآن کی وکالت کرتے ہوئے دلائل و براہین کے انبار لگا دیتے ہیں۔ گذشتہ صدیوں میں قرآن کی عظمت کے معترف بے شمار بزرگ ہو گذرے ہیں، لیکن یہ منفرد شرف انہی کو حاصل ہوا۔

ملک الشعراء کلیم کو شاہ جہان نے ایک قصیدۂ مدحیہ کے انعام میں سونے سے تلوا دیا تھا۔ اس کتاب میں قرآنِ حکیم کی کاملیت، بے مثلیت اور کفایت سے متعلق جو براہینِ قاطعہ اور بصائرِ بیّنہ فراہم کر دیئے گئے ہیں۔ ان کے سامنے سونا تو کیا جواہرات بھی حقیر سنگ ریزوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ ان کی قدر وہی لوگ پہچان سکتے ہیں جو اللہ والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے رشتہ استوار رکھتے ہیں اور صبغۃ اللہ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ اس تعؒ کا کلام ان کے قلوب و ارواح اور کردار و اعمال میں رچا ہوا ہے ؎

قدرِ زر زرگر بداند ، قدرِ جوہر جوہری

بر سماعِ راست ہر تن چیر نیست   طعمۂ ہر مرغکے انجیر نیست

فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ اے نبی! بشارت دے دو میرے الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۔ بندوں کو جو بات کو غور سے سنتے ہیں اور

سابقہ کا حوالہ دینے کا انداز معز دیع

أُولَئِكَ الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللَّهُ وَأُولَئِكَ هُمْ أُولُو الْأَلْبَابِ ۔ (۳۹-۱۷ / ۱۸) — اس کے بہترین پہلو کی پیروی کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے اور یہی دانشمند ہیں۔

میں نے اپنی طویل عمر میں قرآن کا جمال بے نقاب اگر کہیں دیکھا ہے تو حضرت خواجہؒ کی صحبت میں۔ ورنہ ہر مسند ارشاد و افتاء میں اس پر اکاذیب واباطیل اور قصہ کہانیوں کی اتنی تہیں چڑھا دی گئی ہیں کہ ان کے نیچے سے اس کو نکالنا اتنا مشکل ہو گیا ہے کہ سوائے انتہائی اولوالعزم اور جرأت مندوں کے کوئی اس کی ہمت نہیں کر سکتا۔ بعض جدید قسم کے لوگ ان تہ بہ تہ مقدس غلافوں کو اتار پھینکنے کی جرأت کرنے لگے ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر حضرات مغرب کے دل فریب تعقّل کا شکار ہو کر قرآنی روح سے بیگانہ رہ گئے ہیں اور جو اہلقرآن کہلائے وہ علیٰ حرفٍ[1] سے آگے نہ بڑھ سکے۔

حضرت خواجہؒ صاحب کی پُرمغز تحریروں اور مدلّل خطبات سے ہر طبقے کے خواص متاثر ہوئے ہیں۔ مشاہیر میں سے علامہ اسلم جیراجپوری اور علامہ اقبال نے نہایت گہرائی سے خواجہ صاحب کا مطالعہ کیا تھا۔ میں ذاتی علم کی بنا پر وثوق سے کہتا ہوں کہ ان دونوں بزرگوں کی کایا پلٹ ہو گئی۔ اقبال نے کھل کر اعلان کر دیا کہ

یہ اُمّت روایات میں کھو گئی
حقیقت خرافات میں کھو گئی

ان کے مکاتیب سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے دل میں حضرت خواجہؒ کی کتنی قدر و منزلت تھی۔ علامہ جیراجپوری نے ایک دفعہ پروفیسر رازی[2] مرحوم کے ذریعے

---

[1] انتہا پسندی اور یک رخے پن سے۔ [2] پروفیسر فیروز الدین رازی حضرت خواجہؒ کے انتہائی عقیدتمندوں میں سے تھے۔ اسلامیہ کالج لاہور میں فارسی کے استاد تھے۔ ان کی بعض کتابیں پنجاب یونیورسٹی کے ایم اے فارسی کے نصاب میں شامل ہیں۔ فارسی زبان میں ان کی مہارت پر حکومت ایران نے انہیں سرکاری اعزاز سے نوازا تھا۔

خواجہ صاحب کو سلام بھیجا اور یہ کہا تھا کہ ان کے پاؤں کو چھو کر میری طرف سے سلام کہنا۔ یہ میرا چشم دید واقعہ ہے کہ جب رازی مرحوم نے علامہ اسلم صاحب کی طرف سے آپ کے پاؤں چھونا چاہا تو آپ کو سخت ناگوار گذرا، اور فرمایا، تعجب ہے [redacted] (اسلم صاحب) موحد ہو کر ایسا کس طرح کہہ سکتے ہیں؟

عرشی ۶/۹/۸۲

بے مثل قرآن

قرآن مجید کے متعلق اللہ تعالیٰ کا چیلنج ہے کہ اس قرآن کے مثل دنیا میں اور کوئی بھی چیز نہیں ــــ اور اگر کوئی اس چیلنج کا جواب دینے کی جرأت کرتا ہے تو حکم ہوا کہ پھر فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ (۲/۲۳) اسکی ایک سورۃ کی مثل ہی بنا کر لے آؤ

بلکہ یہاں تک فرمایا:۔

فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ (۵۲/۳۴) اس کی مثل ایک حدیث ہی بنا کر لے آئیں، اگر وہ سچے ہیں۔

قرآن مجید کا یہ چیلنج قبول کرنے کی کسی غیر مسلم کو تو آج تک جرأت نہیں ہوئی لیکن منافقینِ اسلام نے مندرجہ ذیل روایت گھڑ کر اس چیلنج کا جواب دینے کی کوشش کی کہ نعوذ باللہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

أَلَا إِنِّي أُوتِيتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ۔ خبردار رہو! مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ویسی ہی (اسکی مثل) ایک اور چیز بھی۔

(سنت کی آئینی حیثیت ص۳۵۷ از مودودی صاحب)

یہ ہم مسلمانوں کی کتنی غفلت ہے کہ اللہ اور اسکے کلام پاک قرآن مجید کے مقابلہ میں گھڑی ہوئی اس روایت کو آج تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کئے جا رہے ہیں حالانکہ خدا اور رسولؐ پر یہ جھوٹ بول کر ہم مسلسل انکے غضب کے مستحق بنتے جا رہے ہیں۔

(اللھم اھدنا الصراط المستقیم۔)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مؤلفِ کتاب

حضرت خواجہ احمدؒ امرتسری

۱۸۶۱ء ــــــ ۱۹۳۶ء

از

ابنِ قرآن سندھی

مفکرِ قرآن حضرت خواجہ احمدؒ پنجاب کی خواجہ برادری کے ایک غریب گھرانے میں جناب شیخ میاں محمد صاحب کے ہاں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ سنِ ولادت ۱۸۶۱ء ہے۔ محترم والد نے اپنے بزرگ اور مشہور اہلحدیث عالم مولانا غلام علی قصوری سے بچے کا نام رکھنے کی فرمائش کی جس پر انہوں نے والد کے نام کی مناسبت سے اور بطور برکت نونہال کا نام 'احمد' رکھا، جسے گھر کے بعض بزرگوں نے 'احمد دین' کر دیا، اور یہی نام زبان زدِ خلائق رہا۔ خواجہ احمد کی باقاعدہ تعلیم مشن اسکول میں میٹرک تک ہوئی اور اسکے بعد اپنے گھرانے کی کفالت کی خاطر اسلامیہ ہائی اسکول امرتسر میں ریاضی کے معلم کی حیثیت سے کام شروع کر دیا، ساتھ ہی مطالعہ کے ذریعے مختلف علوم وفنون میں اپنی قابلیت میں اضافہ کرتے رہے ــــ دینی تعلیم حضرت مولانا غلام علی قصوری (مشہور اہلحدیث عالم) سے حاصل کی۔

خواجہ صاحب کو آٹھ زبانوں پر عبور حاصل تھا، پنجابی تو مادری زبان تھی، اس کے علاوہ اردو، فارسی عربی اور انگریزی میں فاضلانہ مہارت تھی اور بھاشا (آریہ سماجی لٹریچر سمجھنے کے لئے)، گورمکھی (سکھ دھرم کے سمجھنے کیلئے)

اور پشتو حسب ضرورت جانتے تھے۔

ریاضی کی تمام شاخوں الجبرا، ٹرگنومیٹری، حساب، جیومیٹری، کیلکولس اور منطق اور فلسفہ سے اتنا انہماک تھا کہ شہر بھر میں اس تفوق میں معروف تھے۔ علم بیان و بدائع و معانی اور عروض پر ناقدانہ بصیرت رکھتے تھے۔

جغرافیہ و تاریخ عالم کا عموماً اور تاریخ اسلام کا خصوصاً وسیع مطالعہ کیا تھا۔ طبقات الارض، علم و نباتات، علم حیوانات اور فلکیات کے علمی مشاہدات سے گہرا تعلق تھا۔ موسیقی کے رمز آشنا تھے اور مختلف زبانوں کے علم اللغات سے خصوصی شغف تھا۔

مطالعۂ ادیان کے لئے تو عمر کا بیشتر حصہ وقف ہی کر رکھا تھا۔ قرآن مجید کے علاوہ بائبل (عہد نامۂ قدیم و جدید) پر مکمل عبور تھا۔ وید، گرنتھ، منوسمرتی، اپنشد، ستیارتھ پرکاش اور بہائی و قادیانی مذہب کی بنیادی کتب پر عالمانہ نظر تھی۔

امام فخرالدین رازی کی تفسیر کبیر اور صحاح ستہ کے مجموعہ جامع الاصول اور اس کی تجرید کا ایک ایک صفحہ ان کی نظر میں تھا۔ علم الفقہ کے فن میراث پر ان کی معجزۃ القرآن نامی وہ مجتہدانہ کتاب ہے جس نے اپنے مخالفین تک سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ اور سید سلیمان ندوی نے حیرت آمیز مسرت کے ساتھ اس کا استقبال کیا ہے رہا مقام قرآن و حدیث کی توضیح کے سلسلے میں اُن کا بلند مقام ــــ سو اس کو اتنے مفصل و مدلل انداز میں اور مکمل توازن کے ساتھ پیش کرنیکی سعادت ایک ہزار سالہ اسلامی تاریخ میں سوائے خواجہ احمد کے کسی کو حاصل نہیں ہوئی۔

مولانا غلام علی قصوری | خواجہ صاحب کے اُستاد محترم مولانا غلام علی قصوری امرتسر کے اہم ترین مذہبی اکابر میں سے

تھے۔ اہلحدیثوں کی نامور شخصیت مولانا ثناء اللہ امرتسری کے اُستاد مولانا احمد اللہ صاحب امرتسری بھی مولانا قصوری کے شاگردوں میں سے تھے۔
چونکہ خواجہ احمد صاحب کی تعلیم مشن ہائی اسکول میں ہوئی تھی۔ جہاں دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ بائبل بھی پڑھائی جاتی تھی، اور باقی مضامین کی طرح خواجہ صاحب اسے بھی پوری دلچسپی کے ساتھ پڑھتے اور تمام مضامین کی طرح اس میں بھی ہمیشہ اپنی کلاس میں اوّل آتے تھے۔ اسلئے اس گہرے مطالعہ کا یہ اثر ہوا کہ آپ نے بائبل پر تنقیدی نگاہ ڈالی اور اس کے بعض مسائل کو ناقابلِ قبول دیکھ کر آپ کی توجہ قرآنِ حکیم کے مطالعہ کی جانب مائل ہوئی چنانچہ آپ حضرت مولانا غلام علی قصوری کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ اور کچھ ہی عرصہ میں یہاں بھی سب ساتھیوں پر فوقیت لے گئے۔ خواجہ صاحب کی طبیعت کی جولانیاں دیکھ کر مولانا مغفور آپ سے بہت محبت و شفقت سے پیش آنے لگے یہاں تک کہ بارہا آپ نے بھری مجلس میں فرمایا کہ میری جسمانی اولاد میں تو میرا صحیح جانشین کوئی نہیں البتہ میری روحانی اولاد میں یہ (خواجہ احمد کی طرف اشارہ کر کے) سب سے زیادہ ہونہار ہے۔

یہ حضرت قصوری پہلے انتہائی غالی بریلوی خیالات کے تھے لیکن طبیعت میں ذوقِ تحقیق اور قبولِ حق کی استعداد تھی، نتیجۃً توحید کے علمبردار ہو گئے، اس سلسلہ میں ان کی زبردست مخالفت ہوئی۔ مخالفوں نے ایذا و آزار میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ یہاں تک کہ "گیارہویں کی چائے" کی توہین کا جعلی مقدمہ آپ کے خلاف دائر کر دیا گیا، انگریزوں کیخلاف باغیانہ خیالات کی وجہ سے رؤسا و حکام مخالف تھے ہی، مقدمہ دائر کرنے والوں نے ان کے ساتھ مل کر اور شہر کے امن کو خطرے میں ظاہر کر کے دو سَو روپیہ (جو اُس زمانہ کے درویش کے لئے آج کے بیس ہزار سے بھی زیادہ تھے) جرمانہ کرا دیا۔ لیکن ان تمام آزمائشوں کے باوجود مولانا قصوری کا

ذوقِ توحید بڑھتا ہی گیا۔ اور انہوں نے باطل کے سامنے کبھی سرخم نہیں کیا، بالآخر ان کے روزانہ درسِ قرآن، خطباتِ جمعہ اور درسی سلسلے نے اس شہر کی فضا بدل اور امرتسر اہلحدیث حضرات کا ایک مضبوط مرکز بن گیا۔

مولانا قصوری چونکہ فطرت سے قلبِ سلیم لے کر آئے تھے اس لئے وہ کوئی جامد قسم کے اہلحدیث نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ناتمام تفسیر (غیر مطبوعہ) میں حضرت مسیحؑ کی حیات و وفات و معجزات پر جو بحث کی گئی ہے، وہ عام اہلحدیثی نقطۂ نظر سے بالکل جدا ہے، اور اسی لئے باوجود خواجہ احمد کی کوششوں کے اہلحدیث حضرات نے مولانا قصوری کے صاحبزادے کو یہ کہہ کر کہ اس تفسیر کے شائع ہونے کے نتیجہ میں تمہاری امامت و خطابت خطرے میں پڑ جائے گی، اُن کی یہ تفسیر شائع نہیں ہونے دی۔

حدیث کے صحیح مقام کے متعلق حضرت خواجہ احمد نے جو نقطۂ نظر پیش کیا ہے اور جسے مختلف حلقوں میں قبولِ عام حاصل ہوا (جس کے متعلق خواجہ صاحب کی دو اہم تحریریں آپ زیرِ نظر مجموعہ میں ملاحظہ فرمائیں گے) اس کی ابتداء بھی مولانا قصوری کے ایک وعظ سے ہوئی۔ یہ وعظ ایک رسالہ کی صورت میں شائع بھی ہو گیا ہے۔ اسکا سالِ طباعت ۱۸۷۸ء ہے، رسالہ کا نام "تذکرۃ الحق در مسئلہ قرطاس" ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ یہ وعظ ۱۵ صفر ۱۲۹۳ھ روز یکشنبہ ایک مجلس میں مسئلۂ قرطاس سے متعلق ارشاد ہوا۔

اس وعظ میں مولانا قصوری نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری وقت میں حضرت عمرؓ کے الفاظ عِندَکُمُ القُرآنُ وَحَسبُنَا کِتَابُ اللہ (تمہارے پاس قرآن مجید موجود ہے۔ اور اللہ کی یہ کتاب ہمارے لئے کافی ہے) کی توضیح کی ہے کیونکہ یہ مسئلہ سُنی شیعہ کے درمیان انتہائی اہم اور معرکۃ الآراء مبحث ہے۔ اس وعظ میں مولانا قصوری نے حضرت عمرؓ کے اس نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"مسلمانوں کے تمام گروہ یہ مسلّمہ اصول مانتے ہیں کہ

انبیاء علیہم السلام تبلیغ احکام الٰہی میں معصوم ہیں، حکم الٰہی پورا پورا پہنچاتے ہیں۔ بلاقصور و بلا تمیز، کچھ تغیر و تبدل نہیں کر سکتے ــــ اس کے علاوہ باقی معاملات میں، جتنی صفتیں بشریت کی ہیں سب نبیوں میں ہوتی ہیں۔ مثلاً رنج ہونا، خوش ہونا، دشمن سے خوف کرنا، تدبیر بہتری کی کرنا، بیمار ہونا، بھوک لگنا، نکاح کرنا، شہوت کا ہونا، بھولنا"

اس کے بعد نماز اور دوسرے معاملات میں آنحضرت کے بھولنے کی بخاری و مسلم سے کئی روایات نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"نبیؐ کے امر دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک وحی سے، دوسرا اپنی طرف سے بطور مشورہ کے، چنانچہ اس کی دلیل کے لئے وشاورهم فی الامر (معاملات میں لوگوں سے مشورہ کر) کا قرآنی حکم کافی ہے۔ جب حکم مشورہ کا ہوا تو ظاہر ہے کہ وحی میں مشورے کی گنجائش نہیں" (ص۹)

اس کے بعد حضرت بریرہؓ کا واقعہ دیا ہے، عبداللہ بن اُبی منافق کے متعلق حضرت عمرؓ کے مشورے کی صحت کی روایت دی ہے، صلح حدیبیہ کے موقعہ پر حضرت علیؓ کے حکم نبوی کو ماننے سے انکار کی روایت دی ہے اور بخاری کی کتاب التفسیر (سورۂ بنی اسرائیل) کی یہ روایت دی ہے کہ:

"بخاری میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے گئے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی اور فاطمہ رضی اللہ عنہما کو سوتے پایا۔ فرمایا کہ اے علیؓ و فاطمہؓ اُٹھ کر تہجد کی نماز پڑھو۔ علیؓ نے جواب دیا وَاللهِ مَا نُصَلِّي اِلَّا مَا كَتَبَ اللهُ عَلَيْنَا یعنی یہ کہا کہ ہم نفل نماز نہیں پڑھیں گے، صرف فرض نماز پڑھیں گے" (ص۱۰)

اس کے بعد حدیث قرطاس کی مختلف روایتیں دے کر لکھتے ہیں:

"سب کو یہ پختہ معلوم تھا کہ حضرت کا یہ امر بطور مشورہ کے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی (سورۂ مائدہ) ....اگر یہ امر وجوبی ہوتا تو خواہ مخواہ لکھتے ... معلوم ہوا کہ ان اصحاب کے نزدیک نہ لکھنا بہتر تھا .... جب اللہ نے فرمایا کہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں چھوڑی جو قرآن میں بیان نہ کی ہو حضرت عمرؓ نے اس پر خیال کر کے کہا کہ کتاب اللہ ہم کو بس ہے اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم چپکے رہے اور حضرت عمرؓ کا کہنا پسند رکھا کیونکہ حضرت کا چپکا رہنا موجب اس امر کے مشروع ہونے کا ہے۔" (ص ۱۵)

اس وعظ کی آخری سطور میں بعض سوالات کے جواب دیئے گئے ہیں مثلاً ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ :۔

"حاضرین حجرہ نے امر رسولؐ کا خلاف کیا، حالاں کہ امتثالِ امرِ پیغمبرؐ واجب ہے، جواب یہ ہے کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ امتثال اس امر کا واجب ہے جو وحی سے ہو، اگر بطریقِ مشورہ ہو تو امتثال واجب نہیں۔"

ایک اور سوال یہ ہے کہ

"اللہ تعالیٰ پیغمبر کے حق میں فرماتا ہے وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ (النجم) یعنی پیغمبر اپنی خواہش سے کلام نہیں کرتا، وحی سے کلام کرتا ہے، تو حاضرین حجرہ نے وحی کا ردّ کیا جواب یہ عام نہیں صرف کلام اللہ پر وارد ہے اگر عام ہو تو حکم مشورہ کا کیوں ہوتا؟ کیوں کہ مشورہ وحی میں ممکن نہیں۔" (ص ۱۶)

یہ تھا وہ وعظ جس نے حضرت خواجہ احمد کے خیالات کی رو بدل دی۔
معلوم نہیں کتنی مرتبہ اپنے درس و مطالعہ میں وہ اس روایت سے گذرے تھے۔ لیکن فطرت بعض اوقات سوچنے والوں کے دل و دماغ پر کسی نکتہ کو پوری طاقت و صراحت سے اس طرح منکشف کرتی ہے کہ پھر اس کے نتیجے میں دنیائے علم و فن میں ایک نیا انقلاب آجاتا ہے۔ آخر درخت سے سیب گرتے سب ہی دیکھتے ہیں، خود نیوٹن ایک خاص وقت سے پہلے کتنی مرتبہ یہ منظر دیکھ چکا تھا۔ لیکن اللہ کو جب اس سے کام لینا ہوا تو اس کے دل و دماغ کو قانون کششِ ثقل کی طرف اس طرح متوجہ کیا کہ پھر دنیائے سائنس کے زمین آسمان بدل گئے۔

اس موضوع پر خواجہ صاحب کے خیالات تو آپ آگے چل کر ملاحظہ فرمائیں گے۔ ابھی تو اتنا سن لیجئے کہ مولانا غلام علی قصوری کے یہ خیالات اگرچہ عام اہلحدیثوں اور روایت پرستوں کے نظریات سے مختلف ہیں، کیونکہ وہ پیغمبرؐ کے ہر قول و فعل کو وحی الٰہی سمجھتے ہیں اور آیتِ قرآنی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (۵۳/۴) میں ھو کی ضمیر کو بجائے قرآن مجید کے آنحضرتؐ کے ہر نطق کے متعلق سمجھتے ہیں۔ لیکن مولانا قصوری اپنے اس خیال میں منفرد نہیں ہیں۔ بلکہ اور بھی کئی محقق علماء و صوفیا اس کے قائل ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی اپنے رسالہ "ردِّ روافض" میں شیعوں کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

حضرت مجددؒ اور وحی و حدیث

اب ہم خدائے بزرگ و برتر کے ارشادات کی مضبوط رسی تھام کر شیعہ کے بے بنیاد اعتراضات کے جوابات دینا شروع کرتے ہیں۔ بیشک خدا ہر چیز پر قادر ہے اور ہماری دعا قبول کرنے کے لئے سزاوار ہے۔

علمائے ماوراء النہر کی پہلی دلیل

علماء ماوراء النہر شکر اللہ سعیہم نے اپنے رسالہ میں دلائلِ تکفیرِ شیعہ کے سلسلے میں یہ دلیل پیش کی تھی

"کہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے ثلاثہ (ابوبکر، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم) کی بیحد تعظیم و توقیر فرماتے تھے۔ ہر ایک کی تعریف میں بہت سی حدیثیں[ع] پائی جاتی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اقوال وافعال اس آیت کریمہ کے مطابق "کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خواہش کی بنا پر تکلم نہیں فرماتے۔ جو کچھ وہ فرماتے ہیں وہ وحی کے سوا کچھ نہیں" وحی پر مبنی ہیں (لہٰذا احادیث مدح صحابہ بھی وحی پر مبنی ہیں) اور شیعہ صحابہ کی مذمت کرکے وحی کی مخالفت کرتے ہیں اور وحی کی مخالفت کفر ہے۔ (اس لئے وہ کافر ہیں)

جوابِ از جانبِ شیعہ

شیعہ نے علمأ ماوراالنہر کی اس دلیل پر معارضہ کرتے ہوئے اپنے رسالہ میں یہ کہا کہ سنی علمأ کی خود اس دلیل سے ہی خلفائے ثلاثہ کی مذمت اور ان کی خلافت کا باطل ہونا ثابت ہوجاتا ہے کیونکہ شرح مواقف میں آمدی سے جو اہلِ سنت کے اکابر میں شمار ہوتے ہیں، منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت اہلِ اسلام میں باہمی اختلاف رونما ہوگیا تھا۔ پہلا اختلاف تو یہ تھا کہ حضرت پیغمبر علیہ السلام نے مرض موت میں فرمایا کہ

"میرے پاس کاغذ لاؤ تاکہ تمہارے لئے وہ تحریر لکھ دوں جس پر کاربند رہ کر تم میرے بعد گمراہ نہ ہوسکوگے۔"

لیکن حضرت عمرؓ کاغذ لانے پر رضامند نہ ہوئے بلکہ یہ کہا:

حضرت (رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم) پر تکلیف کا غلبہ ہے اور ہمارے پاس خدا کی کتاب موجود ہے جو ہدایت کے لئے کافی ہے۔"

پھر صحابہ کے درمیان بڑا اختلاف ہوا، آوازیں اونچی ہونے لگیں۔ اس پر حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے آزردہ ہوکر فرمایا،

"یہاں سے اُٹھ جاؤ کہ میرے رُوبرو جھگڑنا مناسب نہیں۔"

اور دوسرا اختلاف یہ تھا کہ مذکورہ واقعہ کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت مقرر فرمائی کہ اسامہؓ کے ہمراہ سفر پر جائیں لیکن اسی جماعت

ع علمار ماوراالنہر کے اس قول پر حضرت مجدد کے ارشادات کے بعد ہمارا تبصرہ ملاحظہ فرمایئے۔

میں سے بعض نے روگردانی کی۔ یہ بات حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ نے مکرر زور دے کر فرمایا۔

"اسامہ کے لشکر کو تیار کرو۔ اللہ کی لعنت ہو اس پر جو روگردانی کرے۔"

مگر اس کے باوجود بھی ان بعض صحابہ نے روگردانی کی اور تعمیل ارشاد نہ کی۔

شیعہ دلائل

(۱) پس اب ہم شیعہ کہتے ہیں کہ وہ حکم جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت لکھنے کے بارے میں (کاغذ لانے کا) فرمایا تھا خود سنیوں کی ذکر کردہ آیت کے بموجب وحی ہے پھر اس پر جو مخالفت حضرت عمرؓ نے کی وہ اس وحی کی مخالفت اور تردید ہے اور وحی کی تردید کفر ہے جیسا کہ خود سنیوں نے اقرار کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا قول بھی یہ ہے کہ

"جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکام کی تعمیل نہ کریں وہ کافر ہیں۔"

یہ آیت بھی اسی پر دلالت کرتی ہے اور کافر پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کی خلافت کے لائق نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح لشکر اسامہ سے روگردانی کرنا دلیل مذکور کی بنا پر کفر ہے اور روگردانی کرنے والے تینوں خلفاء ہیں

(۲) نیز علماء ماوراء النہر نے اپنے رسالہ میں اعتراف کیا ہے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل بھی وحی ہوتا ہے اور واقعہ بھی یونہی ہے۔ پس ہم (شیعہ) کہتے ہیں کہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کا مروان کو مدینہ سے شہر بدر کر دینا بلاشبہ وحی ہے۔ پس حضرت عثمانؓ کا مروان کو مدینہ میں واپس لے آنا اور اس کو بعض امور سونپنا اور اس کی تعظیم کرنا دو وجہ سے کفر ہے۔ پہلی وجہ تو وہی جو حضرات (علماء) نے فرمائی اور دوسری وجہ باری تعالیٰ کا یہ قول (ترجمہ)

تم مومنین کی جماعت کو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہے۔ ایسا نہ پاؤ گے کہ وہ ان لوگوں سے دوستی کرے جو خدا اور رسولِ خدا کے مخالف ہیں۔ خواہ وہ مخالفت کرنے

والے مومنین کے باپ دادا ہوں یا بیٹے پوتے ہوں یا بھائی ہوں یا اور کنبہ دار ہوں"

حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کا فیصلہ اقوال شیعہ کا ردّ اور قول علماء کی تصحیح

اللہ کی توفیق اور حفاظت کے بھروسہ پر میں عرض کرتا ہوں کہ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام افعال واقوال (اجتہادی وغیر اجتہادی) سب بموجبِ وحی ہوتے ہیں اور آیت النجم کو ثبوتِ شہادت میں پیش کرنا دلیل تام نہیں اس لئے کہ:۔

وحی صرف قرآن ہے

آنحضرتؐ کے قول کا بموجبِ وحی ہونا قرآن کے ساتھ مخصوص ہے چنانچہ قاضی بیضادی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ کا مطلب یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کا تکلم بالقرآن خواہش نفس کی بنا پر صادر نہیں ہوتا۔

نیز اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے تمام اقوال وافعال وحی کے ماتحت ہوتے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعض اقوال وافعال پر (خدا کی طرف سے) اعتراض نہ ہوتا اور عتاب نہ آتا جیسا کہ اس آیت میں آیا۔

ترجمہ:۔ اے نبی تم کس لئے ایسی چیز کو اپنے اوپر حرام کرتے ہو جسے اللہ تعالےٰ نے تمہارے لئے حلال کیا ہے۔ کیا تم اپنی بیویوں کی رضا جوئی میں لگ گئے ہو"۔ (۲۸/۱)

دوسری جگہ فرمایا:۔

خدا نے آپ کو معاف کیا آپ نے انہیں اجازت کیوں دی تھی؟ الخ" (۹/۴۴)

تیسری جگہ (اسیرانِ بدر کے واقعہ میں) ارشاد ہوا۔

" نبی کے لئے یہ حق نہیں کہ اس کے لئے اسیرانِ جنگ ہوں یہاں تک کہ (راہِ خدا میں) کفار کے قتل وخون کو حدِ نہایت کو پہنچا دے کیا تم دنیوی سامان کے لالچ میں پڑ گئے ہو" (۸/۴۴)

چوتھی جگہ منافقین کی نمازِ جنازہ کے واقعہ میں حکم آیا۔

"منافقین میں سے جو مر جائے اس کی نمازِ جنازہ آپ ہرگز نہ پڑھیں" (۹/۸۴)

ایک روایت کی رو سے اس ممانعت کا ورود اس وقت ہوا جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابن ابی منافق کی نمازِ جنازہ ادا کر چکے تھے اور دوسری روایت کے اعتبار سے نمازِ جنازہ ادا کرنے سے پہلے مگر نماز ادا کرنے کا ارادہ فرما لینے کے بعد ممانعت وارد ہوئی۔ بہرحال دونوں صورتوں میں فعل سے باز رکھنا پایا جاتا ہے۔ خواہ وہ اعضاء کا فعل ہو یا قلب کا۔ اس قسم کے معاملات کا ذکر قرآن میں بکثرت ہے اس لئے ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اقوال اپنی رائے اور اجتہاد کے تحت ہوں۔ (یعنی از روئے وحی نہ ہوں) چنانچہ قاضی بیضاوی قولِ باری تعالیٰ ماکان لنبی الآیہ کی تفسیر کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ

"یہ آیت اس امر کی دلیل ہے کہ انبیاء علیہم السلام (بعض اوقات) اجتہاد سے بھی کام لیتے ہیں اور وہ اجتہاد کبھی خطا بھی ہو جاتا ہے مگر انبیاء کو خطا پر قائم نہیں رہنے دیا جاتا" (فوراً وحی کے ذریعہ خدائے تعالیٰ کی طرف سے اصلاح کر دی جاتی ہے)

اجتہادی امور میں صحابہ کا حضورؐ کے ساتھ اختلاف

اور صحابہ کرام بھی عقلی اور اجتہادی معاملات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اختلافِ رائے کی گنجائش رکھتے تھے۔ اور بعض اوقات وحی خداوندی (رائے نبوی کے بجائے) صحابہ کی رائے کے موافق نازل ہوئی ہے جیسا کہ اسیرانِ بدر کے بارے میں وحی، امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کی موافقت میں اتری کیونکہ (تبلیغ رسالت اور اشاعتِ اسلام کیطرف بیشتر متوجہ رہنے کی وجہ سے) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توجہ عقلی اور تدبیر معاملات کی طرف کمتر رہتی تھی۔"

(ترجمہ ردّ روافض ناشر ادارہ سعدیہ مجددیہ لاہور ۱۹۶۸ء)

ہمارا تبصرہ:- اس پوری بحث کو پڑھنے کے بعد آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ ماوراء النہر (بخارا وغیرہ) کے علماء کے اس قول نے کہ آنحضرت کا ہر ارشاد وحی ہوتا

ہے، شیعہ حضرات کو خود انہی پر وار کرنے کا کتنا موقعہ فراہم کیا۔ اسی لئے حضرت مجدد کو انکے اس غلط قول کی تصحیح کرنی پڑی اور آپ نے قرآن و حدیث و عقل ہر چیز سے یہ واضح کیا کہ وحی صرف قرآن ہے اور باقی ارشادات نبوی بشری حیثیت کے مطابق ہیں۔

○ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ جلد اوّل کے باب "بیان اقسام علوم النبی صلی اللہ علیہ وسلم" میں یہی کہا ہے کہ آنحضرتؐ نے بحیثیت رسول جو کچھ ارشاد فرمایا وہ تو واجب الاتباع ہے لیکن بشری حیثیت سے جو کچھ آپؐ نے فرمایا یا عملاً کیا ہے وہ قیامت تک کے لئے واجب الاتباع نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحب آنحضرتؐ کے ہر قول و فعل کو وحی الٰہی نہیں سمجھتے اور اسی لئے انہوں نے اپنے ترجمۂ قرآن "فتح الرحمان" (مطبوعہ تاج کمپنی) میں سورۂ النجم کی آیت وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ سے مراد صرف قرآن لیا ہے۔ مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو "شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ" از مولانا عبید اللہ سندھی شائع کردہ سندھ ساگر اکیڈمی لاہور، خصوصاً اس کا باب سوم اور عنوان "اسلام کے قانونِ اساسی"۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے بھی اپنی کتاب تحفۂ اثنا عشریہ کے باب المطاعن میں حضرت عمرؓ پر شیعوں کے پہلے طعن کے جواب میں اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے اور حضرت مجدد الف ثانی کے مضمون کو زیادہ مفصل طور پر بیان کیا ہے اور سورۂ النجم کی اس آیت سے مراد صرف قرآن لیا ہے۔ (تحفۂ اثنا عشریہ کا اردو ترجمہ نور محمد تاجر کتب آرام باغ کراچی کے ہاں سے شائع ہو چکا ہے)۔

○ صحیح مسلم میں تو ایک پورا باب اسی اصول کی وضاحت کے لئے ہے۔ اس کا عنوان ہی یہ ہے۔ باب وجوب امتثال ما قالہ شرعاً دون ما ذکرہ صلی اللہ علیہ وسلم من معایش الدنیا علی سبیل الرأی۔

(یعنی باب اس بیان میں کہ واجب صرف ان ارشادات کی پیروی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شرعی حیثیت سے فرمائے ہیں نہ کہ اُن باتوں کی جو دنیا کے معاملات میں آنحضورؐ نے اپنی رائے اور اجتہاد سے بیان فرمائی ہیں)

○- فقہائے احناف و مالکیہ کے نزدیک بھی اسی طرز کی ایک اور تقسیم ہے کہ ارشاداتِ نبوی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تشریعی (قانونی) دوسری غیر تشریعی اسے پاکستان کے بریلوی علماء کے سرتاج پیر محمد کرم شاہ ازہری صاحب (حال جج وفاقی شرعی عدالت پاکستان) کی زبانی سُنیئے۔ وہ اپنی کتاب "سنت خیرالانام" مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کے ص ۱۹۴، ۱۹۵ پر لکھتے ہیں:-

"حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وہ اقوال و افعال جن کا تعلق عبادات سے ہے یا ایسی چیزوں کو منع کرنے سے ہے جن سے دین کے اصولوں کو ضعف پہنچتا ہے مثلاً شرک وکفر اور غیر اللہ کے لئے حیوانات ذبح کرنا یا ان سے عقل، جسم، مال اور آبرو کے تلف اور برباد ہوجانے کا خطرہ ہے یا اُن میں ایسے حقوق مادیہ اور معنویہ کا بیان ہے جن کے ادا کرنے کا ہمیں حکم ہے جیسے وراثت، اقارب کے نفقہ اور میاں بیوی کے حسن معاشرت کے احکام یا ایسے حقوق جن کی پابندی کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ جیسے معاملات میں اپنے قول کی پابندی کرنا وغیرہ ایسے تمام اقوال و افعال تشریعی ہیں اور ان کی اطاعت تمام امت پر فرض ہے۔

لیکن حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے ایسے اقوال و افعال جن کا تعلق حقوق اللہ یا حقوق العباد سے نہیں اور نہ ہی ان بنیادی امور سے ضرر و فساد کا ازالہ مقصود ہے یہ اقوال و افعال غیر تشریعی ہیں۔ مثلاً عادات، صناعت، زراعت اور وہ علوم و فنون جن کا دار و مدار بحث و تجربہ پر ہے ان امور کے متعلق جو اقوال ہیں انہیں علماء کی اصطلاح میں ارشاد کہا جاتا ہے وہ تشریعی نہیں ہے۔ (المنار ج ۱ ص ۲۰۲)"

کچھ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ

"نشست و برخاست، خورد و نوش اور چلنا پھرنا وغیرہ جن کا تعلق عبادات سے نہیں، ان افعال کی پابندی اُمّت پر فرض نہیں اگر ایسا کریں تو مباح ہے۔ (الاحکام الآمدی ۱ صـ۸۹)"

اس سے معلوم ہوا کہ احناف و مالکیہ کے نزدیک بھی حضور اکرم کا ہر ارشاد اور ہر قول و فعل وحی سے نہیں تھا بلکہ بہت سے اقوال و افعال بشری حیثیت کے تھے اور اسی لئے وہ تمام اُمت کے لئے ضروری نہیں ہیں۔

بہرحال عقل و نقل اور قرآن وحدیث و اقوال علماء وفقہاء سے یہ بات واضح ہوگئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں دو حیثیتیں مجتمع تھیں، ایک حیثیتِ رسالت اور ایک بشری حیثیت ـــــ اب اختلاف اس میں پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت کے وہ اقوال و افعال کون سے ہیں جو آپؐ نے بشری حیثیت میں سرانجام دیئے، اور وہ کون سے ہیں جو بطور رسالت ادا کئے، ہر ایک اس کی توضیح اپنے خیالات کے مطابق کرتا ہے۔ لیکن قرآن مجید سے اس کی دلیل نہیں دیتا۔ اب مثلاً پیر کرم شاہ صاحب نے فقہائے احناف کے حوالے سے آنحضرتؐ کے بشری حیثیت کے اقوال و افعال اور رسالت کی حیثیت کے اقوال و افعال کی جو تفصیل دی ہے اس کی قرآن مجید سے کوئی دلیل نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ اور حضرات ان تفصیلات میں اور بھی وسعت بتلاتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر کی نمائندگی کے لئے ہم پاکستان کے اہلحدیث علماء کے سرخیل مولانا محمد حنیف ندوی کو منتخب کرتے ہیں، وہ اپنی کتاب "مسئلہ اجتہاد" مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کے صفحہ ۱۷۸ پر لکھتے ہیں:۔

"معاملات کو تعبدیات سے الگ کرنے کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ فقہ جدید کو جس مشکل کا براہِ راست سامنا کرنا ہے وہ وہی مسائل ہیں جو معاملات کے قبیل سے ہیں۔ تعبدیات سے نہیں، معاملات کو مسائل تعبدیہ سے الگ کرنے میں ایک

زبردست پیچیدگی یہ ہے کہ ایسا کس اصول کے تحت کیا جائے۔

تو یہ بہرآئینہ واضح ہے کہ آنحضرت نے یہ فرما کر کہ اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ (تم دنیا کے کاموں کو زیادہ بہتر طریق سے جانتے ہو) دونوں قسم کے مسائل میں خط امتیاز کھینچ دیا ہے، اور دونوں کے دوائر کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا ہے۔"

اس سے پہلے بارھویں باب میں بعنوان "اجتہاد و رائے کا دائرۂ اثر" ص ۱۶۰، ۱۶۱ پر اظہار خیال کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"جہاں تک ان مسائل کا تعلق ہے، جن کے بارے میں کوئی متعین نص عہ موجود نہیں ہے تو بغیر کسی اختلاف کے کہا جا سکتا ہے کہ قیاس و رائے کی تگ و تاز ان میں مسلّم ہے۔۔۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اجتہاد و رائے کا شدیز ان میدانوں کے کاوے بھی کاٹ سکتا ہے۔ جن میں نصوص کا عمل دخل ہے؟ یعنی آیا ایسی نصوص بھی ہیں کہ حالات و ظروف کی قدرتی اور ناگزیر تبدیلیوں سے ان کے اطلاق و خصوص پر اثر پڑے۔ اور قیاس و رائے کے بل پر ان میں کوئی تغیر و تبدیلی رونما ہو۔۔۔

یہ سوال بیک وقت اہم بھی ہے اور نازک بھی، اس سے قبل کہ اس کے مالہٗ و ماعلیہ سے تعرض کیا جائے اس سلسلہ میں ذہن میں ابھرنے والی چند غلط فہمیوں کا ازالہ پہلے ہی قدم پر کر دینا نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ کیا قیاس و رائے، نصوص کے حصار متین میں دخل اندازیوں کی مجاز ہے یا نہیں تو اس سے مراد وہ نصوص ہرگز نہیں ہوتے جو تعبدیات پر مشتمل ہیں بلکہ وہ چند اور نہایت ہی محدود نصوص ہیں جو معاملات سے متعلق ہیں اور یکسر امور دنیا میں داخل ہیں۔۔۔

عہ نص، سے مراد قرآن یا حدیث کا صریح ارشاد ہے۔ (مرتب)

اس بحث سے تکمیل دین اور ابدیت اسلام کے موضوع پر کچھ اثر نہیں پڑتا کیونکہ اس کا سرے سے یہ دعویٰ ہی نہیں ہے کہ دنیاوی حالات نہیں بدلیں گے، معاشرہ نئی نئی تبدیلیوں کو قبول نہیں کریگا۔ اور نئے نئے اقتصادی و سیاسی ڈھانچوں کو اختیار کرنے سے نئے نئے مسائل نہیں ابھریں گے بلکہ اس کا جو دعویٰ ہے وہ اتنا ہی ہے کہ عبادات و عقائد کا جو نقشہ اس نے کھینچا ہے اس پر قیامت تک کوئی اضافہ ممکن نہیں۔"

یعنی مؤلف اور ان کے ہم خیال علماء کے نظریے کے مطابق قرآن وحدیث کے بیان کردہ صرف عقائد و عبادات ہی ابدی اور قیامت تک کے لئے اپنی اصل شکل میں لازمی ہیں، ان کے علاوہ باقی جتنے معاملات ہیں ان میں حالات وضرورت اور مصلحتِ وقت کے مطابق تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ لیکن اس نقطۂ نظر کے حامی علماء نے بھی اپنی تائید میں کوئی قرآنی استدلال پیش نہیں کیا۔ لطف یہ کہ ان دونوں نقطہ ہائے نظر کے حامی علماء باہم اتنے مختلف ہیں کہ پیر کرم شاہ ازہری صاحب اپنی کتاب "سنت خیر الانام" میں عبادات و معاملات میں تفریق کرنے اور معاملات میں ضرورت کے مطابق ردّ و بدل کی اجازت دینے والے ان حضرات کو منکر حدیث کہتے اور دشمن اسلام سمجھتے ہیں۔ ؏

بہر حال یہ وہ بیحد اہم اور انتہائی نازک مسئلہ ہے جس پر مفکر قرآن نے حضرت خواجہ احمد نے قرآن کریم کی روشنی میں اتنی مفصل و مدلل بحث کی ہے اور اس اہم عنوان کو اتنا واضح اور منقح کر دیا ہے کہ اسلامی لٹریچر میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

(خواجہ صاحب کی تصنیفات)

۱۸۷۸ء کے مولانا قصوری کے اس وعظ کو سُنکر خواجہ صاحب کے نوجوان قلب و دماغ پر جو اثر ہوا، اس کا پہلا اثر (مطبوعہ طور پر) ہمیں ان کے مضمون

؏ یہ علیحدہ بات ہے کہ علماء کا ایک اور قدامت پسند طبقہ پیر کرم شاہ والے نظریے کو بھی گمراہی اور بد دینی سمجھتا ہے۔ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے معتقدین اسی بات کے قائل ہیں۔

"امہات المومنین" میں نظر آتا ہے۔ جو ۱۸۹۸ء میں ماہنامہ "الواعظ" امرتسر میں قسط وار شائع ہوا۔ اور جس میں انہوں نے عیسائیوں کو جواب دیتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا کہ مسلمانوں کی الہامی کتاب صرف قرآن مجید ہے اس لئے جن روایات کی بنیاد پر آنحضرتؐ اور ان کی ازواج مطہرات پر اعتراضات کئے گئے ہیں وہ ہمارے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

اس کے چند سال بعد رسالہ ضیاء الاسلام امرتسر میں ان کا مضمون "قرآن مجید اور رسول حمید" شائع ہوا۔ جس میں صرف قرآن کی بنیاد پر آنحضرت کی سیرت مرتب کی گئی ہے (یہ رسالہ بہت مقبول ہوا، اور کئی رسالوں نے اسے نقل کیا، حکیم معراج الدین صاحب اڈیٹر الفقیہ (جو بریلوی مسلک کے تھے) کے رسالہ راعین میگزین کے میلاد نمبر (۱۹۱۶ء) میں بھی شائع ہوا، اور کئی مرتبہ پمفلٹ کی صورت میں بھی طبع ہوا)

۱۹۰۰ء میں وجود باری تعالیٰ پر قرآن و عقل کی روشنی میں ایک رسالہ "خیر کثیر در اثبات وجود رب قدیر" شائع ہوا، ۱۹۰۴ء میں مباحثہ گوشت خوری ہوا۔ جو آرین ڈبیٹنگ کلب امرتسر کے پریذیڈنٹ حکیم لالہ ہر دیال صاحب اور حضرت خواجہ احمد صاحب (صدر اسلامک ڈبیٹنگ کلب) کے درمیان تحریری طور پر ہوا، کیونکہ خواجہ صاحب زبانی مناظروں کو لغو اور نامناسب سمجھتے تھے۔ تحریری مباحثوں میں بھی اپنے تواضع اور منکسر المزاجی کی وجہ سے خواجہ صاحب کبھی پہل نہیں کرتے تھے۔ اس بحث کے محرک بھی آریہ سماجی لیڈر لالہ ہر دیال صاحب ہی تھے۔ اور خود ہی انہوں نے جانبین کی جانب سے آٹھ آٹھ پرچے لکھنے کی شرط مقرر کر دی۔ لیکن صرف دو پرچوں کے بعد ہی نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ لالہ صاحب تحریری بحث کے بجائے بالمشافہ گفتگو پر زور دینے لگے۔ اور کسی صورت تحریری بحث کو جاری رکھنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اس طرح مباحثہ میں خود پہل کرنے کے باوجود اور

مواد صرف قرآن سے کہاں نکل سکتا ہے کہ سیرت کا ایک باب مرتب ہو سکے لیکن جب میں نے بہت اصرار کیا تو کہا اچھا تم اگر یہ ٹکڑا مرتب کر دو تو سیرت کے ساتھ شامل کر دیا جائے آخری یکجائی دہلی میں ہوئی تھی اس وقت انہوں نے کہا۔ "اب مجھ کو بھی خیال ہوتا جاتا ہے کہ یہ ممکن ہے اور بہت ہی اہم چیز ہو گی"۔ چنانچہ دہلی سے آکر میں نے کچھ وقت اس میں صرف کیا اور ایک مستقل سیرت نبویہ مجرد قرآنِ حکیم سے ماخوذ و مستنبط شروع کر دی۔ جوں جوں قدم آگے بڑھتا گیا نئے نئے دروازے کھلتے گئے اور امید و توقع سے کہیں زیادہ کامیابی ہوئی گو حقیقت پہلے سے پیش نظر تھی۔ حتیٰ کہ اس بارے میں بڑا ذخیرہ آیات کا ذہن میں مستحضر تھا لیکن یہ بات تو کبھی وہم و گمان میں بھی نہیں گزری تھی کہ جس کتاب کو بظاہر جا بجا ذکر احکام و مسائل و قصص گذشتگان سے مملو پاتے ہیں۔ اس میں اس قدر وافر ذخیرہ خاص شخص رسالت کے حالات و وقائع کا بھی موجود ہو گا؟ کتاب کے مرتب ہو جانے کے بعد جو دیکھا تو ایک عجیب عالم نظر آیا۔ حیات و سیرت کا کوئی ضروری ٹکڑا ایسا نہیں ہے جس کے لئے قرآن میں ایک سے زیادہ آیات نہ ہوں اور پھر نہ صرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہی کی سیرت بلکہ صحابۂ کرام کے حالات و خصائص کا بھی کافی ذخیرہ موجود ملا۔ صحابہ کی جماعت درسگاہِ تزکیہ و تعلیم نبوت سے نکلی ہوئی مومنون الاولون کی اولین جماعت تھی ویعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم۔ اس لئے اُن کے سوانح و ایام بھی سیرتِ نبویہ ہی کے مختلف اجزاء ہیں بلکہ ہدایت قرآنی و حکمت نبوی کے عملی و مجسم ثمرات ہونے کے لحاظ سے دلائل و آیاتِ نبوت کے حکم میں داخل۔ پس یقیناً آپ کی سیرت مکمل نہ ہوتی اگر ان کے حالات بھی قرآن میں پوری شرح و تفصیل سے نہ ملتے اس ٹکڑے کو دیکھ مجھ کو آخری مرتبہ یقین اس بارے میں حاصل ہو گیا کہ اگر دنیا سے تاریخ اسلام کی ساری کتابیں معدوم ہو جائیں اور دنیا نے جو کچھ چھٹی صدی عیسوی کے ایک ظہورِ دعوت کی نسبت سنا ہے وہ سب کچھ بھلا دے اور صرف قرآن ہی دنیا میں باقی رہے۔

جب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت مقدسہ اور آپ کی سیرت وحیات کے براہین و شواہد مٹ نہیں سکتے صرف ایک قرآن ہی اس کے لئے بس کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ دنیا کو بتلادے کہ اس کالانے والا کون تھا کیسے زمانے میں آیا، کس ملک میں پیدا ہوا اس کے خویش و بیگانہ کیسے تھے، قوم و مرز بوم کا کیا حال تھا؟ اس نے کیسی زندگی بسر کی؟ اس نے دنیا کے ساتھ کیا کیا؟ اور دنیا نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ اس کی باہر کی زندگی کیسی تھی اور گھر کی معاشرت کا کیا حال تھا؟ اس کے دن کیسے بسر ہوتے تھے اور راتیں کن کاموں میں کٹتی تھیں؟ اُس نے کتنی عمر پائی کون کون سے اہم واقعات و حوادث پیش آئے اور پھر جب دُنیا سے جانے کا وقت آیا تو دنیا اور دنیا والوں کو کس عالم میں چھوڑ گیا اُس نے جب دُنیا پر پہلی نظر ڈالی تھی تو دنیا کا کیا حال تھا اور جب واپسیں نظرِ وداع ڈالی تو وہ کہاں سے کہاں تک پہنچ چکی تھی۔ غرض کہ ایک وجود و مقاصد وجود اور اعلام صداقت و عظمت کے لئے اس کے وقائع وما یتعلق بھا وما یناسب ذالک، میں سے جن جن باتوں کی ضرورت ہو سکتی ہے وہ سب کچھ صرف قرآن ہی کی زبانی دنیا معلوم کر لے سکتی ہے۔ اور اس بارے میں بھی قرآن اپنے سے باہر کا ابداً محتاج نہیں اور پھر یہ سب کچھ از قبیل اشارات و مرموزات نہیں ہے جیسا کہ اربابِ نکات و دقائق کا طریق استنباط ہے بلکہ صاف صاف اور کھلا کھلا بیان جو فقہاء کے طریق استنباط اشارۃ النص سے کہیں زیادہ واضح و ظاہر ہے اور اگر رموز و اشارات و تلمیحات کا طریق اختیار کیا جائے تو پھر خاص خاص آیتوں کو چھانٹنے کی کیا ضرورت، پورے قرآن میں بجز اس ایک ذکر کے اور کوئی ذکر ہی نہیں ہے:

وکل الی ذاک الجمال یشیر!

اور اگر غور کیا جائے تو فی الحقیقت یہ معاملہ بھی منجملہ مہمات خصائص و اعجازِ قرآن کے ہے، کسی پیغام کی صداقت جانچی نہیں جا سکتی۔ جب تک

پیغام لانے والے کی صداقت و امانت نہ جانچی جا سکے اور وہ ممکن نہیں جب تک اس کی پوری زندگی اور زندگی کے وقائع و اعمال دنیا کے سامنے نہ ہوں پس اس اعتبار سے آج تمام عالم میں اگر کوئی صحیفۂ آسمانی ایسا ہے جو اپنے لانے والے کی زندگی کے وقائع و سوانح ہر زمانے اور ہر عہد میں خود اپنی زبانی سُنا دے سکتا ہے تو وہ بحکم ھذا کتابنا ینطق علیکم بالحق، بجز قرآن حکیم و محفوظ کے اور کوئی نہیں اس کے علاوہ جسقدر کتب سماویہ (فی اعتقادنا و فی زعمھم) موجود ہیں وہ یا تو اپنی صداقت کی اور ساری باتوں کی طرح اس بارے میں بھی بالکل خاموش و مظلم ہیں حتیٰ کہ اپنے لانے والوں کے وجود کے اثبات سے بھی عاجز، اور اگر اس کی شخصیت کا ذکر کرتے بھی ہیں تو ایسے مجہول و سراپا شکوک و ارتیاب کی شکل میں جس سے اثبات کی جگہ اور زیادہ سلب و نفی کا یقین پیدا ہو جاتا ہے .... لیکن اللہ اکبر مقامِ محمدی کی محفوظیت و مصئونیت کہ اس کی سیرتِ طیبہ اور حیاتِ حیۂ وقائمہ کی لوح محفوظ کا ایک لفظ بھی محو نہ ہو سکا، اور قرآنِ محفوظ و کتابِ مسطور فی رقٍ منشور اور فی صدور الذین اوتوا العلم میں اس کا ایک ایک حرف، ایک ایک لفظ اُسی طرح نقش و ثبت ہے اور ہمیشہ رہے گا جس طرح، قلمِ ازل نے اوّل صبح تعین کی کرنوں سے لکھ دیا تھا ...

... انسانوں کی ترتیب دی ہوئی ساری سیرتیں اور تاریخیں ایک طرف، اور خود لسانِ الٰہی کا ایک کلمۂ منطوقہ و محفوظہ ایک طرف، تعجب ہے کہ اربابِ سیر نے باوجود کمال سعی و نظر اور مشغولیت بہ جمیع طرق و ترتیباتِ سیرت اس طرف توجہ کیوں نہ کی، جب تک یہ چیز مرتب نہیں ہوئی تھی خود اپنا حال بھی دوسرا تھا اور اب دیکھا تو کارخانہ ہی دوسرا نظر آیا۔

تمام بود بہ یک حرف گرم و ما غافل ﷺ حکایتے کہ ہمہ ناتمام می گفتند!
متھذا
نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں ﷺ بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہم چناں باقی

(تذکرہ ابوالکلام آزاد ایڈیشن میری لائبریری لاہور، ص ۱۸۲ تا ص ۱۸۹)

خلاصہ یہ کہ خواجہ صاحب نہ اہلقرآن حضرات کی طرح تمام ذخیرۂ احادیث کے منکر ہیں نہ روایت پرستوں کی طرح موجودہ ذخیرۂ احادیث بخاری و مسلم وغیرہ کو قرآن کے برابر (مثلہ معہ) سمجھتے ہیں۔ وہ قرآن مجید کو وحی الٰہی اور تمام مسلمانوں پر قیامت تک کے لئے لازمی قرار دیتے ہیں۔ اور احادیث کو ایسی عظیم انسانی کوشش سمجھتے ہیں جو اسلامی قانون سازی میں بطور نظائر کے تو کام دے سکتی ہیں لیکن انہیں خدا کے کلام (قرآن) کے برابر اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

خواجہ صاحب کے افکار سے متاثر حضرات

مولانا عبداللہ چکڑالوی

چکڑالوی مرحوم کا خاندان نہایت غالی پیر پرست خاندان تھا جو شخصیت پرستی اور غلو میں بریلوی حضرات سے بھی زیادہ ہوتے ہیں، چکڑالہ چونکہ ایک دور افتادہ اور دیہاتی علاقہ تھا۔ اس لئے مولانا عبداللہ صاحب (جن کا اصل خاندانی نام قاضی غلام نبی تھا) لاہور اور ملتان کے دینی مراکز میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ چکڑالوی صاحب کے والد تونسہ شریف کے حضرت خواجہ اللہ بخش کے مرید تھے۔ جب چکڑالوی صاحب فارغ التحصیل ہوئے (اس وقت ان کی عمر پندرہ سولہ سال تھی) تو انکے والد انہیں بھی ساتھ لیکر تونسہ گئے اور جب پیر صاحب کے سامنے پہنچے تو اپنی عقیدت کے غلو میں خود بھی پیر کے سامنے جھکے اور بیٹے کی گدی پکڑ کر اس کا سر بھی پیر صاحب کے قدموں پر جھکا دیا۔ چکڑالوی صاحب کا کہنا ہے کہ اس سلسلہ میں میری کشمکش کو دیکھ کر حضرت پیر صاحب نے مجھے مخاطب کرکے فرمایا:

يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ۔

یہ دراصل قرآن مجید کی سورۂ لقمان کی ایک آیت ہے جس میں حضرت لقمان اپنے صاحب زادے سے فرماتے ہیں، کہ اے بیٹے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، بلاشبہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ (۳۱/۱۳) پیر صاحب کا یہ ارشاد سننا تھا

کہ چکڑالوی صاحب کی ذہنی کائنات میں ایک زبردست زلزلہ آیا جس کے نتیجے میں اب تک کے تمام تصورات پاش پاش ہوگئے یہاں سے واپس ہونے کے بعد اپنے والد اور اساتذہ سے ان کے مناظرے ہوئے جس کے نتیجے میں بالآخر وہ اہلحدیث ہوگئے۔ اب چونکہ ان کا ذہن عام تصورات سے باغی ہوچکا تھا اس لئے کچھ عرصہ مزید گذرنے پر وہ عام اہلحدیثوں سے بھی کچھ ممتاز نظر آنے لگے۔ اور بخاری و مسلم کی حدیثوں کے علاوہ باقی سب حدیثوں کا انہوں نے انکار کردیا۔ صحیفۂ اہلحدیث کراچی بنس روڈ کے حجیت حدیث نمبر (۱۹۵۲ء) میں مولانا عبدالجلیل صاحب سامرودی لکھتے ہیں۔

"(چکڑالوی) اوّلاً اہلحدیث تھا۔ اس زمانہ کی اس کی ایک تالیف ادعیہ میں میری نظر سے گذری ہے بعد میں اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ صرف قرآن اور صحیحین (بخاری و مسلم) ہی مستند چیزیں ہیں (یعنی بخاری و مسلم کی حدیثوں کے علاوہ باقی تمام حدیثوں کا انکار کردیا) پھر کچھ عرصہ کے بعد صحیحین کو بھی اڑا دیا۔ اور احادیث نبویہ سے بالکل کورا ہوگیا۔ اپنے آپ کو اہلِ قرآن سے تعارف کراتا تھا۔ احادیث نبویہ کا انکار اپنا شعار قرار دیا تھا۔" (ص ۱۵۶)

جس زمانے میں مولانا عبداللہ چکڑالوی صرف بخاری و مسلم کی حدیثوں کو تسلیم کرتے تھے اور ان دو کتابوں کی احادیث کے علاوہ باقی تمام احادیث کو ناقابل اعتبار سمجھتے تھے۔ اس زمانے کی ان کی ایک تفسیر القرآن ہے جو ۱۸۹۹ء میں مطبع پنجاب سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔ اس تفسیر کا صرف ایک ہی حصہ شائع ہوا۔ جو پہلے پارے پر مشتمل تھا۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد ان کی خط و کتابت ہمارے خواجہ احمد صاحب سے ہوئی۔ اس خط و کتابت کی ابتداء خواجہ صاحب نے یہ دیکھ کر کی کہ ایک

پُرجوش شخص کی اگر صحیح راہنمائی کردی جائے تو ممکن ہے وہ قرآنی علم کو پوری طاقت سے اٹھالے۔ اس موضوع پر حضرت خواجہ صاحب کی چکڑالوی صاحب سے کئی ماہ تک خط و کتابت ہوتی رہی۔ بالآخر موسم سرما کی تعطیلات میں خواجہ صاحب چکڑالوی صاحب کے پاس مسجد چینیانوالی لاہور پہونچے جہاں وہ خطیب تھے جس کے نتیجہ میں مولانا چکڑالوی اور ان کے دونوں ساتھی شیخ محمد میاں چٹو اور شیخ حکم دین خواجہ صاحب کے ہم خیال ہو گئے، اور احادیث کو وحی الٰہی اور قرآن کی طرح مثلہ معہ سمجھنے کے بجائے حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہ (دینی طور پر اللہ کی کتاب ہمارے لئے کافی ہے) کے قائل ہو گئے لیکن مولانا چکڑالوی اپنے مزاج کے اعتبار سے انتہا پسند تھے۔ جب تک پیر پرست تھے تو تمام مخالفین کو مرتد وہابی کہتے تھے۔ پھر اہلحدیث ہوئے تو حنفیوں کو مشرک کہنے لگے اور فقہ کا نام سُننا بھی برداشت نہیں کرتے تھے ــــ اب جو کفایت قرآن کے حامی ہوئے تو اتنے غلو کے ساتھ کہ کسی ایک حدیث کو بھی ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ اسی غلو کے نتیجے میں انہوں نے قرآن کی تفسیر لکھنی شروع کی جو ترجمۃ القرآن بآیات الفرقان کے نام سے نومبر ۱۹۰۶ء میں حمیدیہ سٹیم پریس لاہور سے شائع ہوئی۔ اس میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ موجودہ نمازیں جتنے بھی غیر قرآنی الفاظ اور جتنی بھی زائد از قرآن دعائیں مانگی جاتی ہیں وہ سب شرک ہے لہٰذا سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ۔ اَلتَّحِیَّاتُ یا سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم اور سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی کہنا بلکہ لفظ اللہ اکبر کہنا بھی غلط ہے کیونکہ پورے قرآن میں یہ لفظ کہیں نہیں آیا۔ اسی لئے چکڑالوی صاحب بجائے اللہ اکبر کے اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیًّا کَبِیْرًا (۴/۳۴) کا لفظ کہا کرتے تھے۔ غرض یہ کہ از کار نماز میں انہوں نے اس قسم کی تبدیلیاں کیں اور ان میں اتنی شدت برتی کہ وہ عام مسلمانوں سے کٹ گئے۔ اس موضوع پر چکڑالوی صاحب نے برہان الفرقان

فی صلوۃ القرآن کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی جس میں بتایا کہ جو لوگ نمازوں میں قرآن کے علاوہ اور کوئی دعا یا لفظ ادا کرتے ہیں وہ سب گمراہ ہیں اور ان کی نماز نہیں ہوتی۔ پھر انہوں نے شاید یہ سوچ کر کہ فرقوں کو ایک نئے فرقے کے ذریعے ہی توڑا جا سکتا ہے اپنے متبعین کو فرقہ اہلِ قرآن کا نام دیا جسے وہ باقاعدگی سے لکھتے اور بولتے تھے۔

چکڑالوی صاحب کو خواجہ صاحب کی نصیحت

ان کے اس غلو کو دیکھکر خواجہ صاحب پھر ان کے پاس لاہور گئے اور انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ مروجہ نماز میں آخر کیا بُرائی ہے جو وہ تمام مسلمانوں کی نمازوں کو غیر مقبول قرار دیتے ہیں، قرآن نے کہاں فرمایا ہے کہ نماز میں قرآن کے علاوہ کوئی دُعا نہیں پڑھی جا سکتی؟ لیکن مولانا چکڑالوی اب اس انتہا پر پہونچ چکے تھے کہ وہ قرآن مجید کے ساتھ کسی چیز کا نام بھی سُننا برداشت نہ کر سکتے تھے۔

خواجہ صاحب نے ان سے یہ بھی کہا کہ آپ تمام احادیث کا انکار کیوں کرتے ہیں؟ احادیث میں اگر کوئی اچھی بات ملتی ہے تو اس کے تسلیم کرنے میں کیا حرج ہے۔ کیا قرآن مجید نے یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ "میرے ان بندوں کو خوشخبری سُنا دو جو ہر بات سُنتے ہیں۔ اور پھر اس میں جو درست بات نظر آتی ہے اسے تسلیم کر لیتے ہیں (۳۹/۱۸)"
لیکن چکڑالوی صاحب اپنے تشدّد کی وجہ سے یہ بات ماننے کے لئے تیار ہی نہیں تھے کہ حدیثوں میں بھی کوئی اچھی بات مل سکتی ہے۔

خواجہ صاحب نے انہیں یہ بھی سمجھایا کہ انہوں نے اپنی جماعت کو فرقہ اہلقرآن کے نام سے کیوں موسوم کیا ہے؟ جبکہ فرقہ بندی اسلام کی رو سے شرک اور ممنوع ہے (۳۰/۳۲) اور قرآن نے ہمارا نام 'مسلم' رکھا ہے۔ اس لئے ہمیں دوسرے نام رکھنا مناسب نہیں ہیں (۲۲/۷۸) لیکن اب

چکڑالوی صاحب اتنے دور جا چکے تھے کہ اپنے معنوی استاذ خواجہ احمد کی باتیں بھی انہیں اعتدال پر نہ لا سکیں، اور آخر تک وہ اسی قسم کے انتہا پسندانہ خیالات کے علمبردار رہے۔ اس شدت پسندی کیوجہ سے اگرچہ انہیں ملک گیر شہرت حاصل ہوگئی۔ لیکن ان کے مخالفین بھی اسی شدت کے ساتھ ان کے مقابلہ پر اتر آئے اور بالآخر انہیں سالن میں زہر کھلا دیا گیا، جس کے نتیجے میں پہلے ان پر فالج کا حملہ ہوا، اور انکا نچلا دھڑ بیکار ہوگیا، علاج معالجہ کیا گیا لیکن کوئی خاص افاقہ نہیں ہوا یہ حالت کئی سال رہی اور پھر اسی زہر کے اثر سے وہ ۱۹۱۵ء میں انتقال کر گئے ان کے جانشین مولانا حشمت علی دہلوی تھے۔ جو ان کے رسالے ماہنامہ اشاعۃ القرآن کو کافی عرصہ تک چلاتے رہے۔ چکڑالوی صاحب کے شاگردوں میں سے مولوی محمد فاضل صاحب اور مستری محمد رمضان صاحب (گوجرانوالہ) ان سے بھی زیادہ انتہا پسند ہوگئے اور انہوں نے پانچ نمازوں کا انکار کرکے صرف تین نمازیں اور ہر نماز میں صرف دو رکعتیں پڑھنا شروع کر دیں لیکن ان حضرات کو کوئی فروغ حاصل نہیں ہوا۔ گوجرانوالہ کے چند حضرات ان کے ہم خیال ہیں۔ اور وہ اب تک رسالہ بلاغ القرآن کے نام سے ایک ماہنامہ شائع کر رہے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا آزاد اپنے ابتدائی دور (۱۹۰۶ء تا ۱۹۰۸ء) میں روزنامہ وکیل امرتسر کے اڈیٹر رہے ہیں، اس دوران خواجہ صاحب کے بعض احباب مثلاً حکیم فیروز الدین طغرائی صاحب سے ان کے گہرے روابط تھے۔ اس کے نتیجے میں مولانا کے افکار میں بھی تبدیلی آئی اور وہ خواجہ صاحب کے ہم خیال ہو گئے۔ اس سلسلہ میں آپ ان کی کتاب "تذکرہ" کا ایک اقتباس پہلے ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اب ایک اور اقتباس ان کی سوانح "ذکر آزاد" سے ملاحظہ ہو، جو ان کے مشہور

آٹھ آٹھ پرچوں کی اپنی پیش کردہ شرط کے ہوتے ہوئے صرف دو پرچوں کے بعد ہی مباحثہ سے دستبرداری اختیار کرلی جو دوسرے الفاظ میں اپنی شکست کا اعتراف تھا۔ خواجہ صاحب کا یہ مباحثہ قرآنی حلال وحرام جانوروں کے موضوع پر بہترین تحریر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عام حالات کے برعکس مباحثوں میں خواجہ صاحب کا غیر معمولی دماغ اور زیادہ تیزی سے کام کرنا شروع کردیتا ہے اور فریق مخالف کو سوائے مبہوت ہو جانے کے اور کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا۔

۱۹۱۵ء میں تفسیر بیان للناس لکھی دیکھئے قاموس الکتب صفحہ ۱۸ مرتبہ بابائے اردو مولوی عبدالحق، شائع کردہ انجمن ترقی اردو کراچی تفسیر سے پہلے ۱۹۱۴ء میں معجزۃ القرآن کے نام سے فقہ اسلامی کے مشکل ترین فن "میراث" پر مجتہدانہ کتاب تحریر کی۔ اس میں بتایا کہ موجودہ علم میراث میں جس پر حنفی شافعی مالکی حنبلی اہلحدیث وغیرہ سب متفق ہیں، بعض ایسی فنی غلطیاں ہیں جو قرآن مجید کے بھی خلاف ہیں اور علم الحساب کے بھی خلاف ہیں۔ یہ غلطیاں واضح کرنے کے بعد پورے فن میراث کو صرف قرآن کی بنیاد پر نئے سرے سے مدوّن کیا ہے۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی کا رسالہ معارف (اعظم گڑھ) لکھتا ہے:۔

"معجزہ قرآنی کے نام سے مولوی احمد الدین صاحب مدرس مدرسۃ المسلمین امرتسر نے مسائل میراث پر ایک ناقدانہ رسالہ لکھا ہے۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ علماء میں اب ایسے لوگ پیدا ہوگئے ہیں۔ جو مسائل فقہیہ میں بلاخوف لومۃ لائم فقہائے متقدمین شکر اللہ مساعیہم کے اجتہادات پر قلم اٹھاتے ہیں؛ ہمارے برادران اہلحدیث سے توقعات تو بہت تھیں لیکن ان کی پچھلی تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ نماز روزے سے آگے ان کے زور بیان کے دیکھنے کا موقعہ نہ ملے گا۔ ان مسائل میں جن کا ماحصل صرف افضلیت اور ترجیح پر ختم ہو جاتا ہے، زورِ

ع اس کتاب کے مضامین اس سے قبل ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۰ء تک رسالہ اعجاز القرآن امرتسر میں (جو خواجہ صاحب کے بڑے صاحبزادے نکالتے تھے) شائع ہو چکے تھے۔

استدلال اور قوت بیان سے آگے بڑھ کر مجادلہ، مقاتلہ اور مقادمہ (باہم مقدمہ بازی۔ ناظرین اس عدم تقلید لغوی کو معاف فرمائیں) تک نوبت پہنچ جاتی ہے ـــــ لیکن معاملات کہ جن پر مسلمانوں کے اجتماعی اور مالی حالات کا مدار ہے ان میں کسی قسم کی جنبش پیدا نہیں ہوتی۔

اس بنا پر ہم نے مولوی صاحب کے رسالہ میراث کو پوری قدر اور غور کے ساتھ پڑھا اور پھر اس یقین کے ساتھ اس کو ختم کیا کہ اس میں بہت سی باتیں لائق توجہ ہیں اور درحقیقت ان مسائل میں ہمارے فقہاء کتاب و سنت سے کسی قدر دور جا پڑے ہیں۔

(ماہنامہ معارف صفر ۱۳۳۶ھ دسمبر ۱۹۱۷ء صفحہ ۵۶)

یہی رسالہ ہے جس میں یتیم پوتے کی وراثت پر پہلی مرتبہ گفتگو کی گئی ہے۔ اور قرآن کی رو سے اس کا حق ثابت کیا ہے۔ خواجہ صاحب کے اس رسالہ کو ۱۹۲۳ء میں مولانا اسلم جیراج پوری نے عربی میں منتقل کر کے عرب دنیا تک بھی پہونچایا (مولانا اسلم اس زمانہ میں علیگڑھ کالج میں دینیات کے استاد تھے۔ بعد میں مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ جامعہ ملیہ دہلی آئے اور اس کے بانیوں میں سے ہونے کا پُر فخر مقام حاصل کیا)

اس رسالہ کی اشاعت سے تمام برصغیر میں یتیم پوتے کی وراثت کے موضوع پر بحث چھڑ گئی اور امرتسر کے اکثر تنگ نظر علماء خواجہ صاحب کیخلاف اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آئے انھیں ان کی ملازمت سے ہٹوانے کی کوشش کی گئی۔ ان پر قاتلانہ حملے کے پروگرام بنائے گئے عوام کو ان کے خلاف یہ کہہ کر ورغلایا گیا کہ یہ شخص دشمن رسول ہے، حضور کے ارشادات کا منکر ہے عنقریب نبوت کا دعویٰ کرنے والا ہے وغیرہ۔ خواجہ صاحب کا سماجی بائیکاٹ کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔ اور ان کے کسی بھی بیٹے کو (خواجہ صاحب کے ماشاءاللہ پانچ صاحبزادے تھے)

لڑکی دینا کفر قرار دیا گیا۔ غرض یہ کہ تکلیف و ایذا دہی کے جتنے طریقے ہو سکتے تھے۔ وہ سب آزمائے گئے۔ لیکن چونکہ خواجہ صاحب کی للّٰہیت، تواضع انکسار، شرافت نفس، بے ریائی، شہرت سے اجتناب، لالچ سے نفور اور خُلق کریم کا اثر ہر اس شخص پر تھا جس کا ان سے کبھی ذرا سی بھی معاملہ پڑا۔ اس لئے مخالف علماء کی یہ کوششیں رائیگاں گئیں۔ اور اللہ کے فضل سے مخالفین سے خواجہ صاحب کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے۔ اس کے برعکس انجمن اسلامیہ ہائی اسکول کے صدر شیخ محمد صادق بار ایٹ لاء (صدر مسلم لیگ امرتسر) اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو (مشہور سیاستداں) جیسی اہم شخصیات خواجہ صاحب کی ہم خیال ہو گئیں۔

(برہان القرآن)

خواجہ صاحب کی اس مخالفت میں سب سے پیش پیش اہلحدیث مناظرین کے سرگروہ مولانا ثناء اللہ امرتسری صاحب تھے۔ جو کسی زمانہ میں خواجہ صاحب کے دوست تھے۔ اور خواجہ صاحب کے استاد مولانا غلام علی قصوری کے شاگرد مولانا احمد اللہ کے شاگرد تھے۔ مولانا ثناء اللہ نے خواجہ صاحب کو مناظرہ کا چیلنج بھی دیا لیکن جیسا کہ ہم مباحثہ گوشتخوری کے ضمن میں بتا چکے ہیں کہ خواجہ صاحب زبانی مباحثوں کو لغو سمجھتے تھے اسلئے مولانا ثناء اللہ نے تحریری مباحثہ پر خواجہ صاحب کو مجبور کیا۔ اور اس میں خود ہی یہ شرط رکھی کہ فریقین پانچ پانچ پرچے لکھیں گے لیکن جب مباحثہ شروع ہوا تو آریہ سماجی لیڈر لالہ ہردیال کی طرح دو پرچوں کے لکھنے کے بعد ہی ہتھیار ڈال دیئے اور بالمشافہ گفتگو پر اصرار کرنے لگے (ہر چالاک مناظر بالمشافہ گفتگو پر اصرار اس لئے کرتا ہے کہ اس طرح شکست پر باسانی پردہ ڈالا جا سکتا ہے اور ہر فریق دوسرے پر الزام تراشی کرکے باسانی خود کو فاتح قرار دے سکتا ہے) ظاہر ہے خود ہی چیلنج دینے اور اپنی ہی شرائط پر مناظرہ کرنے کے باوجود تحریر سے مولانا کا یہ فرار اپنی شکست کا عملی اعتراف تھا۔ یہ تحریری مباحثہ ۱۹۲۲ء میں ہوا۔ اور اسے خواجہ صاحب کے احباب نے برہان القرآن کے نام سے شائع کیا، یہ تحریری مباحثہ

بہت مقبول ہوا، اور متعدد بار شائع ہوا، پاکستان میں بھی ادارہ بلاغ القرآن ۱۱۰-این سمن آباد لاہور، اسے لفظ بلفظ شائع کر چکا ہے۔

ہماری موجودہ کتاب کا پہلا حصہ اسی پر مشتمل ہے جس میں سے ہم نے مناظرانہ انداز کو نکال دیا ہے اور خواجہ صاحب کی پرانی اردو کو آسان زبان میں تبدیل کر دیا ہے تاکہ جدید قارئین کو سہولت رہے۔ اس مباحثہ کا کیا اثر ہوا، اس کے ثبوت کے لئے ہم خواجہ صاحب کے معتقدین کے بجائے ایک شیعہ، ایک سنی اور ایک آزاد خیال عالم کے تبصرے بطور ضمیمہ (دیکھئے ص۱۰۳) نقل کئے دیتے ہیں، ان سے آپ حقائق کا بخوبی اندازہ لگا سکیں گے۔ اس کی ضرورت بھی ہمیں اس لئے محسوس ہوئی کہ اس مباحثے کے تحریری ہونے کے باوجود مولانا ثناءاللہ کے معتقد اہلحدیث حضرات آج بھی یہ پروپیگنڈہ کرتے ہوئے شرم محسوس نہیں کرتے کہ اس مباحثے میں مولانا ثناءاللہ کو فتح عظیم حاصل ہوئی ـــ علماء کی طرف سے ان کھلی غلط بیانیوں کو دیکھ کر پرانے بزرگ محدثین کے متعلق بھی یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ کسی راوی کی تائید و تردید کے لئے کیا وہ بھی اسی قسم کی غلط بیانیوں کے مرتکب تو نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ فن اسماء الرجال (جسکے ذریعے روایتوں کو پرکھا جاتا ہے) کی بنیاد اسی قسم کے تبصروں پر ہے۔ پرانے حضرات آج ہمارے لئے بزرگ ہیں تو موجودہ جھوٹے تبصرہ نگار اہلحدیث حضرات بعد والے لوگوں کے لئے بزرگ کہلائیں گے ـــ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن مجید کا خادم بنائے اور تعصب و غلط بیانی سے بچائے۔

حدیث کے متعلق خواجہ صاحب کے افکار کا خلاصہ

(۱) مسلمانوں کے لئے قیامت تک کے لئے تشریعی وحی صرف قرآن مجید ہے اور اسی کے متعلق سورۂ النجم میں ارشادِ الٰہی ہے کہ ہمارا پیغمبر قرآن مجید کو اپنی طرف سے گھڑ کر پیش نہیں کرتا۔ بلکہ یہ وحی الٰہی ہے جو ہم نے اس کی جانب کی ہے۔ (وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی ۵۳:۳) اس باب میں جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں حضرت مجدد الف ثانی

حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شاہ عبدالعزیز جیسی شخصیات کی تائید بھی خواجہ صاحب کو حاصل ہے۔

(۲) خواجہ صاحب کے نزدیک جو صحیح احادیث ہیں وہ بھی وحی الٰہی نہیں بلکہ حضور اکرم کے اجتہادات ہیں کیونکہ وحی الٰہی تو اِنۡ ھُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی [۵۳/۴] وغیرہ آیات کے تحت صرف قرآن مجید ہے۔ یہی نقطۂ نظر حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے ہم خیال علماء کا ہے۔ شاہ ولی اللہ کے سب سے بڑے شارح مولانا عبیداللہ سندھی اپنی کتاب "شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ" مطبوعہ سندھ ساگر اکیڈمی بیرون لوہاری دروازہ لاہور میں لکھتے ہیں: "سنت کے متعلق شاہ صاحب کی رائے یہ ہے کہ یہ قرآن سے مستنبط ہے۔ مختصراً یہ ثابت ہوا کہ دین کی اصل صرف قرآن ہے اور قرآن ہی دین کا قانون اساسی ہے اور اسی پر دین کا تمام تر انحصار ہے۔ وما ینطق عن الھوی۔ ان ھو الا وحی یوحیٰ میں ھُوَ سے مراد قرآن ہے۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ ہمارا رسول دین کے معاملے میں اپنی خواہش کی بات نہیں کہتا یعنی اس میں رسول کی ذاتی خواہش کا کوئی دخل نہیں"۔ (ص ۹۸)

اسی کتاب کے صفحہ ۱۱۴ پر مولانا سندھی لکھتے ہیں:۔

"کیا حدیث نتیجہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اجتہاد کا جو قرآن کریم کی آیات سے استنباط احکام کے لئے آپؐ نے فرمایا؟ یا حدیث ماخوذ ہے مستقل وحی سے؟ سورۂ والنجم کی آیت وما ینطق عن الھوی اِن ھو الا وحی یوحیٰ سے حدیث کے مستقل ہونے پر استدلال کیا گیا ہے لیکن شاہ ولی اللہ صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ ھُو سے مراد صرف قرآن ہے (فتح الرحمان) اور ما ینطق عن الھوی کا اشارہ بھی نقل قرآن کی طرف ہے (۰) مگر اہلِ علم کی ایک جماعت ہے جو اس آیت کو صرف قرآن سے مخصوص نہیں مانتی وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے تمام اقوال کو ایک طرح کی وحی ثابت کرنے

پر زور دیتی ہے۔ ان کے نزدیک وما ینطق عن الھوی صرف
قرآن کو نقل کرنے پر محدود نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا
ہر قول وما ینطق عن الھوی میں داخل ہے اور ان کے خیال
میں اسی کو ان ھو الا وحی یوحیٰ میں وحی سے تعبیر کیا گیا ہے"۔

(۳) اجتہاد نبوی چونکہ وحی الٰہی نہیں بلکہ ایک بشری کوشش ہے اس لئے وہ وحی الٰہی کی طرح مثلہ معہ (قرآن کے مثل) اور قیامت تک کے لئے لازمی نہیں ہو سکتا بلکہ حسب ضرورت اس میں تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ خواجہ صاحب کے اس نکتہ کی تائید میں ایک اقتباس تو آپ اہلحدیث عالم مولانا محمد حنیف ندوی کا ملاحظہ فرما چکے۔ ایک اور اقتباس مولانا عبید اللہ سندھی کا دیکھ لیجئے۔ وہ اپنی اسی مذکورہ بالا کتاب کے صفحہ ۹۸، ۹۹ پر فرماتے ہیں۔

"قرآن، سنت اور اجماع کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک اساسی قانون (قرآن) ہے۔ ظاہر ہے اس اساسی قانون پر جب عمل درآمد شروع ہوتا ہے تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند تمہیدی قوانین بنانے پڑتے ہیں۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ قانون اساسی (قرآن) غیر متبدل ہے اور تمہیدی قوانین ضرورت کے وقت بدلے جا سکتے ہیں ہم ان تمہیدی قوانین کو سنت کہتے ہیں"۔

(۴) حضور اکرمؐ کی سیرت طیبہ کا جو ضروری حصہ تھا وہ بطور اسوۂ حسنہ قرآن مجید نے اپنے اندر محفوظ کر لیا ہے اس لئے حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کی تلاش میں قرآن سے باہر سرگرداں ہونے کی ضرورت نہیں آخر حضرت ابراہیمؑ اور ان کے صحابہ کرام کے اسوۂ حسنہ پر بھی قرآن مجید نے زور دیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ۔ اے مسلمانو تمہارے لئے حضرت ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کا طرز عمل اسوۂ حسنہ ہے۔ (۶۰) اس کے چند آیات بعد پھر ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ

مَنْ یَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ (۶۰)۔ اے مسلمانو
انہیں لوگوں کے (ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کے) طرزِ عمل میں تمہارے
لئے اور ہر اس شخص کے لئے اچھا نمونہ ہے جو اللہ اور روزِ آخر کا امیدوار ہو۔
اس سے کوئی منحرف ہو تو اللہ بے نیاز اور بے انتہا اچھائیوں کا مالک ہے۔
اب ظاہر ہے کہ جس طرح قرآن نے آنحضرت کے اسوۂ حسنہ کا ذکر فرمایا
ہے اسی طرح انہیں الفاظ میں حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کے
اسوۂ حسنہ کا ذکر فرمایا ہے۔ اگر حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کے
اسوۂ حسنہ کے لئے ہمیں قرآن سے باہر بائبل وغیرہ کو دیکھنے کی ضرورت
پیش نہیں آتی۔ تو خود حامل قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو تلاش
کرنے کے لئے قرآن سے باہر دیکھنے کی ضرورت کیوں ہے؟ اسی لئے
خواجہ صاحب نے "قرآن مجید و رسول حمید" نامی کتابچہ مرتب کیا تھا جس
میں بتایا تھا کہ رسول اکرم کے اخلاق و کردار یعنی اسوۂ حسنہ کے متعلق تمام
ضروری معلومات خود قرآن مجید ہی میں مل جاتی ہیں ـــ خواجہ صاحب کے
بعد اس موضوع پر مصر کے ایک بہت بڑے عالم محمد عزت دروزہ نے
بھی صرف قرآن مجید ہی کی بنیاد پر دو ضخیم جلدوں میں سیرت مرتب کی ہے
جس کا نام ہے

سیرۃ الرسول من القرآن الکریم

اس سلسلہ میں اگر آپ مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب "تذکرہ"
کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ فرمالیں تو معلومات میں مزید اضافہ ہوگا۔ مولانا
ابوالکلام لکھتے ہیں:۔

"لوگوں نے حیات و سیرت طیبہ حضرت ختم المرسلین (صلعم) پر اس حیثیت
سے بہت کم نظر ڈالی ہے کہ اگر روایات و دفاترِ تاریخی سے قطع نظر کر لیا جائے
اور صرف قرآن حکیم ہی کو سامنے رکھا جائے تو آپ کی سیرت و حیات پر

کیسی روشنی پڑتی ہے اور جس طرح قرآن اپنی کسی بات میں اپنے غیر کا محتاج نہیں اسی طرح اپنے حامل و مبلغ کے وجود و حیات کے لئے بھی خارج کا محتاج ہے یا نہیں؟ اصحاب سیر و محدثین کرام نے فضائل و مدائح منصوصۂ قرآنیہ کے تو باب باندھے ہیں۔ مثلاً قاضی عیاض نے شفاء کے متعدد ابواب میں قرآنِ حکیم کی آیات، متعلق فضائل و مدائح جمع کی ہیں، لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے آج تک کبھی اس کی کوشش نہیں کی گئی کہ صرف قرآنِ حکیم میں دائرۂ استناد و اخذ محدود رکھ کر ایک کتاب سیرت میں مرتب کی جائے۔ جس زمانے میں مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ سے سیرتِ نبویہ کے بارے میں تذکرے رہتے تھے تو ایک مرتبہ مجھے اس کا خیال ہوا تھا۔ میں نے کہا آپ سیرت میں ایک خاص باب یا سیرت کا ایک حصہ اس عنوان سے قرار دیجئے "قرآن اور سیرت محمدیہ" اور اس میں صرف آیاتِ قرآنیہ کو بہ ربط و ترتیب جمع کر کے دکھلایئے کہ خود قرآن سے کہاں تک آپؐ کی شخصیت اور آپؐ کے وقائعِ ایام معلوم ہو سکتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے ان کی طبیعت میں ایک خاص بات یہ تھی کہ کوئی معاملہ ہو وہ اس کی ابتداء ہمیشہ شک اور تردد سے کیا کرتے تھے۔ اور جب تک یقین کرنے کے لئے مجبور نہ ہو جائیں یقین نہیں کرتے تھے۔ اسی چیز نے ان کی علمی زندگی کو بھی (یعنی کاروبار و انتظامات کی زندگی کو بہت نقصان پہنچایا۔ اور وہ کوئی عملی کام جم کر نہ کر سکے، ندوہ کے معاملہ میں جو الجھاؤ لوگوں نے ڈالے وہ ان کے اسی ضعفِ یقین و عدم جزم و صلابتِ ارادہ کا نتیجہ تھا۔ ورنہ ان سے مخالفت کرنے والوں میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو اُن کو ان کی جگہ سے ہٹا سکتا، بہرحال انہوں نے اس خیال پر بہت ہی پسندیدگی ظاہر کی مگر وہی اپنی عادت کے مطابق اظہار شک و ناامیدی کہ اتنا

معتقد مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی (فاضل ازہر) نے مرتب کی ہے۔ اس کتاب کے صفحہ ۲۳۳،۲۳۲ پر بعنوان "حدیث و قرآن" ملیح آبادی صاحب لکھتے ہیں کہ:

"موضوع شرح و بسط چاہتا ہے اور اُس کا یہاں موقع نہیں ایک دن جیل میں مَیں نے مولانا سے عرض کیا" حدیث کی تدوین تیسری صدی کے اوائل میں شروع ہوئی یعنی "دو سو سال تک زبانی روایت ہوتی رہی۔ روایت بھی لفظاً" نہیں معناً"، راوی اپنے فہم کے مطابق اپنے لفظوں میں روایت کرتا تھا۔ اور ظاہر ہے آدمی کا فہم ضروری نہیں کہ صحیح ہو۔ پھر معلوم ہے کہ حضرت رسول اللہ حدیث لکھنے کی ممانعت فرماتے تھے اور حضرت عمرؓ تو اپنے عہد خلافت میں راویوں کی دُرّوں سے خبر لیتے تھے۔ جب حالات یہ ہیں تو حدیث، شریعت اور قانون کا سرچشمہ کیونکر مانی جا سکتی ہے؟

فرمایا "مولوی صاحب، آپ نے ٹھیک کہا، حدیثِ صحیح، عبادات میں تو حجت ہے۔ اخلاق و معاشرت کے سلسلہ کی احادیث ایسی ہیں کہ ساری دنیا کا لٹریچر اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مگر حدیث، انسانی سوسائٹی کے لئے قانون کا سوتا نہیں ہو سکتی۔ عالمگیر ہدایت کا ضامن قرآن ہے اور قرآن معدودے چند قوانین کا حامل ہے۔ یہ اس لئے کہ کوئی قانون بھی اختلافِ ازمنہ و حالات کی وجہ سے ساری دُنیا پر نہ نافذ ہو سکتا ہے نہ مفید ہو سکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ خود منصوص قوانین قرآنیہ کے التواء کا اختیار، امام المسلمین کو بخشا گیا ہے۔ آپ دیکھتے نہیں کہ حضرت عمرؓ نے منصوص قانونِ طلاق

یں ترمیم کردی۔ عام الرمادہ میں چور کا ہاتھ کاٹنے سے منع کیا کیونکہ لوگ قحط زدہ تھے۔ اور مؤلفۃ القلوب کو مسلمانوں کا مال دینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اب اسلام طاقتور ہو چکا ہے اور غیر مسلموں کے تالیف قلب کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ حضرت عمرؓ کے یہ فیصلے صحابہ نے قبول کر لئے۔ کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ دراصل شریعت کی اساس جلبِ مصالح اور دفعِ مفاسد پر ہے۔"

(ذکر آزاد، شائع کردہ: دفتر آزاد ہند نمبر ۲۲/اے ساگر دت لین کلکتہ ۱۲۔ ۱۹۶۰ء)

علامہ اقبال علامہ اقبال خواجہ صاحب کی تفسیر پڑھ چکے تھے اور ان کے معتقدین کے جاری کردہ رسالہ ماہنامہ "بلاغ" امرتسر کے مستقل قاری تھے خواجہ صاحب کی عظمت ان کے دل میں کتنی تھی اس کا اندازہ ان کے اس تعزیت نامے سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے خواجہ صاحب کے انتقال پر ان کے شاگرد اور جانشین علامہ عرشی امرتسری کے نام تحریر فرمایا تھا لکھتے ہیں۔

"مولانا مرحوم کے انتقال کی خبر میں نے اخبارات میں دیکھی خدا تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔ اس زمانے میں ان کا دم غنیمت تھا۔ ایسے عالم باعمل روز روز نہیں پیدا ہوتے۔"

(اقبال نامہ حصہ اول صفحہ ۳۰ خط ۱۴

شائع کردہ: شیخ محمد اشرف تاجر کتب لاہور)

اس تحریر میں علامہ اقبال کا یہ معجز نما جملہ کہ "ایسے عالم باعمل روز روز نہیں پیدا ہوتے" خواجہ صاحب کی سینکڑوں صفحات کی سوانح پر بھی بھاری ہے۔ چونکہ ہم علامہ اقبال اور حضرت خواجہ احمد کے تعلقات پر اسی کتاب میں علامہ عرشی کا ایک مکمل مضمون پیش کر رہے ہیں جو

اس سے پہلے اقبال اکادمی پاکستان کراچی کے سہ ماہی رسالہ اقبال ریویو جولائی ۱۹۷۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اس لئے یہاں انہی چند جملوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

البتہ خواجہ صاحب کے خیالات کا جو اثر علامہ اقبال کی تحریروں میں پایا جاتا ہے اس کے بعض اقتباسات پیش خدمت ہیں۔ خطبات اقبال مترجمہ سیّد نذیر نیازی (شائع کردہ بزم اقبال، کلب روڈ لاہور ۱۹۵۸ء) کے چھٹے خطبے "الاجتہاد فی الاسلام" (ص ۲۵۱) میں علامہ فرماتے ہیں:

"سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی قانون میں کیا فی الواقع مزید نشوونما اور ارتقا کی گنجائش ہے؟ لیکن اس سوال کے جواب میں ہمیں بڑی زبردست کاوش اور محنت سے کام لینا پڑے گا، گو ذاتی طور پر مجھے یقین ہے کہ اس کا جواب اثبات میں دیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ ہم اس مسئلہ میں وہی روح برقرار رکھیں جس کا اظہار کبھی حضرت عمرؓ کی ذات میں ہوا تھا، وہ امت کے اوّلین دل و دماغ ہیں۔ جو ہر معاملے میں آزادیٔ رائے اور تنقید سے کام لیتے تھے اور جن کی اخلاقی جرأت کا یہ عالم تھا کہ حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حالتِ نزع میں یہاں تک کہہ دیا کہ ہمارے لئے اللہ کی کتاب ہی کافی ہے۔ (حسبنا کتاب اللہ)"

اسی خطبے میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

"جہاں تک مسئلہ اجتہاد کا تعلق ہے ہمیں چاہیئے ان احادیث کو جن کی حیثیت سر تا سر قانونی ہے، ان احادیث سے الگ رکھیں جن کا قانون سے کوئی تعلق نہیں۔

پھر اوّل الذکر کی بحث میں بھی ایک بڑا اہم سوال یہ ہو گا کہ ان میں عرب قبل از اسلام کے اس رسم و رواج کا جسے جوں کا توں

چھوڑ دیا گیا، یا جس میں حضور رسالت مآب صلعم نے تھوڑی بہت ترمیم کردی، کس قدر حصہ موجود ہے ـــــ لیکن یہ وہ حقیقت ہے جس کا اکتشاف مشکل ہی سے ہو سکے گا۔ کیونکہ علمائے متقدمین شاذ ہی اس رسم و رواج کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ہمیں تو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ جس رسم و رواج کو جوں کا توں چھوڑ دیا گیا، خواہ حضور رسالت مآب صلعم نے اس کی بالصراحت منظوری دی یا خاموشی اختیار فرمائی، اس پر کیا ہیچ ہر کہیں اور ہر زمانے میں عمل کرنا مقصود تھا۔ شاہ ولی اللہ نے اس مسئلے میں بڑی سبق آموز بحث اٹھائی ہے، ہم اس کا مفاد ذیل میں پیش کریں گے۔

شاہ ولی اللہ کہتے ہیں انبیاء کا عام طریق تعلیم تو یہی ہے کہ وہ جس قوم میں مبعوث ہوتے ہیں ان پر اسی قوم کے رسم و رواج اور عادات و خصائص کے مطابق شریعت نازل کی جاتی ہے۔ لیکن جس نبی کے سامنے ہمہ گیر اصول ہیں اس پر نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول نازل کئے جائیں گے، نہ یہ ممکن ہے کہ وہ ہر قوم کو اپنی اپنی ضروریات کے لئے الگ الگ اصول عمل متعین کرنے کی اجازت دے، وہ کسی ایک قوم کی تربیت کرتا اور پھر ایک عالمگیر شریعت کی تشکیل میں اس سے تمہید کا کام لیتا ہے۔ لیکن ایسا کرنے میں وہ اگرچہ انہیں اصولوں کو حرکت دیتا ہے جو ساری نوع انسانی کی حیات اجتماعیہ میں کارفرما ہیں، پھر بھی ہر معاملہ میں ہر موقعہ پر عملاً ان کا اطلاق اپنی قوم کی مخصوص عادات کے مطابق ہی کرتا ہے لہذا اس طرح جو

احکام وضع ہوتے ہیں (مثلاً "تعزیرات[1]) ایک لحاظ سے اسی قوم کے لئے مخصوص ہوں گے۔ پھر چوں کہ احکام مقصود بالذات نہیں اس لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کو آئندہ نسلوں کیلئے بھی واجب ٹھہرایا جائے۔ [2]

---

[1] بریکٹ کی یہ عبارت بھی مترجم کی ہے۔

[2] علامہ اقبال یا انکے مترجم نے اس حوالے کے متعلق یہ نہیں بتایا کہ یہ شاہ صاحب کی کس کتاب سے متعلق ہے، اس کی تلاش میں ہم نے شاہ صاحب کی دو جلدوں پر مشتمل ضخیم کتاب حجۃ اللہ البالغہ پوری کھنگالی تو یہ حوالہ اسکے باب الحاجۃ الی دین ینسخ الادیان اور باب بیان اقسام علوم النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں مل گیا۔ شاہ صاحب کی یہ کتاب مولانا عبدالحق حقانی (مفسر تفسیر حقانی) کے ترجمہ کے ساتھ نور محمد تاجر کتب آرام باغ کراچی نے شائع کی۔ اس کی جلد اوّل کے ص۲۵۴، ص۲۵۵ اور ص۲۸۱ تا ص۲۸۳ پر یہ عبارت پائی جاتی ہے۔

علامہ اقبال کے بیان کردہ خلاصہ میں جو آخری جملہ ہے " پھر چونکہ احکام مقصود بالذات نہیں اسلئے یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کو آئندہ نسلوں کے لئے واجب ٹھہرایا جائے " اسکی اصل عبارت یہ ہے:

فلا احسن ولا ایسر من ان یعتبر فی الشعائر والحدود والارتفاقات عادۃ قومہ المبعوث فیھم ولا یضیق کل التضییق علی الآخرین الذین یأتون بعد ویبقی علیھم فی الجملۃ (ج ۱ ص۲۵۵) اس کا ترجمہ علامہ شبلی نے اپنی کتاب "الکلام" ص۱۱۲، ص۱۱۳ (طبع اوّل) میں یہ کیا ہے کہ:

" اس بنا پر اس سے بہتر اور آسان طریقہ کوئی نہیں کہ شعائر، تعزیرات اور انتظامات میں خاص اس قوم کے عادات کا لحاظ کیا جائے جن میں پیغمبر پیدا ہوا ہے، اسکے ساتھ آنے والی نسلوں پر ان احکام کے متعلق چنداں سخت گیری نہ کی جائے "

(باقی اگلے صفحہ پر)

(بقیہ) یہی وہ عبارت تھی جس کی بنا پر مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اور بعض علمائے دیوبند نے علامہ شبلی پر کفر کا فتویٰ صادر کیا (اس کی تفصیلات مولانا عبدالماجد دریا بادی کی کتاب "حکیم الامت" نیز مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب "تفہیمات" کے مضمون فتنۂ تکفیر میں ملاحظہ ہو)۔ بعد میں مولانا عبیداللہ سندھی دیوبندی نے اپنی کتاب "حالات، تعلیمات اور سیاسی افکار" (مرتبہ پروفیسر محمد سرور) میں یہی عبارت علامہ شبلی کے ترجمے کے ساتھ دی تو علامہ شبلی کے مدرسے ندوۃ العلماء کے مولانا مسعود عالم ندوی نے اپنے استاد سید سلیمان ندوی کی فرمائش پر، مولانا سندھی پر کفر کا فتویٰ صادر کیا اور باقاعدہ ایک کتاب لکھی جس کے جواب میں دیوبندی عالم مولانا سعید احمد اکبر آبادی کو "مولانا سندھی اور ان کے ناقد" لکھنی پڑی (یہ کتاب اور پروفیسر سرور کی کتاب سندھ ساگر اکیڈمی بیرون لوہاری دروازہ لاہور نے شائع کی ہیں) لیکن تعجب ہے کہ اپنے بزرگ علامہ شبلی کے خلاف (جن کے حوالے سے سندھی صاحب نے یہ عبارت نقل کی تھی) ندوی حضرات نے ایک لفظ نہیں لکھا۔ مزید لطف یہ کہ دیوبندی حضرات ندویوں کے سربراہ علامہ شبلی کے خلاف اور ندویوں کے نمائندے مسعود عالم ندوی دیوبند کے بزرگ مولانا سندھی کے خلاف فتوے صادر کرتے رہے لیکن شبلی و سندھی دونوں حضرات جس شخصیت (یعنی حضرت شاہ ولی اللہ) کی عبارت پیش کر رہے تھے، اس کے خلاف دونوں میں سے کسی کو بھی فتویٰ دینے کی جرأت نہیں ہوئی کیونکہ وہ دونوں کے مسلّمہ پیشوا تھے۔ یہ ہے ہمارے علماء کا جماعتی تعصب اور شخصیت پرستانہ غلو کہ اگر اپنا آدمی ایک بات کہے تو قابلِ برداشت لیکن وہی بات دوسرا کہدے تو قابلِ گردن زدنی۔ یہ حالت تو سنجیدہ علماء کی ہے ورنہ بریلوی علماء کی طرح کے متشدد حضرات کا تو پوچھنا ہی کیا۔

جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

(باقی اگلے صفحہ پر)

خوب سمجھ گئے تھے۔ احادیث سے اعتنا[1] نہیں کیا۔ انہوں نے اصولِ استحسان[2] یعنی فقہی ترجیح کا اصول قائم کیا جس کا تقاضا یہ ہے کہ قانونی غور و فکر میں ہم ان احوال و ظروف کا بھی جو واقعۃً موجود ہیں باحتیاط مطالعہ کریں۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ فقہ اسلامی کے مآخذ کے بارے میں ان کا رویہ کیا تھا۔ رہا یہ کہنا کہ امام موصوف نے احادیث سے اس لئے اعتنا نہیں کیا کہ ان کے زمانہ میں کوئی مجموعۂ احادیث موجود نہیں تھا، سو اس سلسلہ میں اوّل تو یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اس زمانے میں احادیث کی تدوین نہیں ہوئی تھی، کیوں کہ عبدالملک (ابن ماجشون) اور زُہری کے مجموعے امام صاحب کی وفات سے کم ازکم تیس برس پہلے مرتب ہو چکے تھے ثانیاً اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ امام موصوف ان مجموعوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکے، یا یہ کہ ان میں فقہی احادیث موجود نہیں تھیں۔ جب بھی اگر وہ ضروری سمجھتے تو امام مالک اور امام احمد بن حنبل کی طرح خود اپنا مجموعۂ احادیث تیار کر سکتے تھے۔ لہٰذا بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو میری رائے میں امام موصوف نے فقہی احادیث کے بارے میں جو روش اختیار کی (یعنی قانونی معاملات میں احادیث سے اعتنا نہ کرنا مرتب) سرتاسر جائز اور درست تھی۔ اندریں صورت اگر آزادیٔ اجتہاد کی وہ تحریک جو اس وقت دنیائے اسلام میں پھیل رہی ہے، احادیث کو بلا جرح و تنقید قانون کا ماخذ تسلیم کرنے کے لئے طیار نہیں

بقیہ حاشیہ :- یہی صورت حال یہاں بھی ہے کہ علامہ اقبال چوں کہ طاقتور شخصیت ہیں اور انکے خلاف بولنے سے اپنا نقصان ہو سکتا ہے اس لئے ان پر کوئی فتویٰ کفر نہیں لگاتا کہ وہ حدیثوں کو قرآن کی طرح لازمی اور ابدی کیوں نہیں مانتے ان میں تبدیلی کو جائز کیوں سمجھتے ہیں؟ لیکن یہی خیالات جب دوسرے اشخاص سے سنتے ہیں تو انہیں منکرِ حدیث، دشمنِ رسول اور خدا جانے کیا کیا کہنا شروع کر دیتے ہیں۔

[1] امام اعظم کے متعلق علامہ اقبال کی اس تحقیق کی تائید میں مفصل حوالے ضمیمہ نمبر ا میں صفحہ ۹ پر ملاحظہ فرمائیں۔ [2] امام اعظم کے اصولِ استحسان پر امام شافعی نے جو تلخ تنقید کی ہے وہ بھی اسی ضمیمہ میں پیش کی گئی ہے۔

تو اس سے اہل سنت والجماعت کے ایک امام الائمہ ہی کی پیروی مقصود ہے" ص۲۵۱
اس عبارت کا خلاصہ یہ ہوا کہ عالمگیر شریعت تو قرآن مجید ہے۔ جو عالمگیر ہونے کے ساتھ ساتھ ابدی بھی ہے۔ لیکن احادیث نہ تمام ممالک کے لئے ہیں نہ قیامت تک کے لئے ابدی، ان میں حسبِ ضرورت زمانہ و علاقہ تبدیلی کی جا سکتی ہے۔

اسی خطبہ میں علامہ اقبال حجازی فقہا (امام مالک و شافعی و احمد بن حنبل وغیرہ) اور عراقی فقہاء (یعنی امام اعظم اور ان کے شاگرد جو اہل الرائے کہلاتے تھے) کے درمیان بنیادی فرق بتاتے ہوئے فقہائے حجاز پر یہ تنقید کرتے ہیں کہ ان کی غلطی یہ ہے کہ وہ احادیث رسول اور صحابہ کے فیصلوں کو وقتی فیصلے سمجھنے کے بجائے۔ قرآن کی طرح مستقل اور ابدی سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ عراقی و حجازی فقہاء کا اختلاف

"در اصل قانونی تحقیق و تفتیش میں استخراج اور استقرأ کا نزاع تھا۔ فقہائے عراق نے تو گویا تصور کے دوامی لیکن فقہائے حجاز نے اس کے زمانی پہلو پر زور دیا۔ مگر یہ مؤخر الذکر (فقہائے حجاز) بھی تو خود اپنے موقف کی صحیح قدر و قیمت سے ناواقف رہے۔ ان کا میلانِ طبع قدرتاً حجاز کی روایات پر تھا۔ لہٰذا وہ بھی ان نظائر کے بارے میں زیادہ وسیع نقطۂ نظر قائم نہ کر سکے جو زمانِ رسالت اور عہد صحابہ میں قائم ہوئے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہیں محسوس کی قدر و قیمت کا اعتراف تھا۔ لیکن انہوں نے اسے بھی دوامی حیثیت دیدی"۔ (خطبات اقبال ص۲۷۳)

جس زمانہ میں علامہ اقبال یہ اجتہاد والا خطبہ لکھ رہے تھے اس زمانے میں وہ علامہ انور شاہ کشمیری، سید سلیمان ندوی، مولانا عبد الماجد دریابادی مولانا مسعود عالم ندوی وغیرہ کی طرح کے قدامت پسند علماء سے جو

وسیع المطالعہ ہوں، مشورے کرتے رہتے تھے۔ (حوالے کے لئے مؤخر الذکر تینوں کے نام اقبالنامہ میں مکاتیب ملاحظہ ہوں) تاکہ مسئلہ کا دوسرا رُخ بھی علامہ کے سامنے نکھر کر آجائے اور وہ قدامت پسندوں کے دلائل سے اپنے خیالات کا تقابل کرکے حقیقت تک پہنچ سکیں۔ ان قدامت پسند حضرات کے سامنے وہ اپنے خیالات کا اظہار بہت کم کرتے ہیں (تاکہ یہ حضرات بدک نہ جائیں) البتہ سوالات قائم کرکے ان سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس میں بھی بے حد احتیاط سے کام لیتے ہیں کہ کہیں یہ لوگ ناراض ہوکر تعلقات ہی منقطع نہ کر بیٹھیں مثلاً سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں (خطوط ص ۱۶۱، ۱۶۲)

"لاہور ۲۲ ستمبر ۱۹۲۹ء

مخدومی السلام علیکم!

الکلام (یعنی علم کلام جدید) کے ص ۱۱۲، ۱۱۳ پر مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ (صفحہ ۱۲۳) کا ایک فقرہ عربی میں نقل کیا ہے جس کے مفہوم کا خلاصہ انہوں نے اپنے الفاظ میں بھی دیا ہے۔ اس عربی فقرے کے آخری حصہ کا ترجمہ یہ ہے۔

"اس بنا پر اس سے بہتر اور آسان طریقہ کوئی نہیں کہ شعار، تعزیرات اور انتظامات میں خاص اس قوم کے عادات کا لحاظ کیا جائے۔ جن میں یہ امام (مراد پیغمبر ہے مرتب) پیدا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ آنے والی نسلوں پر ان احکام کے متعلق چنداں سخت گیری نہ کی جائے۔"

مہربانی کرکے یہ فرمایئے کہ مندرجہ بالا فقرے میں لفظ شعار سے کیا مراد ہے؟ اور اسکے تحت میں کون کون سے مراسم یا دستور آتے ہیں۔ اس لفظ کی مفصل تشریح مطلوب ہے جواب کا سخت انتظار رہے گا۔ والسلام"

مخلص محمد اقبال۔

اس سے اگلے خط (۸ء ص۱۶۲) میں لکھتے ہیں:

"لاہور۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۲۹ء

مخدومی، والا نامہ ملا جس کے لئے بہت شکر گزار ہوں۔ لفظ شعار کے متعلق پورا اطمینان آپ کی تحریر سے نہیں ہوا۔ کیا کسی جگہ حضرت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں شعائر کی یہ تشریح کی ہے جو آپ نے کی ہے؟ دیگر عرض یہ ہے کہ شاہ صاحب نے اسی فقرہ میں لفظ ارتفاقات استعمال کیا ہے، مولانا شبلی نے ایک جگہ اس کا ترجمہ "انتظامات" اور دوسری جگہ "مسلّمات" کیا ہے۔ اردو ترجمہ سے یہ نہیں کھلتا کہ اصل مقصود کیا ہے؟ کل سیالکوٹ میں حجۃ اللہ البالغہ مطالعہ سے گذری، اس سے معلوم ہوا کہ شاہ صاحب نے ارتفاقات کی چار قسمیں لکھی ہیں، ان چار قسموں میں تمدنی امور مثلاً نکاح طلاق وغیرہ کے مسائل بھی آجاتے ہیں، کیا شاہ صاحب کے خیال میں ان معاملات میں بھی سخت گیری نہیں کی جاتی؟ میرا مقصد محض شاہ صاحب کا مطلب سمجھنا ہے، مہربانی فرما کر اسے واضح فرمائیے۔ سنت[ع] پر آپ کا مضمون ضرور دیکھوں گا، اور اس سے اپنی تحریر میں فائدہ بھی اٹھاؤں گا۔ اس خط کا جواب جلد ارسال فرمائیے"

مخلص محمد اقبال

ایک اور خط (۱ء ص۱۴۷) میں لکھتے ہیں:

"قاعدۂ میراث کے حصص کے متعلق میں نے مضمون "اجتہاد" میں یہی طریق اختیار کیا ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ لڑکی کو لڑکے سے آدھا حصہ ملنا عین انصاف ہے، مساوی حصہ ملنے سے انصاف قائم نہیں رہتا ہے۔ بحث کا محرک ترکی شاعر ضیا بکسہ کی بعض تحریریں تھیں جن میں وہ اسلامی طلاق

ع حدیث و سنت کے متعلق علامہ اقبال کی آزاد خیالی دیکھ کر سید صاحب نے اپنے ایک مضمون کی طرف علامہ کو متوجہ کیا ہے جو اسی زمانے میں (۱۹۲۹ء) سید صاحب نے لکھا تھا۔

اور میراث کا ذکر کرتا ہے۔ میں نے جو (اسی قاعدۂ میراث کے۔ مرتب) حصص کے متعلق آپ سے دریافت کیا تھا۔ اس کا مقصد یہ نہ تھا کہ میں ان حصص میں ترمیم چاہتا ہوں، بلکہ خیال یہ تھا کہ شاید ان حصص کی ازلیت و ابدیت پر آپ کوئی روشنی ڈالیں گے۔"

اسی خط کے ابتداء میں لکھتے ہیں:

عبادات کے متعلق کوئی ترمیم و تنسیخ میرے پیش نظر نہیں ہے، بلکہ میں نے اپنے مضمون اجتہاد میں ان کی ازلیت و ابدیت پر دلائل قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہاں معاملات کے متعلق بعض سوالات دل میں پیدا ہوتے ہیں، اس مضمون میں چونکہ شرعیت احادیث (یعنی وہ[1] احادیث جن کا تعلق معاملات سے ہے) کا مشکل سوال پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ابھی تک میرا دل اپنی تحقیقات سے مطمئن نہیں ہوا۔ اس واسطے وہ مضمون شائع نہیں کیا گیا" (صفحہ ۱۴۶، ۱۴۷)

پھر خط نمبر ۷۲ (ص۱۵۲) میں یہ بتاتے ہوئے کہ مجھے حدیثوں کے شریعت اور دین ہونے سے اگرچہ انکار ہے۔ مگر اس کا یہ مقصد نہیں کہ احادیث میں سرے سے کوئی کام کی بات ہی نہیں ہے لکھتے ہیں:

"شرعیتِ احادیث کے متعلق جو کھٹک میرے دل میں ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ احادیث سرے سے بیکار ہیں، ان میں ایسے بیش بہا اصول ہیں کہ سوسائٹی باوجود اپنی ترقی و تعالی کے اب تک ان کی بلندیوں تک نہیں پہونچی۔ مثلاً ملکیتِ شاملاتِ دہ کے متعلق المرعیٰ للہ و لرسولہ (بخاری)"

اس خط پر حاشیہ میں سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ حدیث کے شریعت

---

[1] یہ اس لفظ کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ صرف ان احادیث کی قانونی حیثیت سے متعلق میں اپنے مضمون میں بحث کر رہا ہوں جو معاملات سے متعلق ہیں۔ لفظ "شرعیت احادیث" کے معنی ہیں احادیث کا شریعت ہونا، حجت ہونا، قانون ہونا۔

ہونے کے متعلق "میں نے ان کو تسلی بخش جواب دیدیا تھا" لیکن یہ سید صاحب کی خوش فہمی ہے۔ ممکن ہے خود سید صاحب کے لئے وہ جواب تسلی بخش ہو، لیکن علامہ اقبال کے نزدیک ان کا جواب تسلی بخش نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ نے اس کے بعد جب اپنا خطبہ "اجتہاد" شائع کیا ہے تو اس میں اقبال کے وہی سابقہ خیالات تھے، سید صاحب کے خیالات کا ان میں ذرا بھی پرتو نظر نہیں آتا (اس خطبہ کے اقتباسات ہم پہلے پیش کر چکے ہیں)

بعض مکاتیب میں علامہ اقبال جرأت کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔ مثلاً خط نمبر ۶۶ (ص ۱۳۵) میں علماء کے اس نقطۂ نظر کے خلاف کہ حدیث رسول قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے، لکھتے ہیں:

"اگر صحابہ کے اجماع نے کوئی حکم نص قرآنی کے خلاف نافذ کیا تو علامہ[1] آمدی کے خیال کے مطابق ایسا کسی ناسخ حکم کی بنا پر ہوا ہے۔ وہ ناسخ حکم سوائے حدیث نبوی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حدیث ناسخ قرآن ہو سکتی ہے۔ جس سے کم از کم مجھے تو انکار ہے اور غالباً آپ کو بھی ہوگا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو دوبارہ زحمت دینے پر مجبور ہوا۔ لیکن آپ کے وسیع اخلاق پر بھروسہ کر کے یہ جراءت کی ہے"

ایک جگہ (خط نمبر ۷۰ ص ۱۴۵) علماء کے اس ارشاد پر کہ ایک حدیث نے قرآنی آیۂ وصیت کو منسوخ کر دیا ہے، لکھتے ہیں:

"آیۂ وصیت پر بھی (آپ کے) جو ارشادات ہیں میری سمجھ میں نہیں آئے اس زحمت کے لئے معافی چاہتا ہوں"

اپنے خطبۂ اجتہاد میں اجماع کی بحث کرتے ہوئے بھی علامہ اپنے اسی نقطۂ نظر کا اظہار کرتے ہیں کہ "پیغمبر کی کسی حدیث میں بھی یہ شان نہیں کہ وہ قرآن (کے کسی حکم) کی تنسیخ کر سکے (خطبۂ اجتہاد کا ترجمہ مندرجہ ماہنامہ چراغ راہ کا اسلامی قانون نمبر جلد دوم ص ۸۳) جناب پرویز بھی اس خطبہ کا ترجمہ کرتے

---

[1] اصول فقہ کے مشہور امام جن کی کتاب "الاحکام فی اصول الاحکام" مشہور ہے۔

ہوئے یہی لکھتے ہیں کہ "قرآن کو تو رسول اللہؐ کی کوئی حدیث بھی منسوخ نہیں کر سکتی" (اسلام میں قانون سازی کا اصول صـ۲۱۲ شائع کردہ ادارۂ طلوع اسلام کراچی) تعجب ہے کہ بزم اقبال لاہور کے شائع کردہ ترجمۂ خطبات (از سید نذیر نیازی) میں اس جملہ کا ترجمہ ہی نہیں کیا گیا (ممکن ہے یہ سطر کاتب سے رہ گئی ہو)۔

جب ہمارے علماء آنحضرتؐ کے اقوال کو متواتر ثابت نہیں کر سکتے تو وہ نماز کی مثال پیش کر کے کہتے ہیں کہ کم از کم یہ تو عملی تواتر سے ثابت ہے، یہی بات سید سلیمان نے کہی تھی۔ اس پر علامہ اقبال سید صاحب سے (خط نمبر ۹۵ صـ۱۸۴ میں) ایک بہت اہم سوال کرتے ہیں کہ:

"آپ فرماتے ہیں کہ تواتر عمل کی ایک مثال نماز ہے (پھر) مالکیوں اور حنفیوں اور شیعوں میں جو اختلافِ صورت نماز میں ہے وہ کیوں کر ہوا؟" (اس کا جواب سید صاحب نے کچھ نہیں دیا)

علامہ مرحوم قرآن و حدیثِ رسول میں فرق مراتب کے سلسلہ میں ایک خط (۹۶ صـ۱۸۱) میں سید صاحب سے بعض انتہائی اہم سوالات دریافت کرتے ہیں کہ:

"آپ نے کسی گذشتہ خط میں مجھے لکھا تھا کہ حضور سرورِ کائناتؐ سے جب کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو آپ بعض دفعہ وحی کا انتظار فرماتے۔ اگر وحی نازل ہوتی تو اس کے مطابق مسائل کا جواب دیتے اور اگر وحی کا نزول نہ ہوتا تو قرآن شریف کی کسی آیت سے استدلال فرماتے اور جواب کے ساتھ وہ آیت بھی پڑھ دیتے اس کا حوالہ کونسی کتاب میں ملے گا؟ کیا یہ قاضی شوکانی کی کتاب ارشاد الفحول سے آپ نے لیا ہے (اسکے حاشیہ میں سید سلیمان لکھتے ہیں کہ "اس کا ذکر کتبِ احادیث میں ہے")

دوسرا امر جو اسکے متعلق دریافت طلب ہے، یہ ہے کہ جو جواب وحی کی بنا پر دیا گیا وہ تمام اُمّت پر حُجّت ہے اور وہ وحی بھی

قرآن شریف میں داخل ہوگئی لیکن جو جواب محض استدلال کی بنا پر دیا گیا جس میں وحی کو دخل نہیں، کیا وہ بھی تمام اُمّت پر حُجّت ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو اس سے یہ لازم آئیگا کہ حضور کے تمام استدلالات بھی وحی میں داخل ہیں (اس پر حاشیہ میں سید صاحب لکھتے ہیں کہ "وحی خفی میں داخل ہیں") یا بالفاظِ دیگر یہ کہ قرآن و حدیث میں کوئی فرق نہیں؟ جواب سے مطلع فرماکر ممنون فرمائیے۔ مخلص محمد اقبال لاہور ۱۶ اکتوبر ۱۹۲۴ء"

اس آخری جملہ میں علامہ مرحوم نے جو انتہائی اہم سوال کیا تھا۔ اس کے جواب میں اسی خط کے حاشیہ پر سید صاحب لکھتے ہیں "جی نہیں دونوں میں بڑا فرق ہے" قرآن پاک بالفاظ وحی ہے اور بتواتر منقول ہے اور یہ حدیثیں وحی سے معناً ماخوذ ہیں اور بہ تواتر منقول نہیں"

اوّل تو سید صاحب کا یہ جواب، سوال کے مطابق نہیں کیونکہ علامہ مرحوم کا سوال ایک اصولی سوال ہے۔ آج کی حدیثوں کے متعلق نہیں جو یہ کہا جائے کہ قرآن تواتر سے ثابت ہے اور احادیث تواتر سے ثابت نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر بالفرض آج کوئی بالکل صحیح اور قطعی متواتر حدیث بھی ہو تو کیا اس میں اور ارشادِ قرآنی میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟ اگر کہا جائے کہ کوئی فرق نہیں کیونکہ حدیث بھی وحی خفی ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا وحی جلی (قرآن) اور وحی خفی (حدیث) دونوں برابر ہیں؟ اگر برابر ہیں تو پھر اس دورنگی وحی کی ضرورت ہی کیا تھی، جب جلی اور خفی میں کوئی فرق ہی نہیں تو پھر ان کو جلی اور خفی علیحدہ دو نام دینے کی کیا ضرورت تھی؟ حضرت خواجہ احمد کے نقطۂ نظر کے مطابق علامہ اقبال اس کا نہایت معقول جواب دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اوّل تو وحی خفی کا کوئی وجود عہد نبوی اور عہد صحابہ میں نظر نہیں آتا۔ (جیسا کہ سید صاحب ہی کے نام ایک مکتوب میں علامہ کے سوال پر

سیّد صاحب نے اعتراف کیا ہے۔ ملاحظہ ہو خط ۴۲ صفحہ ۱۵۴)۔ اور اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے تو ان دونوں کے ناموں میں جلی اور خفی (یا مَتلُو اور غیر مَتلُو) کی تفریق ہی یہ بتا رہی ہے کہ ان دونوں میں کوئی نہایت اہم فرق ہے جسے پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ غور و فکر کے نتیجے میں یہی بات سامنے آتی ہے کہ وحی جلی یا وحی مَتلُو یعنی قرآن تو ہر ملک اور علاقے کے مسلمانوں کے لئے، قیامت تک حجت ہے، یعنی اسکے احکام عالمگیر بھی ہیں اور ابدی بھی۔ اس کے برعکس احادیث جنہیں علماء وحی خفی یا وحی غیر مَتلُو کے نام سے موسوم کرتے ہیں، چونکہ آنحضرت کے زمانے اور علاقے کی مناسبت سے ہیں اس لئے وہ قرآن کی طرح نہ تو عالمگیر ہیں اور نہ قیامت تک کے لئے ہیں۔ بعد میں آنے والے حسب ضرورت ان میں رد و بدل کر سکتے ہیں۔ دوسرا اہم فرق دونوں میں یہ ہے کہ وحی خفی کا رتبہ چونکہ کم ہے اس لئے وہ وحی جلی یعنی قرآن کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ علامہ کے یہ خیالات آپ ان کے خطبۂ اجتہاد کے حوالے سے مفصل طور پر ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ جہاں انہوں نے حضرت عمرؓ کے ارشاد حَسْبُنَا کتاب اللّٰہ کو آج کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لئے ضروری قرار دیا ہے[1]۔ امام اعظم کے حدیث سے اعتنا نہ کرنے کو بیان کیا ہے[2]۔ حدیث کے ذریعے قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کرنے کا انکار کیا ہے اور حجازی فقہا پر یہ تنقید کی ہے کہ انہوں نے عہد نبوی و عہدِ صحابہ کے فیصلوں کو قرآن کی طرح غیر متبدل قرار دے کر نہایت قدامت پسندی کا ثبوت دیا وغیرہ، اس کی مزید تفصیل دلائل کے ساتھ حضرت خواجہ کی کتاب میں آگے چل کر آپ دیکھ لیں گے۔

بہرحال یہ علامہ اقبال کی عظمت و فراخ دلی تھی کہ وہ جس موضوع پر بھی لکھتے تھے اسکے متعلق موافقین و مخالفین سب کی بات سنتے تھے، بالآخر کسی ایک نتیجے پر پہونچ کر جرأت کے ساتھ اس کا اظہار کر دیتے تھے۔ مثلاً جس طرح سید سلیمان صاحب، و علامہ انور شاہ دیوبندی سے علامہ اقبال نے اجتہاد کے مضمون پر مشورے لئے اسی طرح سید صاحب کے ایک دوست مولانا عبدالماجد دریابادی

سے بھی مشورہ لیا۔ ان کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں (خط ۱۲۸ ص ۲۳۸)

" لاہور۔ ۲۲ مارچ ۱۹۲۵ء

مخدومی السلام علیکم

والانامہ مل گیا جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ مگر آپ کا نوٹ پڑھ کر مجھے بہت تعجب ہوا۔ معلوم ہوتا ہے عدیم الفرصتی کی وجہ سے آپ نے وہ مضمون بہت سرسری نظر سے دیکھا ہے۔ بہر حال میں آپکا خط زیر نظر رکھوں گا۔ مضمون کا مسودہ ارسال فرمایئے۔ امید کہ مزاج بخیر ہو گا۔ مخلص محمد اقبال "

اس کے حاشیہ پر مولانا عبدالماجد لکھتے ہیں " اقبال نے اپنے ایک انگریزی مقالہ " اجتہاد " پر رائے طلب کی تھی اور جو رائے دی گئی خاص مخالفانہ تھی (ص ۲۳۸)

اسی طرح سید سلیمان ندوی صاحب کے شاگرد مولانا مسعود عالم ندوی کے نام خط میں علامہ مرحوم لکھتے ہیں۔

" لاہور، ۱۲، فروری ۱۹۳۶ء

ڈیر مولانا مسعود عالم، السلام علیکم

آپ کا خط عین اس وقت پہونچا جب کہ میں ابن قیمؒ کی اعلام الموقعین پڑھ رہا تھا۔ خدا تعالیٰ آپکو جزائے خیر دے۔ میرے مطلب کے لئے کافی مسالہ آپ نے جمع کر دیا ہے۔ اب اگر ضرورت ہوئی تو اسی سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ مولانا سید سلیمان ندوی کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں۔ فقہی مسائل کے اختلافات اور علماء اسلام کی جرح و قدح جس میں حضور رسالت مآبؐ کا عشق پوشیدہ ہے۔ ان تمام چیزوں کا مطالعہ بیحد روحانی لذت رکھتا ہے۔ میں نے تو صرف یہ لکھا تھا کہ شرعی اجازت کو امیر منسوخ کر سکتا ہے۔ اعلام (الموقعین) سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض خاص حالات میں قرآن کے تعزیری احکام میں بھی

تغیّر ہو سکتا ہے مثلاً سارق کے لئے قطع ید کے حکم میں خود حضورؐ
نے جنگ کے دوران میں تغیر کر دیا تھا۔ بہرحال جو زحمت آپ
نے اٹھائی ہے میں اس کے لئے بیحد شکر گذار ہوں"۔

(اقبال نامہ صفحہ ۴۰۳، ۴۰۴ خط نمبر ۲۳۸)

اس طرح علامہ مرحوم نے ان سب حضرات سے مشورہ لینے اور پوری طرح سوچ بچار کرنے کے بعد اپنے خطبۂ 'اجتہاد' کو شائع کیا جس کے بعض متعلقہ حصے آپ ملاحظہ فرما چکے۔ علامہ نے اپنے ان دوستوں کے یا دوسرے علماء حضرات کے ڈر اور خوف سے اپنے صحیح خیال کو ظاہر کرنے میں کوئی مداہنت نہیں کی گو اپنی زندگی میں اس خطبے کا ترجمہ شائع نہ کر کے کھلی جنگ سے بھی بچ گئے —— یہ طرزِ عمل مصلحت کے عین مطابق تھا۔ وہ اپنے ایک خط میں عبدالماجد صاحب ہی کو (ایک اور مسئلے میں) اپنی فطرت کے متعلق بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"یہ بات دُنیا کو عنقریب معلوم ہو جائے گی کہ اقبال کلمۂ حق کہنے
سے باز نہیں رہ سکتا۔ ہاں کھلی کھلی جنگ اس کی فطرت کے خلاف ہے"

(خط ۱۲۳ ص ۲۲۳)

غرض یہ کہ مقامِ حدیث کے متعلق علامہ کا یہ نقطۂ نظر اتنا واضح اور دو ٹوک ہے کہ سوائے بددیانت شخص کے یا لاعلم اور جاہل آدمی کے کوئی بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی کے ادارہ دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہونے والی علامہ اقبال کی سوانح میں جس کا نام "اقبال کامل" ہے۔ علامہ اقبال کے اسی نقطۂ نظر کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس سوانح پر مولانا عبدالماجد دریابادی کا دیباچہ ہے اور اس کے مصنف سید سلیمان ندوی کے ساتھی مولانا عبدالسلام ندوی ہیں۔ چونکہ یہ تمام حضرات علامہ اقبال کے خطوط سے ذریعے علامہ کے اصل خیالات سے واقف تھے۔ (ماجد صاحب نے تو انگریزی جاننے کی وجہ سے علامہ کا اصل انگریزی مقالہ (اجتہاد) بھی دیکھا تھا) اور سید صاحب علامہ کے سفر افغانستان میں ان کے ہمراہ بھی تشریف لے گئے تھے۔ اس لئے

ان حضرات کی شائع کردہ کتاب میں علامہ کا جو مسلک بتایا گیا ہے اس سے زیادہ مستند بیان شاید ہی کسی اور کا ہو سکتا ہے۔ اس کتاب میں مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

"وہ اہلِ قرآن تھے لیکن اپنے آپکو اہل قرآن کہنا بھی ایک قسم کی فرقہ پسندی تھی اس لئے انہوں نے کبھی اپنے آپ کو اہلِ قرآن کی طرف منسوب نہیں کیا۔[1] تاہم ان کے اشارات بلکہ تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ مذہب کے متعلق ان کا عروۃ الوثقیٰ صرف قرآن تھا، مثنوی رموزِ بیخودی میں فرماتے ہیں:

گر تو می خواہی مسلماں زیستن ۔۔۔ نیست ممکن جز بقرآں زیستن
صوفیِ پشمینہ پوش حال مست ۔۔۔ از شرابِ نغمۂ قوال مست
آتش از شعرِ عراقی در دلش ۔۔۔ در نمے سازد بقرآں محفلش
واعظِ دستاں زن و افسانہ بند ۔۔۔ معنیٔ او پست و حرفِ او بلند
از خطیب و دیلمی گفتارِ او ۔۔۔ با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ او
از تلاوت بر تو حق دارد کتاب ۔۔۔ تو ازو کامے کہ میخواہی بیاب

اس باب میں ان کی گفتگوئیں اور زیادہ واضح ہیں۔ عرشی صاحب البیان دسمبر ۱۹۳۹ء صفحہ ۱۹ میں لکھتے ہیں کہ "ایک بار ان سے میں نے پوچھا اسلام بتمامہ قرآن میں محصور ہے یا نہیں فرمایا مفصل کہو، میں نے کہا: خارج از قرآن ذخیرۂ احادیث و روایات اور کتب فقہ وغیرہ کو شامل کر کے اسلام مکمل ہوتا ہے یا صرف قرآن اس باب میں کفایت کرتا ہے۔ انہوں نے فرمایا یہ چیزیں تاریخ و معاملات پر مشتمل ہیں۔ ان کی بھی ضرورت ہے اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ کن ضروریات کے ماتحت وضع کی گئیں، لیکن نفس اسلام قرآن مجید میں بتمام و کمال آچکا ہے۔

---

[1] یہی نقطۂ نظر حضرت خواجہ احمد الدین کا تھا اور وہ اس کی بنیاد قرآن کریم کی اس آیت پر رکھتے تھے کہ ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہمارا نام مسلم رکھا ہے تو اس سے روگردانی حکم قرآن کی مخالفت ہے۔

خداوند تعالیٰ کا منشا دریافت کرنے کے لئے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں"

ایک اور گفتگو میں جو انہوں نے ایک غالی اہلحدیث سے کی فرمایا:

" میں اعتقادی امور میں صرف قرآن پر انحصار رکھتا ہوں اور حدیث کے متعلق مجھے اور آپ سب کو معلوم ہے کہ کن ذریعوں سے ہم تک پہونچی ہے۔ اس پر ایک صاحب ذرا گرم ہو کر کہنے لگے اگر اس طرح حدیث سے بے پرواہی کی جائے گی تو مسلمانی ختم ہو جائے گی۔ ہمارا کوئی عمل و عبادت حدیث کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا قرآن تو نماز ایسی روزمرہ کی چیز کے لئے بھی ہمیں کوئی تفصیل نہیں بتاتا یہی وجہ ہے کہ فرقہ اہل قرآن نے اپنے لئے عجیب قسم کی نمازیں تراش لی ہیں جن کا جمہور اہل اسلام سے کوئی واسطہ نہیں ان کی نمازوں کے اوقات، اذکار اور رکعات وغیرہ سب عالم اسلامی سے مختلف ہیں، کیا ایسی حالت میں آپ انکو کافر نہ کہیں گے؟" ڈاکٹر صاحب نے اس تیز کلامی کے جواب میں نہایت نرمی سے فرمایا " کافر نہ کہو کوئی اور نام رکھ لو" یہ شدت ہے تم لوگ نمازوں کی رکعت اور اذکار پر لڑتے ہو، مجھے تو سرے سے نمازوں کا وجود ہی کہیں نظر نہیں آتا یعنی مسلمان نماز ہی نہیں پڑھتے [1]

لیکن بایں ہمہ وہ حدیثوں کے سرے سے منکر نہ تھے بلکہ بہت سی حدیثوں پر شدت سے اعتقاد رکھتے تھے۔ ان کو جو کچھ شک وشبہ تھا وہ احادیث کی شرعیت[2] کے متعلق تھا۔ چنانچہ ایک خط میں مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں، تاریخ ۲۴ اپریل ۱۹۲۶ء

" شرعیت[3] احادیث کے متعلق جو کھٹک میرے دل میں ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ احادیث سرے سے بیکار ہیں۔ ان میں ایسے

---

[1] البیان امرتسر دسمبر ۱۹۳۹ء صفحہ ۲۴
[2] یعنی حدیث کی حجیت اور انکو شریعت سمجھنے کے متعلق [3] یعنی احادیث کو شریعت سمجھنے کے

بیش بہا اصول ہیں کہ سوسائٹی باوجود اپنی ترقی و تعالی کے اب تک ان کی بلندیوں تک نہیں پہنچی۔ مثلاً ملکیت شاملات دہ کے متعلق
اَلْمَرْوَعٰی لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ[1] (بخاری) (اقبال نامہ حصہ اول خط ۷۲ صفحہ ۱۵۲)[2]

علامہ مشرقی خاکسار تحریک کے بانی علامہ عنایت اللہ خان مشرقی حضرت خواجہ احمد کے شہر امرتسر ہی کے رہنے والے تھے۔ اس لئے ان کا خواجہ صاحب کے خیالات سے متاثر ہونا ایک فطری امر تھا یہی وجہ ہے کہ ان کی کتاب 'تذکرہ' اور 'حدیث القرآن' میں قدم قدم پر خواجہ صاحب کے افکار کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ کتاب تذکرہ کی تحریر میں خواجہ صاحب کے ایک معتقد حکیم شہاب الدین صاحب (جو ماہنامہ بلاغ امرتسر کے بانی اور ایڈیٹر تھے) کا علمی تعاون بھی مشرقی صاحب کو حاصل رہا۔ 'تذکرہ' کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں، روایت پرستوں پر تنقید کرتے ہوئے۔ تذکرہ کے دیباچہ میں (ص ۲۶) لکھتے ہیں:

"حدیث کے شیدائی اس کی (یعنی قرآن کی) کسی ایک آیت کو صحاح ستہ سے بے نیاز نہیں سمجھتے۔"

حالاں کہ قرآن جو مکمل و مفصل کتاب ہے اس کے سمجھنے کیلئے سوائے عربی کے کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں۔

"حتیٰ کہ کسی یقینی اور غیر یقینی حدیث کی بھی ضرورت نہیں"

(تذکرہ کا مقدمہ ص ۹۱)

ان روایات پرستوں کے خلاف اپنے غصہ کا اظہار کرتے ہوئے جو قرآن مجید کو چھوڑ کر صرف حدیثوں کے پڑھنے پڑھانے میں لگے رہتے ہیں ایک جگہ لکھا ہے کہ "کہیں حَدَّثَنَا اور قال قال کا بے سرا راگ ہے"

(دیباچہ تذکرہ ص ۵۵)

---

[1] یعنی چراگاہ اللہ اور اس کے رسول کی ہیں یعنی تمام امت کے لئے مشترک ہیں۔
[2] یہ پورا عنوان دار المصنفین اعظم گڑھ کی شائع کردہ کتاب اقبال کامل کے ص ۵۵ تا ص ۵۸ سے

تذکرہ کے عربی حصے میں ایک جگہ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغُوْا فِيْهِ کی تشریح میں لکھتے ہیں۔ کہ جس طرح عہدِ نبوی میں کفار قرآن کے خلاف شور مچاتے تھے۔ اسی طرح آج کے نادان مسلمان بھی یہی حرکت کرتے ہیں کیوں کہ

اے مسلمانو

بفقهكم واحاديثكم وجهلكم واباطيلكم	تم اپنی فقہ اور احادیث اور جہالت اور باطل خیالات کے سبب قرآن کریم کی اصل تعلیم کے خلاف شور وغل مچاتے ہو۔

(تذکرہ کا عربی حصہ ص۱۲۵)

حضرت خواجہ احمد کے معتقدین نے قرآنی افکار کی اشاعت کے لئے ایک ماہنامہ 'بلاغ' امرتسر سے جاری کیا تھا اور ایک تنظیم بھی "امتِ مسلمہ" کے نام سے قائم کی تھی۔ مشرقی صاحب کے خیالات میں خواجہ صاحب کے افکار کا اتنا اثر تھا کہ علامہ اقبال کو یہ شبہ ہوا کہ شاید مشرقی صاحب 'امتِ مسلمہ' کے کوئی رکن ہیں۔ گو یہ بات درست نہیں تھی۔ کیونکہ علامہ مشرقی امتِ مسلمہ امرتسر کے باقاعدہ رکن نہیں تھے، صرف ذہنی ہم خیالی تھی۔ لیکن کم ازکم اس سے دونوں کے خیالات کی یکسانیت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ سید سلیمان ندوی کے نام ایک مکتوب میں علامہ اقبال لکھتے ہیں:

"جناب مشرقی امرتسر کے رہنے والے ہیں، نوجوان آدمی ہیں۔ کیمبرج میں ریاضی کا اعلیٰ اِمتحان پاس کیا، ہندوستان واپس آئے تو کچھ مدت کے لئے پشاور کالج کے پرنسپل رہے۔ اس کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا کے محکمۂ تعلیم میں رہے، آج کل غالباً کسی سرکاری اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ مجھے ان کی قابلیت کا حال زیادہ معلوم نہیں..... 'امتِ مسلمہ' سے ممکن ہے ان کا تعلق ہو کیونکہ آجکل 'امت مسلمہ' کا سنٹر امرتسر ہے۔"

(اقبال نامہ خط ۶۸، ص۱۳۸، ۱۳۹)

مولانا عبداللہ العمادی

مولانا عمادی غیر معمولی علم و فضل کے مالک تھے گو عام شہرت انہیں ان تراجم سے حاصل ہوئی جو انہوں نے دارالترجمہ دکن کے دوران قیام کئے۔ تاریخ اسلام اور فن اسماء الرجال کی اوّلین کتاب طبقات ابن سعد کا متعدد ضخیم جلدوں میں کیا ہوا ان کا ترجمہ پاکستان میں نفیس اکیڈمی کراچی نے بھی شائع کر دیا ہے۔ مشہور امام ابن حزم ظاہری کی تقابل ادیان اور فن علم کلام پر مشہور کتاب "الملل والنحل" کے مولانا عمادی کے ترجمہ کا بھی (جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے) پاکستانی اڈیشن لاہور سے شائع ہو گیا ہے۔

دکن آنے سے قبل مولانا عمادی لاہور میں روزنامہ زمیندار کے اڈیٹر تھے۔ اس سے پہلے وہ سالہا سال 'وکیل' امرتسر کے اڈیٹر رہے اور اسی زمانے میں ان کے خواجہ احمد سے تعلقات قائم ہوئے جو خواجہ صاحب کی وفات تک قائم رہے۔ خواجہ صاحب کی سوانح میں آپ کے احباب کے ضمن میں سب سے پہلے مولانا عمادی کا ہی تذکرہ کیا گیا ہے۔ سوانح نگار لکھتا ہے کہ:

"آپ کو خواجہ صاحب سے اس درجہ محبت تھی کہ ہفتہ میں ایک مرتبہ ضرور دونوں بزرگ ملتے اور مختلف مسائل پر باہمی مذاکرہ رہتا۔ یہاں تک کہ علامہ عمادی اسلامک ڈبیٹنگ کلب کے جلسوں میں (جس کے صدر خواجہ صاحب تھے) وقت سے بہت پہلے تشریف لے آتے اور خواجہ صاحب کو بھی مولانا موصوف کی محبت قبل از وقت ہی جلسہ گاہ میں پہونچا دیتی۔ چنانچہ جلسہ شروع ہونے سے قبل دونوں بزرگ نہایت محبت اور خلوص سے تبادلہ خیال فرماتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر مسائل میں دونوں بزرگوں کا اتفاق ہو گیا" (سوانح خواجہ احمد الدین سے شائع شدہ ماہنامہ 'بلاغ' ستمبر ۱۹۲۶ء جبکہ علامہ عمادی حیات تھے اور اس رسالہ کے باقاعدہ قاری تھے)

علامہ عمادی کے اس اتفاق رائے کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ جب ۱۹۱۷ء میں

خواجہ صاحب کے میراث سے متعلق مضامین "معجزۃ القرآن" نامی کتاب کی شکل میں دوسری بار شائع ہوئے تو علامہ عمادی نے روزنامہ زمیندار میں اس پر شاندار تبصرہ کیا (کیونکہ عمادی صاحب اس زمانہ میں زمیندار کے اڈیٹر تھے) اور دوسرا ثبوت ہم انکی کتاب "علم حدیث" کے دیباچے سے پیش کرتے ہیں۔ یہ کتاب عمادی صاحب نے مولانا عبد اللہ چکڑالوی کے ان خیالات کے خلاف لکھی تھی کہ احادیث کی تاریخی حیثیت قطعی ناقابلِ اعتماد ہے (آپکو یاد ہو گا کہ چکڑالوی صاحب کے ان انتہا پسندانہ خیالات پر خواجہ صاحب نے بھی انہیں فہمائش کی تھی) لیکن دیباچہ میں اسکا واضح طور پر اعتراف کیا ہے کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن مجید احادیث کا محتاج ہے یا بغیر احادیث کو تسلیم کئے دین نامکمل رہ جاتا ہے۔ یہی نقطۂ نظر حضرت خواجہ احمد کا ہے۔ مولانا عمادی کی اصل عبارت یہ ہے:

"ہمارا اعتقاد ہے کہ اسلام کا قانون اساسی صرف قرآن مجید ہے۔ اور اس کے مقدس تعلیمات کسی دوسرے مجموعہ کے محتاج نہیں ہیں۔ لیکن کیا قانون اساسی کیساتھ قانون ثانوی (بائیلاز) نہیں ہوا کرتے؟ رسول اللہ (صلعم) کے ہدایات و تعلیمات جن کا استنباط صحیح احادیث سے ممکن ہے۔ انہیں بائیلاز کے درجے میں اگر رکھا جائے تو کیا عقلِ سلیم کو اس سے اختلاف ہو سکتا ہے؟"

(علم الحدیث صا مطبوعہ روز بازار اسٹیم پریس امرتسر ۱۹۱۳ء)

"حدیث بھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال ہی کا نام ہے اور اگرچہ ہم کو بہت صاف لفظوں میں اعتراف ہے کہ اسلام کی تکمیل پر ان اقوال و افعال کے وجود و عدم کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا ہے۔ اس کے لئے قرآن اور صرف قرآن کافی ہے۔ لیکن کیا ایک عظیم الشان پیغمبر اور دنیا کے مشہور ترین مصلح کے واقعات زندگی اور حکیمانہ تعلیمات پر ہماری نظر نہ ہونی چاہیئے؟ جواب اگر اثبات میں ہے تو ایک وسیع النظر مسلمان احادیث سے کیوں کر بے نیاز ہو سکتا ہے۔ کیا یہ باتیں احادیث کا موضوع لہٗ نہیں ہیں؟" (صـ۲)

مولانا اسلم جیراج پوری

خاندانی طور پر مولانا اسلم، اہلحدیثوں کے انتہائی بلند پایہ بزرگ مولانا سلامت اللہ صاحب کے صاحبزادے ہیں، مولانا سلامت اللہ صاحب کے تعارف کے لئے اتنا کافی ہے۔ کہ وہ نواب صدیق حسن خان کے زمانہ میں ریاست بھوپال کے محکمہ تعلیمات کے مہتمم (چیف) تھے۔ برصغیر میں اہلحدیث حضرات کے سب سے بڑے محدّث مولانا عبدالرحمٰن مُبارکپوری شارح ترمذی اور شمس العلماء مولوی حفیظ اللہ صاحب سابق مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء ان کے شاگردوں میں سے ہیں۔

خود مولانا اسلم کی عظمت کے لئے یہ بتا دینا کافی ہے کہ وہ مولانا محمد علی جوہر کے مخصوص دوستوں میں سے تھے اور انہی کی فرمائش پر علیگڑھ یونیورسٹی کی پروفیسری چھوڑکر جامعہ ملیہ دہلی میں تشریف لائے اور بانی اساتذہ میں شمار ہوئے۔ جامعہ ملیہ کے ترجمان رسالہ "جامعہ" کے اڈیٹر بھی مولانا ہی تھے۔ مرتے دم تک مولانا وہیں رہے اور تقسیم برصغیر کے بعد وہیں وفات پائی۔

اسلم صاحب کے مقام کی بلندی کا اس سے بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ علاّمہ اقبال جیسا بلند پایہ شخص انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے یہ لکھتا ہے کہ ؏

دیدہ ست مردے دریں قحط الرجال

یعنی اس زمانے میں جبکہ اعلیٰ درجہ کے افراد کا قحط ہے، میں نے آپ جیسا عظیم شخص دیکھا۔

علاّمہ مرحوم نے یہ بات اپنے اس خط میں کہی جو اسلم صاحب کے اسرارِ خودی پر تبصرے کے شکریہ میں علامہ نے اسلم صاحب کو لکھا تھا۔ یہ خط اقبال نامہ حصہ اوّل کے ص۵۲ تا ص۵۵ پر ہے۔ اسکی ابتداء یوں ہوتی ہے:

"لاہور ۱۷ مئی ۱۹۱۹ء

مخدومی اسلام علیکم

آپ کا تبصرہ اسرارِ خودی پر "الناظر" میں دیکھا جس کے لئے

مَیں آپ کا نہایت شکر گذار ہوں۔

دیدمت مردے دریں قحط الرجال"

اس خط کے اختتام پر علامہ لکھتے ہیں:

"مجھے امید ہے کہ اس طویل خط کے لئے آپ مجھے معاف فرمائیں گے آپ کے تبصرے سے مجھے بڑی تسکین ہوئی۔ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام۔ مخلص محمد اقبال"

یہ مولانا اسلم صاحب جن کے معترفین محمد علی جوہر و اقبال ہیں حضرت خواجہ احمد کی تحریروں سے استفادہ کرنے والوں میں پیش پیش ہیں۔ اپنی آپ بیتی میں جو "میری طالب علمی" کے نام سے انکے مجموعۂ مضامین "نوادرات" میں موجود ہے لکھتے ہیں کہ یتیم پوتے کی وراثت کے سلسلہ میں مَیں سوچا رہتا تھا بالآخر۔

"خواجہ احمد الدین صاحب امرتسری" کے رسائل سے جو انہوں نے اس مسئلہ پر لکھے تھے مجھے مزید دلائل مل گئے ۔۔۔ اس مسئلے کے علاوہ فنِ میراث کی تدوین میں بنیادی غلطیاں ہوگئی ہیں جن کو خواجہ احمد الدین صاحبؒ نے اپنے رسالہ معجزۂ قرآن میں تفصیل کے ساتھ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ میں نے انکو علمی شکل میں ترتیب دیکر عربی زبان میں "الوراثۃ فی الاسلام" کے نام سے شائع کیا"

(نوادرات ص۳۵۳ شائع کردہ اِدارۂ طلوع اسلام وابسن روڈ کراچی ۱۹۵۱ء)

یہی مولانا اسلم صاحب جو خواجہ صاحب کے علوم سے خوشہ چینی کا اعتراف کر رہے ہیں۔ "پیسہ" اخبار لاہور میں اپنی ملازمت کے دَوران ۱۹۰۴ء میں مولانا عبد اللہ چکڑالوی سے بھی ان کے مرکز مسجد سریانوالہ بازار میں جاکر ملے تھے۔ ان سے تین گھنٹہ بالمشافہ گفتگو رہی لیکن اس کے نتیجہ میں اسلم صاحب کا ان کے متعلق تبصرہ یہ ہے "مَیں نے دیکھا کہ وہ حقیقت آشنا نہیں ہیں" (نوادرات ص۳۶۵) ــــ اس کے برعکس

خواجہ صاحب کی تفسیر بیانُ للناس کے تیسرے اڈیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے
مولانا اسلم لکھتے ہیں:

مولانا احمدالدین صاحب ان لوگوں میں سے ہیں۔ جنہوں نے قرآن فہمی میں اپنی پوری زندگی صرف کی اور قرآن کو قرآن ہی سے سمجھتے رہے اب اُن کی یہ تفسیر شائع ہوئی ہے۔ جس کی پہلی جلد جو منزل اوّل پر مشتمل ہے ہمارے سامنے ہے وہ قرآن کے ایک ایک لفظ ایک ایک آیت اور ایک ایک مسئلہ کی تشریح شواہد فطریہ اور دلائل عقلیہ کی روشنی میں صرف قرآن ہی سے کرتے ہیں۔ یہ بہت ممکن ہے کہ ہم ان کی بعض تشریحوں سے متفق نہ ہوں۔ لیکن ان کے مسلک سے اختلاف کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ قرآن فہمی کا سوائے قرآن کے اور کوئی طریق ہی نہیں ہے۔

مولانائے موصوف اپنی مسئولیت اور ذمہ داری کا احساس رکھتے ہیں اس لئے جو مطلب سمجھتے ہیں۔ اس کو بلاخوف لومتہ لائم صاف صاف لکھ دیتے ہیں. مفہوم کے ہر پہلو پر ان کی نظر رہتی ہے اور سب کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس وجہ سے بیان میں طوالت ضرور ہوجاتی ہے مگر کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہنے پاتا ان کی نگاہ میں یہ حقیقت عریاں ہے کہ سوائے اللہ کے کوئی مستقل مطاع نہیں ہے اور رسول کے بشری رتبہ کو انہوں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ اس وجہ سے جہاں جہاں ان مباحث پر لکھا ہے وہ ان کا مخصوص حصہ ہے۔ اور غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ اُن کی یہ تفسیر مجتہدانہ شان رکھتی ہے۔ اور قرآنی تعلیمات کو قرآن ہی سے حل کرنے اور سمجھنے والوں کے لئے ایک نادر ذخیرہ ہے۔

(ماہنامہ بلاغ جون ۱۹۳۶ء)

جناب پرویز | پاکستان میں مولانا اسلم صاحب کے مشہور شاگرد چودھری غلام احمد پرویز صاحب ہیں، جو ادارۂ طلوع اسلام کے بانی اور ماہنامہ طلوع اسلام کے سرپرست ہیں۔ اللہ نے انہیں قلم کی صلاحیتیں خوب عنایت فرمائی ہیں۔ جنہیں وہ اپنے استاد محترم

کے انداز پر قرآنی افکار کی نشرو اشاعت میں پوری طرح صرف کرتے ہیں۔ پرویز صاحب کی کتاب "شاہکارِ رسالت" پڑھ کر ملک کے مشہور ادیب و خطیب و صحافی اور تحریک ختمِ نبوت کے جیالے لیڈر جناب شورش کاشمیری نے اپنے ہفت روزہ چٹان لاہور (۳۱ مئی ۱۹۷۴ء) میں پرویز صاحب کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا اور علماء سے مطالبہ کیا کہ وہ ان کے خلاف دیا ہوا فتویٰ واپس لیں۔ شورش صاحب کا پورا تبصرہ پڑھنے کے لائق ہے۔ جسے ہم جگہ کی تنگی کے باعث درج نہیں کر سکتے۔ اس تبصرے کو ماہنامہ طلوعِ اسلام (جون ۱۹۷۴ء) نے بھی اپنے ہاں نقل کیا تھا۔ ممکن ہے ان سے شائقین کو مل سکے۔

مولانا عبدالسلام ندوی

علامہ شبلی کے شاگردوں میں سید سلیمان ندوی کے بعد مولانا ہی کا مقام ہے۔ مختلف موضوعات پر ان کی متعدد کتابیں اور بے شمار علمی و ادبی مضامین دارالمصنفین اعظم گڑھ کی آبرو ہیں۔

خواجہ صاحب سے ان کا ایک تحریری مذاکرہ ہوا تھا۔ جسے ہم اس کتاب میں بھی شائع کر رہے ہیں۔ مولانا عبدالسلام صاحب کی سلامتیٔ طبع کا یہ روشن ثبوت ہے کہ اس مذاکرے کے بعد انہوں نے اپنے خیالات میں تبدیلی کر لی، جب کہ کسی صاحبِ علم کا اپنے سابقہ خیالات سے رجوع (وہ بھی برسرِ عام مذاکرے کے بعد) انتہائی مشکل چیز ہے اور بہت کم اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ گو ان کے اس تبدیل شدہ نقطۂ نظر کو خود ان کے ادارے دارالمصنفین کے ترجمان ماہنامہ معارف نے اپنے ہاں درج کرنے کی جرأت نہیں کی تاہم ان کی یہ تحریر ماہنامہ "ندیم" گیا (صوبہ بہار) میں شائع ہوئی، ہم وہیں سے اس کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

▪ عام طور پر راویوں نے روایت بالمعنیٰ کی ہے اور پیغمبرؐ کے اصلی الفاظ محفوظ رکھنے کی بہت کم کوشش کی گئی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم احادیث کے حروف و الفاظ سے کوئی قابلِ اعتماد مسئلہ مستنبط نہیں کر سکتے۔ فقہ اور اصولِ فقہ میں احادیث کے حروف و الفاظ سے جو مسائل مستنبط کئے گئے ہیں وہ قابلِ اعتماد اور واجب العمل نہیں ہیں۔ کیونکہ جب پیغمبرؐ

کے اصلی الفاظ محفوظ نہیں ہیں، تو راویوں کے حروف و الفاظ سے نتائج نکالنے کے کیا معنی ہیں؟" (ماہنامہ ندیم، گیا (بہار) اکتوبر ۱۹۳۸ء)

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

شاہ صاحب کی پیدائش اگرچہ عظیم آباد پٹنہ میں ہوئی لیکن ان کا لڑکپن اور جوانی امرتسر میں گذری، یہاں ان کے حلقۂ احباب میں ڈاکٹر تاثیر و صوفی تبسم جیسے حضرات تھے جن کا حضرت خواجہ سے تعلق آپ ہمارے اسی مضمون میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ حضرت خواجہ کے افکار سے دلچسپی میں مزید اضافہ ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور چوہدری افضل حق کے ذریعے ہوا جن سے شاہ صاحب کے روابط نہ صرف سیاسی تھے بلکہ محبانہ تھے۔ چودھری افضل حق مرحوم تو شاہ صاحب کی جماعت مجلس احرار کے بانی اور اس کی روح رواں بھی تھے۔ کچلو صاحب کی خواجہ صاحب سے ہم خیالی ہم پہلے بتا چکے ہیں اور چودھری صاحب کی شاگردی و ہم خیالی کا ذکر چند صفحات بعد آتا ہے۔ اس بنا پر شاہ صاحب، خواجہ صاحب کے خیالات سے نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ امت مسلمہ کے ابتدائی ممبروں میں بھی ڈاکٹر کچلو کے ساتھ ان کا نام نظر آتا ہے (ماہنامہ بلاغ امرتسر۔ اپریل مئی ۱۹۲۷ء صہ)۔ بعد میں جب شاہ صاحب اور ڈاکٹر کچلو عملی سیاست میں حصہ لینے لگے تو امت مسلمہ کے باقاعدہ ممبر نہیں رہے کیونکہ اس کی ممبری کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ عملی سیاست میں شریک احباب اسکے باقاعدہ ممبر نہیں رہ سکتے۔ لیکن ان حضرات کا فکری تاثر ہمیشہ قائم رہا، اس کے ثبوت کے طور پر شاہ صاحب کی تقاریر کے یہ اقتباسات ملاحظہ ہوں،

> "میرے لئے جو کچھ ہے قرآن مجید میں موجود ہے۔ اگر آج دنیا قرآن کو چھوڑ کر دوسری کتابوں پر نگاہ کر سکتی ہے تو میں دوسری کتابوں سے روگردانی کر کے صرف کتاب الٰہی پر اپنی توجہ کیوں نہ مرتکز کروں؟ میں تو قرآن کا مبلغ ہوں، میری باتوں میں اگر تاثیر ہے تو وہ صرف قرآن کی ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے اسی بات کو مؤکد کرنے کے لئے خواجہ غلام فریدؒ کا واقعہ سنایا کہ ایک جولاہا حضرت غلام فریدؒ کا مرید تھا وہ ہر سال حضرت

خواجہ صاحب کی خدمت میں ایک لنگی ہدیہ لایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک سال ناغہ کرنے کے بعد دوسرے سال دو لنگیاں ہدیہ لایا۔ حضرت نے گذشتہ سال غیر حاضری کا سبب پوچھا تو اس نے عرض کیا کہ گذشتہ سال لنگی مکمل نہ ہو سکی تھی اس لئے حاضر نہ ہو سکا۔ حضرت نے فوراً لنگیوں کو آگ لگوادی اور فرمایا :

جہڑی شئے یار کنوں نکھیڑے ۔۔۔ جو چیز یار سے جدا کرے
اونکو بھاہ لا ۔۔۔ اسے آگ لگا دو۔

اس قصے کو بیان کر کے حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ میں بھی یہی کہتا ہوں

جو چیز مجھے قرآن سے جدا کرے " اسے آگ لگا دو ے

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم
چوں غلام آفتابم، ہمہ ز آفتاب گویم

(ہفت روزہ چٹان لاہور کا سالنامہ ۱۹۶۲ء ص ۸۸ اور "حضرت امیر شریعت کے علمی و تقریری جواہر پارے" ص ۴۳، ۴۶ مرتبہ اعجاز احمد سنگھالوی۔ ناشر ادارۂ اشاعت اسلام کراچی)

شاہ صاحب نے ۱۹۴۵ء میں تقریر کرتے ہوئے کہا

"چالیس برس لوگوں کو قرآن سنایا۔ پہاڑوں کو سناتا تو عجب نہ تھا کہ ان کی سنگینی کے دل چھوٹ جاتے۔ غاروں سے ہمکلام ہوتا تو جھوم اٹھتے۔ چٹانوں کو جھنجھوڑتا تو چلنے لگتیں۔ سمندروں سے مخاطب ہوتا تو ہمیشہ کے لئے طوفان بلند ہو جاتے۔ درختوں کو پکارتا تو وہ دوڑنے لگتے۔ کنکریوں سے کہتا تو وہ لبیک کہہ اٹھتیں۔ صرصر سے گویا ہوتا تو وہ صبا ہو جاتی۔ دھرتی کو سناتا تو اسکے سینے میں بڑے بڑے شگاف پڑ جاتے۔ جنگل لہرانے لگتے۔ صحرا سرسبز ہو جاتے۔ مگر میں نے اُن لوگوں کو خطاب کیا، جن کی زمینیں بنجر ہو چکی ہیں۔

جن کے ہاں دل و دماغ کا قحط ہے۔ جن کے ضمیر عاجز آچکے ہیں۔ جو برف کی طرح ٹھنڈے ہیں۔ جن کی پستیاں انتہائی خطرناک ہیں جن میں ٹھہرنا المناک اور جن سے گذر جانا طربناک ہے۔ جن کے سب سے بڑے معبود کا نام طاقت ہے۔"

(چٹان سالنامہ ص ۱۸۔ علمی و تقریری جواہر پارے ص ۸۶)

حضرت شاہ صاحب اگرچہ اُردو زبان کے سب سے بڑے خطیب تھے، مگر ان کا زمانہ وہ تھا جب ٹیپ ریکارڈ کا رواج نہیں ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انکا خطیبانہ جلال و جمال محفوظ نہیں رہ سکا ورنہ ان کے خطابتی معرکے دسیوں مجلّدات میں بھی نہ سماتے اور ہم بھی اپنی تائید میں بے شمار اقتباسات پیش سکتے۔ آخر میں ایک واقعہ اور سُن لیں جو جناب غلام حیدر (ڈیرے وال۔ جامپور) کی روایت ہے کہ شاہ صاحب ایک مرتبہ جام پور میں تقریر کے لئے تشریف لائے تو میں نے ان سے حدیث کے متعلق ان کا نقطۂ نظر معلوم کیا تو فرمایا "تم نے مجھے اپنی تقریروں میں کبھی روایات بیان کرتے ہوئے سُنا ہے؟" میں نے عرض کیا نہیں تو فرمایا تمہارے سوال کا یہی جواب ہے۔

ڈاکٹر محمد دین تاثیر
پی۔ ایچ۔ ڈی۔ (کیمبرج)

اُردو کے مشہور ادیب و نقاد تاثیر کا خواجہ صاحب کے افکار سے پہلا رابطہ صوفی تبسم اور پروفیسر فیروز الدین رازی کے ذریعے ہوا۔ اس کے بعد خواجہ صاحب کے جانشین علامہ عرشی امرتسری سے جب ان کے روابط بڑھے تو پھر خیالات میں مکمل یکسانیت ہوگئی۔ کہا کرتے تھے۔ کہ نجات کا راستہ یہی ہے جدھر امتِ مسلمہ والے بلا رہے ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ جب تک ہمارے دلوں کی تاریک کوٹھڑیوں میں قرآن کی روشنی نہیں پہونچے گی ہم نہ انسان بن سکتے ہیں نہ مسلمان۔ ڈاکٹر تاثیر نے امتِ مسلمہ امرتسر کے تبلیغی مقاصد کے لئے ایک مستقل تصنیف کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا جو اُن کی مصروفیات کی وجہ سے پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ لیکن امتِ مسلمہ کے آرگن ماہنامہ البیان (امرتسر) کے براہینِ وحی نمبر (اپریل سنہ ۱۹۴۱ء) میں ان کا ایک مضمون ہماری نظر سے گذرا ہے جو وحی کی حقیقت پر ایک قابلِ قدر تحریر ہے۔ مودودی صاحب

نے اپنے تبصرہ میں اسکی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ڈاکٹر تاثیر صاحب کا مضمون باوجود مختصر ہونے کے بہت پر مغز اور مفید ہے (ادبیات مودودی مرتبہ خورشید احمد ص۳۲۵ شائع کردہ اسلامک پبلیکیشنز لاہور ۱۹۷۶ء)۔ اب ان کا یہ مضمون "مقالات تاثیر" شائع کردہ مجلس ترقیٔ ادب لاہور ۱۹۷۸ء کے ص ۲۵۲ پر موجود ہے۔ نیز اسی کتاب "مقالات تاثیر" کے ایک مقالہ کا عنوان ہے "اسماء الرجال اقبال" اس میں وہ اپنے دوست تبسم اور عرشی کا اس طرح تذکرہ کرتے ہیں۔

"شعر و سخن کا ذکر آیا تو صوفی تبسم کا نام لینا ضروری ہو گیا۔ ان کی (علامہ اقبال کے ہاں) آمد و رفت بکثرت تھی اور علامہ اقبال انہیں فارسی محاورے اور اردو زبان کا استاد بھی سمجھتے تھے اور سندات کے سلسلہ میں انہیں کئی ارشادات کئے کرتے تھے علامہ اقبال زبان کی صحت اور الفاظ کی موزونیت اور محاورے کی درستگی کے اس حد تک سخت قائل تھے کہ اس سے بیان اور ابلاغ میں آسانی پیدا ہو۔ صوفی تبسم ان چند دست دراز لوگوں میں سے تھے جو ڈاکٹر صاحب کے حُقّے پر ہاتھ ڈالدیا کرتے تھے۔ صوفی صاحب کے امرتسری احباب میں سے عرشی صاحب امرتسری کا نام بالخصوص قابلِ ذکر ہے۔ عرشی صاحب نے ایک نظم اقبال کے نام لکھی اور اس سے ان کا دل دہل گیا۔ بہت متاثر ہوئے۔ اور جواب لکھا۔ عرشی نے کہا تھا کہ اقبال اس دور ابتلا میں کیوں خاموش ہے؟ اس کے بعد علوم قرآنی کے متعلق عرشی صاحب سے بہت سی ملاقاتیں ہوئیں" (ص۱۰۶)

حضرت خواجہ احمدؒ کے شاگرد اور معتقدین

چودھری افضل حق مفکر احرار چودھری افضل حق برصغیر کی مشہور عوامی تحریک "مجلس احرارِ اسلام" کے بانی اور تحریک کا دماغ تھے۔ ان کی کئی کتابیں اور مجموعہ ہائے مضامین اپنی معنوی اور ادبی خوبیوں کی بنا پر شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار

میں جگہ حاصل کر چکی ہیں۔

چودھری صاحب امرتسر کے اسلامیہ ہائی اسکول میں خواجہ صاحب کے شاگرد رہے لیکن بچپن کی وجہ سے حضرت خواجہ کی انفرادیت کو نہ پا سکے۔ عرصہ دراز کے بعد خواجہ صاحب کی عظمت کا انہیں احساس ہوا۔ اور ان کے خیالات سے مستفید ہوئے چودھری صاحب نے اپنی یہ سرگذشت خود ایک مضمون بعنوان "تصوف" میں بیان کی ہے جو ماہنامہ البیان امرتسر کی اشاعت اگست ۱۹۴۵ء کے ص ۴۷ پر شائع ہوا۔

ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ پی ایچ ڈی

شیخ صاحب کا علمی مقام بتانے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے علم و فضل اور تحقیقی مقالات کی وجہ سے علمی حلقوں میں اچھی طرح متعارف ہیں۔ غالباً ان کی علمی حیثیت سمجھنے کے لئے اتنا کافی ہوگا کہ وہ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے قابل فخر مقالہ نگاروں میں سے ایک ہیں۔

شیخ صاحب بھی چودھری افضل حق کی طرح خواجہ صاحب کے اسلامیہ اسکول کے شاگردوں میں سے ہیں۔ حضرت خواجہ کی وفات پر اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"میں خواجہ صاحب کو اس وقت سے جانتا ہوں جبکہ وہ ایم اے او ہائی سکول امرتسر میں مدرس تھے۔ اور میں سکول مذکور کی درمیانی جماعتوں میں پڑھتا تھا میں ان دنوں انہیں صرف ایک حلیم الطبع اور مشفق استاد کی حیثیت سے جانتا تھا مگر جب میرا دائرۂ معلومات وسیع ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک بہت بڑے عالم دین اور مفسر قرآن ہیں۔ ان کی ساری عمر تدبر فی القرآن اور مسائل دین کی تحقیق میں گذری ہے۔ ان کی علمی و دینی سعی کا خاص امتیاز یہ تھا کہ انہوں نے قرآن کے مفہوم کو مشتبہ روایات کی مدد سے سمجھنے کی بجائے خود قرآن کی اپنی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی اور عجائب پرستی اور توہمات سے آزاد ہو کر قرآن کو عقلی اور فطری انداز میں سمجھا اور سمجھایا۔۔۔۔

اگرچہ اب وہ اپنے مداحوں کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ گئے ہیں مگر اپنے وسیع علم و حلم تدبر فی القرآن، اشتغال بالدین، تبتل الی اللہ، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اخلاص و مروت، غرض تمام اخلاق حسنہ کی ایک روشن مثال چھوڑ گئے ہیں جو دوسروں

کے لئے ہمیشہ مشعل ہدایت کا کام دے گی۔"

(ماہنامہ بلاغ کا سوانح خواجہ نمبر۔ ستمبر ۱۹۳۶ء ص ۷۹)

خواجہ عباداللہ اختر

اختر صاحب ملک کے مشہور مصنف و محقق ہیں۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کے رکن بھی تھے۔ اس لئے اس ادارہ نے بھی ان کی اردو اور انگریزی میں کئی کتابیں شائع کی ہیں، یہ امرتسر کے رہنے والے تھے اور حضرت خواجہ احمد کے معتقدین میں سے تھے۔ حضرت خواجہ کی تفسیر کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"حضرت خواجہ کی صحبت سے جو اصحاب ہر وقت مستفید ہوتے رہے جانتے ہیں کہ حضرت خواجہ باتوں باتوں میں وہ نکات معرفت بیان کر جاتے کہ بڑے بڑے مولوی جن کو ادعائے علم و فضل تھا۔ مبہوت رہ جاتے۔ تقریر ایسی مفصل اور مدلل ہوتی کہ حیرت ہوتی کہ حضرت خواجہ کی زبان پر برمحل آیات قرآنی کس روانی کے ساتھ جاری ہیں۔ اور اسکے ساتھ حضرت خواجہ کی یہ کوشش ہوتی کہ آیات قرآنی کو بطور عقلی دلائل پیش کیا جائے تاکہ مخاطب دہریہ ہی کیوں نہ ہو۔ قرآن عظیم کے آگے جھک جائے، ناممکن تھا کہ جو شخص محض بغرض تحقیق آتا وہ متاثر ہوئے بغیر رہتا۔ مگر جو بات تقریر میں تھی اس کا عشر عشیر بھی تحریر میں نہیں پایا جاتا۔ اس کے باوجود جس پایہ کی ان کی مدلل تحریر ہے۔ وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں۔ مسئلہ وراثت پر معجزۂ قرآن اور دیگر تحریریں اہل علم سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ لاجواب ہیں۔" (بلاغ امرتسر نومبر ۱۹۳۶ء)

خواجہ صاحب کی وفات پر ایک تحریر میں لکھتے ہیں :

"حضرت خواجہ احمد الدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان باکمال اشخاص میں سے ایک تھے جن کی نسبت حکیم سنائی کا ارشاد ہے کہ :-

دورہا باید کہ تا یک مردِ صاحب دل شود
بایزید اندر خراساں، یا اُویس اندر قرن

اب دل کہاں اور دماغ کہاں جو خدا تعالیٰ نے حضرت خواجہ صاحب مرحوم کو عطا فرمایا تھا۔ اُن کے قلبِ سلیم پر جو آسمان سے نازل ہوتا تھا وہ کس کو نصیب ہے؟ وہ اپنی نظیر آپ تھے...... حضرت خواجہ نے حکیم حاذق کی طرح فرقہ بندی اور تفرقہ پردازی کے مرض کی صحیح تشخیص کر لی تھی اور نسخہ بھی صحیح تجویز کیا کہ مسلمانوں کی تمام تر توجہ قرآن عظیم کی طرف مبذول ہونی چاہیئے اور اسی پر عمل پیرا ہونے سے فرقہ بندی کی لعنت سے نجات مل سکتی ہے اور جب کبھی مسلمانوں کا اتحاد ہوگا تو اسی حبل اللہ کی بنیاد پر ہوگا......

ذاتی زندگی میں حضرت خواجہ صاحب کی سادگی حد سے تجاوز کر گئی تھی۔ احباب اور معتقدین کے درمیان بھی وہ صدرِ محفل بن کر کبھی نہیں بیٹھے۔ انکسار طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اخلاق حسنہ کا مجسمہ تھے۔ وہ اپنے خیالات کو تحکّم اور تحدی سے منوانا نہیں چاہتے تھے۔ شوریٰ کے دلدادہ تھے۔ اگرچہ ان کی رائے کے ساتھ اکثر سب کا اتفاق ہوتا لیکن کبھی اسے اپنی ذات سے منسوب نہ کرتے۔ یہی فرماتے کہ دوستوں کے تدبر و تفکّر سے یہ رائے صحیح معلوم ہوتی ہے۔ حضرت خواجہ کی کن کن خوبیوں کو گنوایا جائے سچ تو یہ ہے کہ انہیں مل کر عہد صحابہ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی"۔

(بلاغ سوانح خواجہ نمبر ص ۸۵، ۸۶ ستمبر ۱۹۳۶ء)

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم | اُردو کے مشہور شاعر صوفی تبسم بھی خواجہ صاحب کے اسکولی شاگردوں میں سے ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں جب حضرت خواجہ احمد کے چند معتقدین (میاں مولا بخش صابون گر، حکیم شہاب الدین صاحب اور علامہ محمد حسین عرشی) نے قرآنی افکار کی نشر و اشاعت کے لئے ایک ماہنامہ "بلاغ" کے نام سے جاری کیا اور ۱۹۲۹ء میں ایک منظم جماعت "امتِ مسلمہ" کے نام سے

قائم کی تو اس تنظیم کے اولین صدر ڈاکٹر برکت علی قریشی صاحب پی ایچ ڈی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور اور جنرل سکریٹری صوفی صاحب تھے جیسا کہ ماہنامہ بلاغ (فروری ۱۹۳۰ء) سے واضح ہے۔

اس تنظیم کی طرف سے ۱۹ - ۲۰ مارچ ۱۹۳۰ء کو ایک کانفرنس منعقد کی گئی جس میں بہت سی نمایاں شخصیات نے شرکت کی۔ ۳۲ صفحوں میں اس کی روداد بھی جنرل سکریٹری (صوفی تبسم) کے قلم سے شائع ہوئی جو وزیر ہند پریس امرتسر کی مطبوعہ ہے۔ اس تنظیم کے قیام سے کچھ عرصہ قبل علامہ اقبال اور حضرت خواجہ احمد کی ملاقات کا انتظام بھی صوفی صاحب نے ہی کیا تھا۔ اور اس ملاقات میں وہ حضرت خواجہ کے ہم سفر تھے۔ اس کی سرگزشت صوفی صاحب نے پہلے بلاغ کے حضرت خواجہ نمبر (ستمبر ۱۹۳۶ء) کے لئے لکھی، پھر ۱۹۳۸ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کے مجلہ "راوی" میں شائع کی جسے ہم اقبال ریویو کے حوالے سے اس کتاب میں بھی پیش کر رہے ہیں۔

(ملاحظہ ہو ضمیمہ ۲)

حضرت خواجہ احمد کی تفسیر بیانٌ للناس کے دوسرے اڈیشن میں صوفی صاحب کے قلم سے ایک دیباچہ بھی ہے جس میں اس تفسیر کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔

خواجہ سخاء اللہ صاحب یہ حضرت خواجہ صاحب کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ اور اپنے والد کے علمی کمالات کے ایک حد تک وارث۔ اسکول اور کالج کی پوری زندگی میں اپنی کلاس میں سب سے نمایاں رہے۔ اور ایم اے عربی میں پورے پنجاب میں ٹاپ کیا (یاد رہے یہ ۱۹۳۱ء کی بات ہے جب کہ مشرقی و مغربی پنجاب متحد تھے۔ اور پنجاب کی حدود بڑی وسیع تھیں) اس کامیابی کے نتیجے میں ایف ایس جمال الدین میڈل اور خلیفہ محمد حسن ایچسن میڈل حاصل کئے۔ پھر چونکہ آپ تمام یونیورسٹی کے سنسکرت کے طلبہ میں بھی فسٹ رہے تھے اس لئے میکلوڈ میڈل اینڈ پرس کے بطور انعام مستحق ہوئے۔

حصول تعلیم کے بعد سخاء اللہ صاحب مختلف کالجوں میں لیکچرار رہے۔ بالآخر اسلامیہ کالج پشاور کے پرنسپل متعین ہوئے اور اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

مختلف عنوانات پر ان کے مضامین ماہنامہ 'بلاغ'، 'البیان' امرتسر میں شائع ہوتے رہے ہیں جن میں سے مولانا ثناء اللہ پر ان کی تنقید بعنوان "تفسیر بالرأی" بہترین مضمون تھا۔ اسی طرح سید سلیمان ندوی صاحب کے مضمون "ملکۂ نبوت" پر تبصرہ کرتے ہوئے سخاء اللہ صاحب نے بھرپور ذہانت کے ساتھ علمی گرفتیں کیں۔

اپنے والد حضرت خواجہ صاحب کے فن وراثت پر کتابچہ "معجزۃ القرآن" کی (جو نہایت مشکل علمی کتاب ہے) انہوں نے تلخیص بھی کی تھی۔ اور اسی کتاب کے ایک عنوان "یتیم پوتے کی وراثت" کو علیحدہ ایک رسالہ کی شکل میں نئے انداز میں مرتب کیا تھا۔

خواجہ سخاء اللہ صاحب نے تقسیم پاکستان کے بعد لاہور میں وفات پائی۔

ماہنامہ "بلاغ" امرتسر کے بانی حکیم شہاب الدین صاحب

حکیم صاحب کی خواجہ صاحب سے دلچسپی جس واقعہ کے بعد پیدا ہوئی اسے حکیم صاحب کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر طالب علی صاحب کی زبانی سنئے، ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں:

"خواجہ صاحب علیہ الرحمہ کا اوّل اوّل نیاز مجھے ۱۸۹۰ء میں ہوا تھا جب کہ میں اسلامیہ ہائی سکول امرتسر کی پانچویں جماعت میں داخل ہوا۔ نومبر ۱۸۹۰ء کا مہینہ تھا۔ پڑھائی قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ مجھے صرف انگریزی پڑھنی تھی۔ کیونکہ باقی مضامین میں، میں اپنے گاؤں کے سکول میں پاس ہو چکا تھا۔ اب مجھے تلاش تھی کہ کوئی استاد ملے تو اس سے کمی کو پورا کروں۔ مجھے ایک ہم جماعت نے بتایا کہ خواجہ احمد الدین صاحب جو اسی سکول میں مدرس ہیں۔ ایسا ایثار کیا کرتے ہیں۔ اور کئی طالب علموں کو رات کے وقت پڑھایا کرتے ہیں۔ میں بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اپنی درخواست پیش کی۔ فرمایا آجایا کرو۔ میں تین ماہ تک پڑھتا رہا۔ رات کے بارہ ایک بج جاتے تھے۔ اور وہ نہایت شفقت۔ محنت اور محبت سے پڑھایا کرتے تھے۔ یہ سب محنت بلا کسی معاوضے کے تھی" (سوانح خواجہ نمبر حصۂ اوّل ص ۹۰، ۹۱)۔ اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ یہ طرزِ عمل دیکھ کر حکیم شہاب الدین صاحب کے دل پر بڑا اثر ہوا، اور انہوں نے

خواجہ صاحب کے افکار سے دلچسپی لینی شروع کی، بالآخر نوبت یہانتک پہونچی کہ وہ قرآنی افکار کی نشر و اشاعت کے لئے اپنے مولد و وطن موضع جگدیو کلاں کو خیر باد کہہ کے مستقلاً امرتسر تشریف لے آئے اور ۱۹۲۴ء میں وہاں سے ماہنامہ "بلاغ" جاری کیا جو خواجہ صاحب اور ان کے ہم خیال رفقاء کے مضامین کو اپنے دامن میں لئے شائع ہوا کرتا تھا۔ حضرت خواجہ احمدؒ کے متعلق جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں کہ وہ نہایت منکسر المزاج اور شہرت و اشاعت سے بے نیاز قسم کے انسان تھے اس لئے ان کے ہم خیال احباب معدودے چند تھے اور بہت کم لوگ ان کے افکار سے واقف تھے۔ ان کے معنوی شاگردوں (مولانا عبداللہ چکڑالوی اور مولانا اسلم جیراج پوری) کی شہرت ان سے کہیں زیادہ تھی یہ صرف حکیم شہاب الدین صاحب کی کوشش اور خدمات ہیں۔ جن کے نتیجے میں حضرت خواجہ کا حلقۂ تعارف وسیع ہوا۔ اور بعد میں حکیم شہاب الدین ہی کی طرح کے ایک اور شاگرد (علامہ عرشی) کے میسر آنے کے نتیجے میں امتِ مسلمہ کے نام سے باقاعدہ ایک تنظیم قائم ہوئی جس نے خواجہ صاحب کو ملک گیر شہرت عطا کر دی۔

حکیم صاحب قریشی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے جدِ اعلیٰ مولانا محمد شریفؒ نے سکھوں کے عہد سے پہلے پنجاب کو اپنا مسکن بنایا۔ آپ کا مزار اب تک مرجع انام ہے۔ آپ کے دو بیٹے تھے۔ ایک ہاشم شاہ جو پنجابی زبان کے مشہور شاعر ہیں۔ دوسرے رحمۃ اللہ شاہ انہیں کی چوتھی پشت میں حکیم شہاب الدین ہیں حکیم صاحب نے قرآن کی خدمت کے لئے اپنا تن من دھن نچھاور کر دیا تھا۔ اور اپنی طبابت، اپنی ملازمت اور اپنا خاندان سب کچھ اس پر قربان کر دیا ان کی اسی قربانی کے نتیجے میں ان کے لگائے ہوئے پودے ماہنامہ "بلاغ" نے وہ شہرت حاصل کی کہ علامہ اقبال و علامہ مشرقی جیسی عظیم شخصیات اس کی باقاعدہ خریدار بنیں۔ اور اس سے متاثر ہوئیں۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

علامہ محمد حسین عرشی حضرت خواجہ احمدؒ کے جانشین اور امت مسلمہ امرتسر کے روحِ رواں حضرت عرشی ان قدیم علماء کا نمونہ ہیں جو جامع الصفات بھی ہوتے تھے اور عالمِ باعمل بھی بقول حضرت احمد ندیم قاسمی ان کے

روز و شب دیکھ کر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ آج سے دو تین ہزار سال پہلے پیدا ہوتے تو دیوتا مانے جاتے۔ عرشی صاحب کی فارسی شاعری کا یہ عالم ہے کہ ایران کے ایک صاحبِ علم ادیب و محقق جناب محمد حسین تسبیحی نے ان کا فارسی کلام "نقشہائے رنگ رنگ" کے نام سے خود اپنی رقم سے چھپوایا۔ اور ان کے متعلق تہران کے روزنامہ فردا میں تعارفی مضمون شائع کرایا۔

کرنل خواجہ عبدالرشید ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ اگر میں ان کے متعلق یہ کہوں کہ یہ درجۂ ولایت پہ فائز ہیں تو اس میں ہرگز مبالغہ نہیں ہوگا۔ دیباچہ پر نقشہائے رنگ رنگ ص۱۸) اور شارح کلام اقبال جناب پروفیسر عبدالرشید فاضل صاحب (سابق صدر شعبۂ اردو، فارسی اردو کالج کراچی) تحریر فرماتے ہیں:

"مولانا سے تعلق کا شرف حاصل ہوئے تقریباً پچیس سال ہو گئے یہ ملاقات کراچی میں اتفاقیہ طور پر ہوگئی تھی۔ مگر اس اتفاقیہ اور بالکل سرسری ملاقات نے میرے دل پر مولانا کے علم و فضل اور دینداری کے ایسے نقوش چھوڑے کہ سلسلۂ ملاقات برابر جاری رہا... ہر شخص میں کچھ فطری خصائص ایسے ہوتے ہیں جن پہ اس کو اختیار نہیں ہوتا۔ مجھ میں بھی ایک فطری خاصہ یہ ہے کہ جس کے پاس علم کے ساتھ ساتھ دین کی دولت بھی دیکھتا ہوں اس کا گرویدہ ہو جاتا ہوں۔ اگرچہ اس کو اپنی بدنصیبی کہوں یا خوش نصیبی کہ یہ گرویدگی کئی بار انتہائی مایوسی سے بدل چکی ہے جب بعض کا علم سطحی پایا اور بعض کی دینداری سراسر فریب ثابت ہوئی اور بعض میں دونوں چیزوں کا فقدان دیکھنے میں آیا مگر مولانا عرشی سے تعلق قائم ہوئے اس طویل عرصے میں جتنا انہیں قریب سے دیکھا اتنا ہی ان کو علم و فضل میں پہلے سے زیادہ کامل اور دینداری میں استوار سے استوار تر پایا... یہ بات کہ یک من علم را دہ من عقل باید کبھی بچپن میں سنی تھی۔ مگر اس کا مطلب

لہ علامہ عرشی کے اردو مجموعہ کلام "رسوا کیا مجھے" پر ندیم صاحب کے تاثرات ص۱۹

مولانا عرشی کو دیکھنے کے بعد سمجھ میں آیا کہ معمولی معمولی باتوں پر ایسی مدلل گفتگو کہ بیساختہ اَحْسَنْتَ و مَرْحَبَا زبان پر آگیا۔ بحث و مناظرے میں نہیں کہ یہ باتیں مولانا سے دور کی نسبت بھی نہیں رکھتیں بلکہ جب کبھی کچھ اہل علم جمع ہو گئے اور کسی موضوع پر گفتگو چھڑ گئی تو ایسا معلوم ہوا جیسے خاموش سمندر میں تلاطم آگیا ہے۔ مولانا کی گفتگو سے جہاں اُن کے علم و فضل کا پتہ چلا وہاں یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ حقیقی عالم وہ ہے جس کا علم اس کی کتابوں میں نہیں اسکے دماغ میں محفوظ و مستحضر ہو کہ ہر بات کے لئے دلائل کے حوالے نوکِ زبان ہیں کہ کسی کو انکار کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ پھر نہ وہ علمی استکبار جو اکثر مولویوں میں پایا جاتا ہے کہ جہاں کسی نے ان کی رائے سے اختلاف کیا راندۂ درگاہ ہوگیا۔ اور نہ وہ رسمی انکسار کہ دل میں زعمِ ہمہ دانی اور زبان پہ کلماتِ عجز و انکسار۔ بلکہ اپنی واقعی غلطی کا فراخدلی سے اعتراف اور ہر ملنے والے سے اس انداز میں گفتگو جیسے اس سے کچھ معلومات حاصل کر رہے ہیں پھر عربی اور دینی علوم سے گذر کر آپ کی اُردو اور فارسی کو دیکھئے تو ان دونوں زبانوں میں بھی محققانہ دستگاہ کے مالک۔ دونوں زبانوں میں شعر کہہ کر شاعری کا حق ادا کیا ہے اور ان کے ادب شعر اور عروض و قواعد پر بڑے تحقیقی مقالات بھی لکھے ہیں۔ یہ مضامین و مقالات اخبارات و رسائل میں شائع ہو کر اہلِ فن سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں" (عرشی صاحب کے اُردو کلام "رسوا کیا مجھے" پر فاضل صاحب کا دیباچہ۔ ناشر ادارہ تنویرات علم و ادب ۵۰۵ پیر الٰہی بخش کالونی کراچی ۵ ص ۳۲-۳۳)

عرشی صاحب اپنے کلام کے ذریعے اپنے جواں سال معاصرین پر کس طرح اثر انداز ہوئے اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ اختر شیرانی نے اپنی محبوبہ کے لئے "سلمی"

کا لقب مولانا ہی کے کلام سے اخذ کیا تھا اور بقول عرشی صاحب خود انہوں نے ان سے اس کا اعتراف کیا تھا (ص۱۲) بقول جناب احمد ندیم قاسمی " میں علامہ عرشی کو علم و ادب کے ان زعماء میں شمار کرتا ہوں۔ جنہیں ان کی دیگر مصروفیات نے شاعری کی طرف کما حقہ متوجہ نہ ہونے دیا ورنہ اگر وہ صرف شاعری کو اپنی توجہ کا مرکز بناتے تو ہماری تاریخ ادبیات اپنی مروجہ صورت سے بہت مختلف ہوتی۔ ان اکابر میں مولانا محمد علی جوہر آغا حشر کاشمیری اور علامہ عرشی شامل ہیں" (ص۲)

علامہ عرشی نے عربی و فارسی صرف و نحو، بلاغت اور عروض حکیم الشعراء مولانا فیروز طغرائی (مدیر وکیل و تہذیب الاخلاق امرتسر) سے حاصل کی۔ طب اور منطق حکیم زاہد علی اکبر آبادی سے پڑھی جو نجف (عراق) کے سند یافتہ تھے۔ ادب عربی میں علامہ محمد عالم آسی امرتسری سے استفادہ کیا جو اپنے فن میں یکتا تھے۔ اور عرشی صاحب کے تایا زاد بھائی حکیم معراج الدین صاحب کے جریدے "الفقیہ" امرتسر کے روح رواں تھے۔ ہندی زبان مہاشہ ہری چند سے سیکھی اور تحقیق تصوف کے سلسلہ میں دیوں حضرات سے (حتیٰ کہ ہندو جوگیوں سے بھی) استفادہ کرنے کے بعد آخر میں حضرت مولانا حسین علی نقشبندی مجددی کے ذریعہ (جنکو دارالعلوم دیوبند کے اولین طلبا میں شامل ہونے کا شرف حاصل تھا۔ اور جن کی تفسیر بلغۃ الحیران اپنے انداز کی ایک منفرد تفسیر ہے) سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں بیعت ہوئے۔ خود عرشی صاحب فرماتے ہیں "اس سلسلہ میں داخل ہونے کے بعد سے مجھے بڑی طمانیت حاصل ہوئی ہے"۔ (ص۲۶) اپنے شیخ کی مدح میں عرشی صاحب کی "گنجینۂ اسرار حق" کے نام سے فارسی مجموعہ میں ایک نظم بھی موجود ہے۔

لیکن علامہ عرشی پر جس شخصیت کا سب سے زیادہ گہرا اثر ہے وہ ان کے استاد تفسیر حضرت خواجہ احمدؒ ہیں۔ عرشی صاحب کی ان سے وابستگی اور ربط کا اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ حضرت خواجہ کے انتقال کے بعد انہیں کو ان کا جانشین متعین کیا گیا اور یہ حقیقت ہے کہ خواجہ صاحب کے افکار کو پھیلانے۔ ان کے رفقاء معتقدین کو "امتِ مسلمہ" کے نام سے منظم کرنے اور

برصغیر کے سنجیدہ وثقہ علمی حلقوں میں اس کے لئے احترام کی فضا پیدا کرنے میں عرشی صاحب کی خدمات تمام حضرات سے زیادہ ہیں۔ علامہ اقبال سے عرشی صاحب کے جو روابط تھے ان کا کچھ اندازہ مکاتیب اقبال میں ان کے نام علامہ کے خطوط سے اور عرشی صاحب کے مضمون " علامہ اقبال و خواجہ احمد الدین" سے ہو سکتا ہے (یہ مضمون مجلہ اقبال ریویو کے شکریہ کے ساتھ ہم اس کتاب میں بھی شائع کر رہے ہیں) [لہ]

عرشی صاحب اللہ کے فضل سے حیات ہیں، اور اس مضمون میں جہاں کہیں حوالہ نہیں دیا گیا اس کا ماخذ عرشی صاحب ہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں بصحت و عافیت سلامت رکھے اور ان سے اپنے دین کی خدمت لیتا رہے۔

خواجہ عبدالحفیظ امرتسری خواجہ صاحب سیلف میڈ قسم کے شخص ہیں، اُمت مسلمہ امرتسر کے بالکل ابتدائی دور سے اس کے ساتھ منسلک ہیں۔ امتِ مسلمہ کی پہلی کانفرنس کے منتظم، دفتر امت مسلمہ کے ہمہ وقتی ناظم، بلکہ ایک طویل زمانہ تک رسالہ بلاغ والبیان کے کاتب بھی رہے ہیں۔ یہ سارے کام وہ اپنے دینی جذبہ کے تحت کرتے رہے ہیں اور تقسیم سے قبل تک اسی طرح مصروف رہے۔

اب پاکستان بننے کے بعد جب وہ تنظیم نہ رہی تب بھی ان کا یہ قرآنی ذوق برقرار رہے۔ اسی کے تحت پہلے "قرآن سے قرآن تک" نامی کتاب آپ ہی نے شائع کی۔ اور اب اس کتاب (برھان القرآن) کی اشاعت کیلئے بھی رقم آپ نے اور آپ کے برادران خواجہ وحید صاحب اور خواجہ سعید صاحب نے مہیا فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ حفیظ صاحب اور ان کے تربیت یافتہ بھائیوں کو دینی و دنیاوی کامیابیاں نصیب فرمائے اور اپنے دین کی خدمت لیتا رہے۔

لہ عرشی و اقبال کے باہمی روابط کے لئے ڈاکٹر محمد دین تاثیر کا مضمون "اسماء الرجال اقبال" بھی ملاحظہ کر لیا جائے جو مجموعہ مقالات تاثیر میں شائع ہو گیا ہے اور اس کا ایک اقتباس ہم نے بھی ڈاکٹر تاثیر کے متعلق اپنے مضمون میں دیدیا ہے۔ اس کے علاوہ عرشی صاحب کے زیر ادارت شائع ہونے والے ماہنامہ فیض الاسلام راولپنڈی کے اقبال نمبر (جنوری ۱۹۷۸ء) میں اس سلسلہ کی بہت سی معلومات موجود ہیں۔

(ضمیمۂ اوّل امام اعظمؒ اور حدیث)

۔ امام بخاری کے معاصر مشہور محدّث و مؤرخ علامہ ابن قتیبہ دِینوری اپنی کتاب "تاویل مختلف الحدیث" (مطبوعہ مکتبۃ الکلیات الأزہریہ میدان الازہر قاہرہ ۱۹۶۶ء) کے ص۵۲ پر امام ابوحنیفہ کے حدیث کے متعلق خیالات کا مشہور مجتہد امام اوزاعی کے حوالے سے (جو امام ابوحنیفہ کے ہمعصر تھے) ان الفاظ میں تذکرہ کرتے ہیں:

وکان الاوزاعی یقول: انالا ننقم علی ابی حنیفة أنه رأی، کلنا یری، ولکننا ننقم علیه أنه یجیئه الحدیث عن النبی صلی علیه وسلم فیخالفه الی غیره۔

امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ یہ ہم پر الزام ہے کہ ہم ابوحنیفہ سے ان کے اجتہادات کی وجہ سے ناراض رہتے ہیں، بات یہ نہیں کیونکہ اجتہاد تو ہم سب ہی کرتے ہیں ہماری ابوحنیفہ سے ناراضگی کی اصل وجہ یہ ہے کہ جب ان کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث آتی ہے تو وہ اسے تسلیم نہیں کرتے اور اسکے خلاف فیصلہ دے دیتے ہیں۔

حدیث کے متعلق امام صاحب کے اسی نقطۂ نظر کی وجہ سے محدثین کو ان سے انتہائی سخت عداوت تھی۔ اسکا کچھ اندازہ لگانے کے لئے آپ امام بخاری کی "التاریخ الصغیر" مطبوعہ مکتبہ اثریہ سانگلاہل جامع اہلحدیث ضلع شیخوپورہ کی مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ فرمائیے۔

حدثنا نعیم بن حماد قال حدثنا الفزاری قال کنت عند سفیان فنعی النعمان فقال الحمد للّٰہ کان ینقض الاسلام عروة عروة ما وُلِدَ فی الاسلام اشأم منه

نُعیم بن حماد کہتے ہیں کہ مجھ سے فزاری نے بیان کیا کہ میں سفیان (بن عینیہ) کے پاس تھا کہ نعمان (بن ثابت ابوحنیفہ کوفی) کی وفات کی اطلاع ملی تو سفیان نے فرمایا "الحمد للہ" (اچھا ہوا کہ مر گیا کیوں کہ) وہ اسلام کے ایک ایک ستون کو توڑا کرتا تھا۔ اسلام میں آج تک اتنا بدبخت انسان پیدا نہیں ہوا تھا۔

(التاریخ الصغیر مؤلفہ امام بخاری ص۱۷۱ ذکر ۱۵۱ھ النعمان بن ثابت الکوفی)

امام بخاری نے امام ابوحنیفہ کے تذکرہ میں یہ روایت دے کر اور اسکی تردید نہ کر کے امام ابوحنیفہ کے متعلق اپنا نقطۂ نظر بھی واضح کر دیا ہے۔ یہ دو اقتباسات ہم نے بطور مثال پیش کئے ہیں ورنہ امام ابوحنیفہ کے خلاف محدثین کے بے شمار اقوال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اور سب میں ان پر یہی اعتراض ہے کہ وہ حدیث کو اہمیت نہیں دیتے۔ تفصیلات کے لئے اسماء الرجال کی کتب ملاحظہ ہوں خصوصاً امام خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد جس میں انہوں نے امام ابوحنیفہ کے مؤیدین ومخالفین سب کے اقوال سند کے ساتھ جمع کر دیئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ امام اعظم کے خلاف صرف امام بخاری نے ہی اپنی کتابوں میں جتنا کچھ لکھا ہے

(بقیہ حاشیہ) اس کو اگر جمع کر دیا جائے تو ایک مختصر سا رسالہ تیار ہو سکتا ہے۔

ے امام اعظم کے اس اصول استحسان پر تنقید کرتے ہوئے امام شافعی نے (جو کٹر روایت پرست ہیں) اپنی کتاب الاُمّ (مطبوعہ مصر) میں لکھا ہے کہ اس اصول کو ماننے والا در اصل احادیث رسول اللہ کے مقابلہ میں ایک نئی شریعت گھڑتا ہے۔ (حدیث کے متعلق امام اعظم کے نقطۂ نظر کو ہم نے ان کے زمانے سے قریب ترین حضرات محدثین (امام شافعی، امام بخاری، علامہ ابن قتیبہ) کی کتابوں سے پیش کیا ہے تاکہ یہ نہ کہا جا سکے کہ یہ مستند بات نہیں ہے۔ اسکے برعکس آج کے حنفی حضرات کا روایت پرستی میں غلو کا یہ عالم ہے کہ اہلحدیث بھی ان سے چند قدم پیچھے ہی ہیں ان غالی حنفی حضرات نے بھی اپنی تائید میں کچھ روایات گھڑ رکھی ہیں لیکن ان محدثین کی اصل کتابوں سے ہم نے جو اقتباسات پیش کئے ہیں ان کے سامنے وہ بھی دم بخود ہو جاتے ہیں کیونکہ اگر یہ کہیں کہ ان محدثین نے یہ غلط بیانی کی ہے تو ظاہر ہے پھر ان کی بیان کردہ باقی روایات کی حیثیت بھی گر جاتی ہے اور اسطرح روایت پرستی کا پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے اور اگر ان محدثین کی بات کو تسلیم کر لیں کہ واقعی امام اعظم حدیث کے متعلق یہ نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ تو پھر ان کا تقلیدی محل خود اپنے امام کے حوالے سے زمین بوس ہو جاتا ہے ؎ غرض دو گونہ عذاب است جان مجنوں را

حالانکہ اس دو گونہ عذاب سے بچنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ امام اعظمؒ کے نام لیوا، ان کی طرح مشعلِ قرآن کے علمبردار بن جائیں اور اپنی سابقہ عظمتوں کو حاصل کر لیں۔

حیاتِ اقبال کا ایک گوشۂ پنہاں

حضرت خواجہ احمد الدین اور علامہ اقبال رحمہما اللہ*

(علامہ عرشی امرتسری)

"مولانا مرحوم کے انتقال کی خبر میں نے اخبارات میں دیکھی خدا تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔

اس زمانے میں ان کا دم غنیمت تھا۔ ایسے عالم باعمل روز روز نہیں پیدا ہوتے۔"

(حضرت خواجہ کی وفات پر علامہ کا مکتوب بنام عرشی خط ۱۴، ص ۳۰۔ اقبال نامہ حصہ اوّل)

مئی ۱۹۷۳ء کا آخری اتوار صبح سے شام تک سمن آباد (لاہور) میں گزرا۔ ناشتے سے قبل ہی صوفی تبسم صاحب کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے درمیان میں پرانے وقتوں کی صحبتوں کا ذکر آگیا۔ میں اسی مقصد کے لئے حاضر ہوا تھا۔ میرے ایک سوال کے جواب میں صوفی صاحب نے انکشاف کیا کہ علامہ اقبال ماہ نامہ "بلاغ" (امرتسر) کے باقاعدہ مطالعہ کی وجہ سے حضرت خواجہ احمد الدین کے غیر معمولی قرآنی مطالعہ و تدبر و تعمق سے خوب واقف تھے۔ علامہ اپنے ایک مکتوب (بنام صوفی تبسم) میں تحریر فرماتے ہیں:

"... مجھ کو ان کے خیالات سے کسی حد تک پہلے بھی آگاہی تھی۔

کیا اچھا ہو کہ وہ شریعتِ محمدیہ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں جس میں "عبادات" و "معاملات" کے متعلق صرف قرآن** سے

---

* علامہ عرشی کا یہ مضمون اقبال اکادمی کراچی کے مجلہ "اقبال ریویو" کے جولائی ۱۹۷۴ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے۔ ہم اقبال اکادمی کے شکریہ کے ساتھ اسے یہاں درج کر رہے ہیں۔

** "صرف قرآن" کی شرط ملاحظہ فرمائیے۔

استدلال کیا گیا ہو، "معاملات" کے متعلق خاص طور پر اس قسم کی کتاب کی آجکل شدید ضرورت ہے ہندوستان میں تو شاید اس کے مقبول ہونے کے لئے مدت درکار ہے۔ ہاں دوسرے اسلامی ممالک میں اسکی ضرورت کا احساس ہر روز بڑھ رہا ہے۔ غرض کہ مولوی صاحب موصوف یا ان کے رفقاء کو جو کلام الٰہی اور مسلمانوں کے دیگر مذہبی لٹریچر پر عبور رکھتے ہیں۔ اس طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ میں اور مجھ ایسے اور لوگ صرف ایک آنکھ رکھتے ہیں۔ ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ رسالہ[1] "بلاغ" (امرتسر) کے ہر نمبر میں اور مولوی حشمت علی کے رسالہ اشاعت[2] القرآن کے ہر نمبر میں اسی پر بحث ہوتی ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اسکے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سعادت انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں۔ اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔

نیز جو قواعد (عبادات یا معاملات، بالخصوص موخر الذکر) کے متعلق دیگر اقوام میں اس وقت مروج ہیں ان کا قرآنی نقطۂ نگاہ سے استقصا کیا جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوع انسانی کبھی سعادت سے بہرہ اندوز نہیں

---

[1] خواجہ صاحب اور انکے رُفقاء اس علمی و دینی پرچہ کو نکالا کرتے تھے۔ اور حضرت علامہ اس کا باقاعدہ مطالعہ کرتے تھے۔

[2] یہ پرچہ مولوی حشمت علی صاحب، شاگرد رشید مولانا عبداللہ چکڑالوی نکالا کرتے تھے یہ پرچہ جماعت "اہل قرآن" کا نقیب تھا۔

ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اسوقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ حال کے جورس پروڈنس (Jurisprudence) (قانونی تعزیرات) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا۔ وہی اسلام کا مجدد اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم ہوگا۔ افسوس ہے کہ زمانہ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانے کے مزاج سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدین شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت پرستی نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکام قرآنی کا ہی منکر ہے۔ عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ مَیں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سُنا کہ حضرت امام ابوحنیفہ کا نظیر ناممکن ہے۔

غرض کہ یہ وقت عملی کام کا ہے کیونکہ میری رائے ناقص میں مذہب اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔"

مخلص: محمد اقبال (اقبال نامہ جلد اوّل خط ۱۹ ص ۴۸)

علامہ کے اس خط[1] سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ نہ صرف خواجہ صاحب اور ان کے رُفقاء کے خیالات سے واقف تھے۔ بلکہ اس دَور کی سب سے بڑی اسلامی خدمت یعنی تشکیل جدید فقہ اسلامیؒ کے لئے ان کے نزدیک حضرت خواجہ اور ان کے رُفقاء سب سے زیادہ موزوں تھے۔

اسی سلسلے میں حضرت علامہ خواجہ صاحب سے ملاقات کے متمنی تھے۔ ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ان دنوں خطبات مدراس (تشکیل جدید الٰہیات اسلام)

---

[1] اب اس خط کی اصل نیز علامہ کے مزید کئی خطوط کی اصلیں جو صوفی صاحب کے نام تھیں اقبال اکیڈمی کراچی کے پاس محفوظ ہیں۔ ان کی فوٹو کاپی صوفی صاحب کے پاس بھی ہے۔

کی تیاری میں مصروف تھے اور قرآن مجید سے جس قسم کی محققانہ اور حکیمانہ رہنمائی چاہتے تھے۔ اس میں مدد کرنے والا ملک بھر میں ان کو خواجہ صاحب کے سوا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔

صوفی صاحب نے بتایا کہ ملاقات کی تحریک علامہ کی طرف سے ہوئی مگر وہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے امرتسر نہیں جا سکتے تھے۔ اس لئے خواہش تھی کہ اگر کوئی صورت ہو سکے تو خواجہ لاہور تشریف لے آئیں۔ میں (صوفی تبسم) جب امرتسر گیا تو خواجہ صاحب سے اس کا تذکرہ کیا۔ خواجہ صاحب نے فرمایا بہت بہتر میں تو خود ان سے مستفید ہونا چاہتا ہوں۔ مَیں نے یہ صورت حال علامہ کو لکھ دی۔ اس کے جواب میں علامہ نے لکھا: (۲ر ستمبر ۱۹۲۵ء)

"..... مجھے یقین ہے کہ مولوی صاحب[1] موصوف کو میرے ساتھ تبادلۂ خیالات کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ ہاں مجھ کو ان سے فائدہ پہنچنا یقینی ہے۔ اس واسطے وہ اگر مجھ کو مستفیض کرنے کے ارادے سے امرتسر سے لاہور آنے کی زحمت فرمائیں تو انکی بہت مہربانی ہے جس کے لئے میں ان کا نہایت شکر گزار ہوں گا۔"

(اقبال نامہ حصہ اوّل خط ۱۹ ص ۳۸)

علامہ کے مندرجہ بالا جواب آنے کے بعد ہمیں لاہور پہنچنے میں کچھ تاخیر ہو گئی تو چار دن بعد پھر ایک خط آیا۔ (۶ر ستمبر ۱۹۲۵ء)

"جناب من السلام علیکم

مَیں کل شام مولوی صاحب کا منتظر رہا۔ لیکن چونکہ وہ تشریف نہ لائے۔ اسواسطے مجھے اندیشہ ہے کہ میرے خط سے کوئی غلط فہمی نہ ہوئی ہو۔

---

[1] یہاں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ ان دنوں خواجہ صاحب کو عام طور پر مولوی صاحب کہا جاتا تھا۔ بعد میں ان کی 'خوجہ برادری' کی ایک کانفرنس نے اپنا قومی لقب 'خوجہ' کے بجائے 'خواجہ' قرار دیا تو راقم (عرشی) نے جو ان دنوں 'بلاغ' کی ادارت کے فرائض انجام دیتا تھا، لفظ 'مولوی' پر اسکو ترجیح دی اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ یہ لفظ اپنی معنویت کھو چکا تھا۔

میں نے آپ کے ارشاد کی تعمیل میں وقت کی تعین اس واسطے نہ کی تھی کہ اس بارے میں مولوی صاحب موصوف کی آسائش کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ ان کی یہ عنایت کم نہیں کہ وہ محض میرے فائدے کے لئے لاہور تشریف لانے کی زحمت گوارا فرماتے ہیں۔ یہ بات قرینِ انصاف نہیں کہ ان حالات میں میں اپنی سہولت اور اوقات ملحوظ رکھوں مجھ کو یہ بات اس خط میں واضح کر دینی چاہیئے تھی۔ کہ وہ جب چاہیں تشریف لائیں۔ مجھ کو صرف ایک روز پہلے مطلع کریں۔ تاکہ میں ان کی تشریف آوری کے وقت مکان پر ہی رہوں۔ کہیں اِدھر اُدھر نہ چلا جاؤں۔

آپ کو گذشتہ خط لکھنے کے بعد میں نے چند باتیں نوٹ بھی کر رکھی تھیں جن پر میں مولوی صاحب کے خیالات سے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا آرزو مند ہوں۔

(مخلص محمد اقبال)

مولوی صاحب کی خدمت میں میری طرف سے سلام عرض کر دیجئے گا۔"[1]

علامہ کے اس خط کے بعد میں (صوفی تبسم) خواجہ صاحب کو لاہور لے آیا، اور گڑھی شاہو میں ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ پی۔ ایچ۔ ڈی (امرتسری) کی قیام گاہ پر انہیں ٹھہرا کر علامہ کو اطلاع دینے کے لئے گیا کہ خواجہ صاحب آگئے ہیں۔ اجازت ہو تو انہیں آپ کے ہاں لایا جائے۔

علامہ نے فرمایا، وہ تو میرے مہمان ہیں۔ انہیں دوسری جگہ کیوں اُتارا گیا۔ سیدھا یہاں لانا چاہیئے تھا۔ بہر حال صوفی صاحب اور خواجہ صاحب تانگے پر حضرت علامہ کی کوٹھی پہنچے اور ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ (خواجہ صاحب کی خواہش تخلیہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے الگ) ان کے پیچھے پیچھے سائیکل پر آگئے۔ اور اس طرح

---

[1] اس خط کی اصل بھی اقبال اکیڈمی کراچی میں موجود ہے۔

اوٹ میں بیٹھ گئے کہ خواجہ صاحب کو دکھائی نہ دیں۔ رات کا وقت تھا اور خواجہ صاحب کی نظر مزمن مرض رمد چشم کی وجہ سے رات کو بخوبی کام نہیں دیتی تھی۔

علامہ نے قبل ملاقات تبسم صاحب سے یہ دریافت کیا تھا۔ کہ جدید فلسفیانہ اصطلاحات کا استعمال اس گفتگو میں ناگزیر ہوگا۔ کیا مولوی صاحب کو اس میں مشکل تو پیش نہیں آئے گی؟ صوفی صاحب نے اس کے متعلق ان کو مطمئن کر دیا تھا۔

صوفی صاحب کہتے ہیں: "قرآن حکیم کے مختلف مقامات کے متعلق یہ گفتگو مسلسل چار گھنٹے تک جاری رہی۔ مابعد الطبیعیات اور الہیات کا شاید ہی کوئی اہم پہلو ہو، جو زیر بحث نہ آیا ہو۔ علامہ نے ابتداء میں کہا، کہ مجھے خطبات مدراس کی تیاری میں بعض حقائق قرآنی کے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ کئی مقامات پر میں غور کر چکا ہوں۔ بعض مقامات ابھی غور طلب ہیں۔ اس میں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔" چنانچہ علامہ سوال کرتے، اور خواجہ جواب دیتے جاتے تھے۔ نہایت بلند عمیق حقائق سامنے آرہے تھے۔ میں (صوفی) اپنے آپ کو خود فراموشی اور جہاں فراموشی کے عالم میں بالکل ہی کسی دوسری نادیدہ دنیا میں محسوس کر رہا تھا۔ کاش میں ان دنوں ان مکالمات کو قلمبند کر لیتا۔ جو اس طویل مدت کے گذر جانے کے بعد ذہن میں محفوظ نہ رہ سکے۔" (مجھ (عرشی) کو یاد پڑتا ہے صوفی صاحب نے انہی دنوں مجھے بتایا تھا کہ آیہ " ان اللہ یحول بین المرء وقلبہ" پر بہت غامض اور قدرے طویل گفتگو ہوئی تھی) صوفی صاحب نے یہ بھی کہا کہ دوران کلام میں کسی مقام پر بھی خواجہ صاحب کو علامہ کا نقطۂ نگاہ سمجھنے میں رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ جدید فلسفہ کی ہر اصطلاح کو بے تکلف سمجھتے اور اس پر اظہار خیال کرتے تھے۔ حالانکہ بعض مقامات پر مجھ (صوفی) کو فہم معانی میں مشکل پیش آتی تھی۔ گفتگو کے آخر میں صرف ایک مسئلہ پر خواجہ صاحب نے اپنی ناواقفیت کا اعتراف کیا۔ وہ حسب ذیل ہے۔

علامہ نے تجدد امثال کے متعلق قرآنی روشنی چاہی۔ خواجہ صاحب نے کہا، کہ "میں نے اس نقطۂ نگاہ سے قرآن میں غور نہیں کیا۔"

صوفی صاحب نے یاد دلایا کہ وہ (صوفی) اس ملاقات کے متعلق مختصر طور پر ۱۹۳۸ء کے "راوی" گورنمنٹ کالج لاہور میگزین) میں لکھ چکے ہیں۔ راوی کا وہ پرچہ تو نہیں ملا۔ لیکن ماہ اگست ۱۹۳۸ء کے 'بلاغ' (امرتسر) نے یہی تحریر بشکریہ "راوی" درج کی ہے۔ اسی کی نقل پیش خدمت ہے:

"ذیل کا خط[1] علامہ مرحوم نے ۱۹۲۵ء میں میرے نام لکھا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب قبلہ محمود شیرانی مدظلہ العالی کی وساطت سے پہلے پہل مجھے ڈاکٹر صاحب سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ اگرچہ میں فارغ التحصیل ہو کر لاہور سے اپنے وطن چلا گیا تھا۔ تاہم ان سے ملاقات کا اشتیاق ہمیشہ دامن گیر رہتا اور میں گاہے گاہے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان کی عالمانہ گفتگو سے استفادہ کرتا رہتا۔

اسی زمانہ میں امرتسر سے رسالہ "بلاغ" شائع ہوا۔ اس رسالہ میں خواجہ احمدالدین مرحوم کے مضامین اور قرآنِ حکیم کی تفسیر انہی کے قلم سے شائع ہوتی تھی۔ یہ رسالہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں باقاعدہ پہنچتا تھا۔ اور وہ بالاستیعاب اسکا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ اس خط میں جن مولانا کا ذکر آیا ہے وہ یہی خواجہ احمدالدین مرحوم ہیں۔ میری دلی خواہش تھی کہ ڈاکٹر صاحب اور خواجہ صاحب کی ملاقات ہو۔ اور دونوں بزرگوں نے خود بھی بارہا اس کے لئے انتہائی اشتیاق کا اظہار فرمایا، لیکن یہ چیز ہمیشہ معرضِ التوا میں پڑی رہی۔ آخر کار ایک موقع نکل آیا۔

اس ضمن میں سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ ملاقات سے پہلے دونوں بزرگوں نے زبانی اور تحریری طور پر نہایت عجز اور انکسار سے کام لیا۔ جیسا کہ اس خط کے اندازِ بیان سے ظاہر ہے ہر ایک اسی بات پر زور دیتا تھا کہ ملاقات کا مقصد محض دوسرے سے استفادہ کرنا ہے۔ اور بس۔ میں عجیب اُلجھن میں تھا۔ اور مجھے اس بارے میں کچھ عرض کرنے کی جرأت نہ تھی۔ اس لئے کہ

---

[1] یعنی مکتوب اقبال بنام صوفی تبسم مندرجہ اقبال نامہ۔ مرتبہ عطاء اللہ حصہ اول ص ۲۶ ۴۹ جو اس مضمون کی ابتدا میں درج کیا جا چکا ہے۔

اظہار انکسار میں کسی نمائش یا تصنع کا شائبہ تک نہ تھا۔ مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ اس بات کا احساس ہوا کہ علم کی غایت اور انتہا عجز و انکسار کے سوا کچھ نہیں اور دنیا کی ممتاز ترین ہستیوں کا یہ ارشاد کہ "معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد" حقیقت پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ ہر صاحب بصیرت کائنات کی گہرائیوں میں کھو جانے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے۔

مولانا احمد الدین لاہور تشریف لائے اور میں ان کی معیت میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دونوں بزرگوں میں مسلسل چار گھنٹے تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ مابعد الطبیعیات اور الٰہیات کا شاید ہی کوئی اہم پہلو ایسا ہو جو زیر بحث نہ آیا ہو۔

یہ بابرکت صحبت رات کے ایک بجے ختم ہوئی۔ اس صحبت میں شریک ہونے والے میرے محترم دوست ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ پی۔ ایچ۔ ڈی بھی تھے۔ یہ واقعہ آج سے تقریباً تیرہ[1] برس پہلے کا ہے۔ لیکن میرے تاثرات ابھی تک تازہ ہیں۔ آج بھی جب کبھی اس ملاقات کا خیال آتا ہے۔ تو دل پر ایک خاص محویت طاری ہو جاتی ہے۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ جب ہم اس رات ڈاکٹر صاحب سے رخصت ہو کر چلے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہم عالمِ بالا کی سیر کر رہے ہیں۔

(تبسم)

(ماہنامہ بلاغ اگست ۱۹۳۸ء بحوالہ راوی لاہور)

صوفی صاحب نے اپنی اس تحریر میں یہ فرمایا کہ "وہ (علامہ) بالاستیعاب اس (ماہنامہ 'بلاغ') کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔" اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ جو رسالہ 'بلاغ' کے مالک و مدیر اوّل حکیم شہاب الدین (امرتسری) کی زبان سے راقم نے سنا تھا۔ جس سے علامہ کی اس رسالہ سے دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ حکیم صاحب لاہور آتے تو علامہ سے بھی ملاقات کرتے اور "بلاغ" کا سالانہ

---

[1] یاد رہے کہ یہ تحریر ۱۹۳۸ء کی ہے۔

چندہ دستی وصول کرتے تھے۔ ایک دفعہ علامہ نے ان سے کہا۔

"میرے پاس سب رسائل و اخبارات بلا قیمت پہنچ جاتے ہیں۔ صرف آپ ایسے ہیں کہ مجھ سے 'بلاغ' کی قیمت وصول کرتے ہیں"۔

یہ تھی خواجہ و علامہ کی ملاقات کی سرگزشت۔ راقم کو یہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ علامہ کو خواجہ صاحب سے مکرر ملاقات کا شوق رہا۔ ان کے ذہن میں بعض اہم قرآنی سوالات پیدا ہوتے رہتے تھے۔ جن کے متعلق وہ خواجہ صاحب سے تبادلۂ خیال کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ سورۂ نساء کی آیت ۱۵۹ "وان من اھل الکتاب الا لیؤمنن بہ قبل موتہ" کا ذکر آیا تو اس کی ضمیروں کی تعین کے متعلق راقم علامہ کے استفسار کا جواب نہ دے سکا اور خواجہ صاحب کی طرف رجوع چاہا۔ علامہ کو جب ان کی تحقیق معلوم ہوئی تو اس سے دلچسپی کا اظہار فرمایا۔

ایک اور صحبت میں توریت کے مسئلہ "عول" کے متعلق راقم سے حضرت خواجہ کی تحقیق دریافت فرمائی، میں نے لاعلمی ظاہر کی اور امرتسر پہنچ کر خواجہ صاحب کو آمادہ کیا کہ وہ علامہ کے رو در رو اس اہم مسئلہ پر روشنی ڈالیں (خواجہ صاحب "عول" کے قائل ہی نہ تھے۔ وہ اسے قرآنی تصریحات کے عدم فہم کا نتیجہ قرار دیتے تھے) ان کی منظوری سے علامہ کو مطلع کیا تو آپ نے یہ مکتوب سپرد قلم فرمایا۔

لاہور ۱۷ر اکتوبر ۱۹۳۵ء

جناب عرشی صاحب السّلام علیکم

آپکا والا نامہ آج صبح مجھے مل گیا۔ مولوی صاحب قبلہ کی خدمت میں میری طرف سے سلام عرض کر کے بہت بہت شکریہ ادا کیجئے۔ جیسا کہ آپکو معلوم ہے، میں گذشتہ ۱۸ ماہ سے ہائی کورٹ کا کام نہیں کر رہا۔ اس واسطے مولوی صاحب سے گفتگو کرنے کے لئے مجھے کچھ پہلے کتابوں

کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ جس کے لئے اسوقت میری طبیعت حاضر نہیں۔ اور نہ اس قدر محنت برداشت ہو سکتی ہے۔ انشاء اللہ کچھ مدت بعد ایسا کر سکوں گا۔

فی الحال میرے خیال میں چاہیئے کہ ایسی مثالیں لی جائیں جن میں فقہا کے نزدیک "عول" کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور تقسیم سے ثابت کیا جائے کہ "عول" کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسی مثالیں انگریزی کتاب میں موجود ہیں۔ مولوی سراج الدین پال آپکو بتا سکیں گے۔ یہ مسئلہ نہایت ضروری ہے۔ میں خود بھی "عول" کی تردید میں بہت دلچسپی رکھتا ہوں۔

امید کہ مولوی[1] صاحب کا مزاج بخیر ہوگا۔ اگر "عول" پر ایک علیحدہ رسالہ لکھا جائے تو نہایت مناسب ہوگا۔ جو کچھ مولوی صاحب نے 'بیان القرآن[2]' میں لکھا ہے اسکو مزید تشریح و توضیح کے ساتھ علیحدہ چھاپ دیا جائے[3] تاکہ اس مسئلہ کیطرف علماء کی خاص توجہ ہو جائے اور وکیل و بیرسٹر صاحبان بھی اس میں خاص دلچسپی لے سکیں۔ مخلص، محمد اقبال

(اقبال نامہ حصہ اوّل صفحہ ۱۳۱، ۲۸)

افسوس ہے کہ دونوں بزرگوں کی پیری و علالت کی وجہ سے یہ ملاقات وقوع پذیر نہ ہو سکی۔ اور ۲۔ جون ۱۹۲۶ء میں خواجہ صاحب انتقال فرما گئے۔

خواجہ صاحب کی تحریروں کے مطالعہ اور ان سے ملاقات کا علامہ اقبال پر کیا اثر ہوا؟ اس کیلئے اقبال نامہ اور خطبات مدراس کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔" الخ

---

[1] حضرت خواجہ احمد الدین مرحوم [2] تفسیر بیانٌ للناس

[3] مروجہ قانون وراثت کی فاش اغلاط گزشتہ صدیوں میں کسی کی نظر میں نہیں آئی تقسیم "سراجی" کو پاک از خطا صحیفہ سمجھ کر رائج کر رکھا تھا۔ خواجہ صاحب پہلے شخص ہیں۔ جنہوں نے اس پر گرفت کی اور اور ملک بھر کے فقہا اور علماء کو اس طرف متوجہ کیا۔

(از مرتب، علامہ اقبال اور حضرت خواجہ احمد کی اس ملاقات میں جو گفتگو ہوئی اس کے چند نکتوں کا تذکرہ تو عرشی صاحب کے اس مضمون میں آگیا ہے۔ اس ملاقات کی کچھ تفصیل ماہنامہ 'بلاغ' امرتسر کے سوانح خواجہ احمد نمبر (ستمبر ۱۹۳۶ء) میں بھی شائع ہوئی تھی (اس وقت علامہ اقبال حیات تھے) اس میں ہے کہ:

"گفتگو دقیق فلسفیانہ مسائل پر تھی، ڈاکٹر صاحب ایک مسئلہ بیان فرماتے اور خواجہ مرحوم اس مسئلے کی تائید یا تردید میں آیات قرآنی پڑھتے، ڈاکٹر صاحب بعض آیات کو نوٹ بھی کر لیتے۔ ساڑھے تین گھنٹے کے عرصہ میں اثبات وجود باری تعالےٰ جبر و قدر، خیر و شر، غرض ہر عمیق مسئلہ پر بڑی دقت طرازیوں سے روشنی ڈالی گئی گفتگو کے اختتام پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ

"مولانا آپ نے قرآن کا مطالعہ اتنی دقت نظر سے کیا ہے اور اس پر اپنی زندگی کا کثیر حصہ صرف کیا ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ ضروریات کا بھی آپ کو پورا پورا احساس ہے۔ آپ کو چاہیئے کہ اس مطالعہ سے فائدہ اٹھا کر ایک نئی فقہ تیار کریں"۔ ؏

خواجہ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں اظہار عجز کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ کو ماشاءاللہ قرآن اور فلسفۂ جدید دونوں پر عبور حاصل ہے۔ یہ کام آپ ہی کے شایانِ شان ہے۔

غرض یہ معاملہ بھی طرفین کے انکسار کی وجہ سے طے نہ پا سکا۔"

(بلاغ امرتسر خواجہ احمد نمبر ص۵ تا ص۷ ستمبر ۱۹۳۶ء)

؏ صوفی تبسم کے نام مکتوب میں بھی جو اس مضمون کی ابتداء میں درج کیا جا چکا ہے۔ علامہ مرحوم نے حضرت خواجہ اور ان کے رفقاء سے صرف قرآن کی بنیاد پر (صرف کے لفظ پر توجہ فرمائیے) نئی فقہ مرتب کرنے کی فرمائش کی ہے۔ اس ملاقات میں اسے پھر دہرایا ہے۔ اس بات کی علامہ کے نزدیک اتنی اہمیت تھی کہ ان کے نزدیک یہ کام کرنے والا اس عہد کا سب سے بڑا مجدد ہوگا۔ (ملاحظہ ہو مکتوب بنام صوفی تبسم)

ضمیمۂ سوم: تبصرے (متعلق ص۴۶)

(۱) مولانا ثناء اللہ امرتسری اور حضرت خواجہ احمد کے درمیان ہونے والے اس تحریری مباحثہ میں فریقین کے مسلمہ ثالث مولانا عبداللہ منہاس ایڈیٹر اخبار "مسلم راجپوت" (سابق اڈیٹر وکیل) امرتسر نے جو فیصلہ دیا وہ درج ذیل ہے، وہ لکھتے ہیں:

"اشاعتِ ماسبق میں مولوی ثناء اللہ صاحب کی چھٹی دربارہ برہان القرآن شائع کی گئی تھی۔ آج میاں مولابخش[1] صاحب سوداگر صابون کی طرف سے جواب شائع کیا جاتا ہے۔ میاں مولابخش صاحب نے اپنی تحریر کے ثبوت میں پرچوں کے مسودے اور مولوی ثناء اللہ کا اصل رقعہ ہمیں دکھلایا ہے۔ اس کے بعد اس میں شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہیں ہے کہ مولوی صاحب نے خود ہی مولوی احمدالدین صاحب کو تحریری بحث پہ آمادہ کیا۔ خود ہی پہلے چھ اور پھر پانچ پانچ پرچے لکھنے قرار دیئے اور خود ہی دو پرچے لکھنے کے بعد بحث کو قبل از تکمیل بند کر کے زبانی گفت و شنید کی خواہش ظاہر کی جس سے مولوی احمدالدین صاحب اور آپ کے احباب پہلے ہی انکار کر چکے[2] تھے۔

مولوی صاحب عالم دین ہیں۔ سردار اہلحدیث کہلاتے ہیں۔ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ (۲۸/۶۱) کی پُر جلال سرزنش سے واقف ہیں اور لوگ اُن سے رہنمائی کی توقع رکھتے ہیں ان سے ایسی باتوں کا سرزد ہونا سخت تعجب خیز ہے جن سے ایک

لہ میاں صاحب امرتسر کے مشہور تاجر اور خواجہ صاحب کے معتقد تھے۔ مولانا ثناء اللہ نے انہیں کے ذریعے حضرت خواجہ احمد سے تحریری مباحثہ طے کیا تھا۔ بعد میں میاں صاحب نے ہی یہ مناظرہ شائع کیا۔

لہ کیونکہ بالمشافہ گفتگو کا کوئی ریکارڈ نہیں ہوتا۔ اور اس زمانے میں ٹیپ ریکارڈ تھا نہیں اس طرح کسی بھی فریق کو غلط بیانی کرنے کا پورا موقعہ حاصل رہتا ہے خصوصاً چالاک مناظرین کو۔

عامی کو بھی عار ہو۔

ہماری رائے میں مولانا کے لئے مناسب یہی ہے کہ حسب قرار داد سابق پانچ پانچ پرچے پورے کر کے بحث کو تکمیل تک پہنچا دیں۔ احقاقِ حق پیشِ نظر ہو تو صراط مستقیم سے گریز کی حاجت نہیں ہوتی۔"

(اخبار مسلم راجپوت، امرتسر ۲۶ ستمبر ۱۹۲۳ء)

یہ تو محاکمہ تھا فریقین کے مسلمہ ثالث کا۔

(۲) اب ایک شیعہ صاحب علم علامہ عباس طالب صفوی (شمس آباد یو پی) نے اس مباحثہ پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے جو لکھا ہے اس کا اقتباس ملاحظہ ہو۔ "ہمارے نزدیک نہ مولانا ثناء اللہ صاحب کے خیالات درست ہیں۔ نہ خواجہ احمد الدین صاحب کے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ مناظرانہ اصول کے اعتبار سے اس تحریری مباحثہ میں مولانا ثناء اللہ صاحب اپنے فریق کے سامنے ٹھہر نہیں سکے اور میدان خواجہ احمد الدین صاحب کے ہاتھ رہا۔"

(بلاغ امرتسر نومبر ۱۹۳۶ء)

(۳) اس مباحثہ کے متعلق بریلوی حضرات کے ایک صاحبِ علم مولانا محمد بشیر صاحب کوٹلوی کا تبصرہ بھی ملاحظہ فرمایئے (ان کی اس تحریر میں چکڑالویوں سے مراد حضرت خواجہ احمد اور ان کے رفقاء ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ خواجہ صاحب چکڑالوی صاحب کے غالیانہ خیالات سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ نیز خود کو مسلم کے علاوہ کسی بھی فرقہ وارانہ نام سے موسوم کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر ان مولانا نے تنابزوا بالالقاب (۴۹/۱۱) کی ممانعت کے باوجود اپنے مولویانہ مزاج کی وجہ سے یہ ناپسندیدہ نام خواجہ صاحب اور ان کے رفقاء پر چسپاں کرنا ضروری سمجھا۔ بہر حال اپنے اس تبصرے میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ وہابی حضرات (خصوصاً اہلحدیث) اور چکڑالویوں میں کوئی فرق نہیں کیونکہ یہ لوگ چکڑالویوں کے سامنے اگرچہ سنی (یعنی بریلوی) بن جاتے ہیں لیکن جب ہمارے مقابلہ پر آتے ہیں تو پھر چکڑالوی بن جاتے ہیں کیونکہ بغیر ایسا کئے کے ہمارا مقابلہ

کر ہی نہیں سکتے۔ اب ان کا اصل مضمون مطالعہ فرمائیے جس کا عنوان ہے۔

محمدی یا چکڑالوی؟ [1]

پچھلے دنوں ۲۸ ر اگست کے الفقیہ میں میرا ایک مضمون بعنوان "رفعت شان مصطفےٰ" نکلا ہے۔ جس میں بحوالۂ کتب حضورؐ کی عظمت شان کا بیان کیا گیا ہے۔ عظمتِ مصطفےٰ کا بیان ہوتا اور یہ اندرونی چکڑالوی (وہابی اور فرقہ اہل حدیث) خاموش رہ جاتے۔ ناممکن تھا۔ ان لوگوں کے سردار مولوی ثناء اللہ رفعتِ شانِ مصطفےٰ کے خلاف جھٹ قلم لے کر اُٹھے اور اہلحدیث ۷ ار ستمبر ۱۹۳۷ء میں ایک مضمون بعنوان "کیا یہ سنی مذہب ہے یا مسیحی" لکھ مارا اور اپنی جلن کا یوں اظہار کیا کہ :-

"مضمون نگار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رفیع کا بہت طویل ذکر کیا ہے۔"

گویا حضور کی شان رفیع کا طویل ذکر بھی ان کے لئے باعثِ تکلیف ہوا۔

میں نے اپنے مضمون میں حضورؐ کی رفعت کا قرآن اور احادیث سے ذکر کر کے احادیث سے یہ ثابت کیا تھا۔ کہ حضور کا نام نامی جنت پر اور جنت کے باغات کے پتہ پتہ پر اور اس کے دروازوں پر حوروں اور رضوانوں کی آنکھوں اور پتلیوں میں لکھا ہوا ہے اور کسی چیز پر کسی شخص کا نام لکھا ہونا اس امر کی علامت ہوتی ہے کہ یہ اس چیز کا مالک ہے۔ لہٰذا حضورؐ ہر چیز کے مالک ہیں۔ بس میرے سارے مضمون میں مولوی صاحب کو یہیں تکلیف ہوئی اور دو ورق کے مضمون کی آیات و احادیث کو چھوڑ کر صرف اسی جملہ کو لے کر اپنی اندرونی عداوت کا اظہار کیا۔ مولوی صاحب کی عادت ہے کہ آپ مضمون کا سیاق سباق چھوڑ کر صرف ایک جملہ کی تردید کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ مزہ تو جب تھا کہ مولوی صاحب میری پیش کردہ احادیث کا جواب دیتے اور ان کے گرو مولوی اسمٰعیل کی جو گستاخیاں ہم نے پیش کی تھیں ان کا جواب بھی دیتے۔ یہ کیا کہ ایک جملہ لیکر جواب لکھ دیا اور تیس مار خاں بن گئے۔ مولوی صاحب کی نظروں میں بس یہی ایک جملہ کھٹک رہا ہے کہ حضور ہر چیز کے مالک ہیں۔ آپ اس کا رد فرماتے ہیں

---

[1] بریلوی مسلک کے ترجمان "الفقیہ" امرتسر ۱۴ ر اکتوبر ۱۹۳۷ء سے منقول۔

لکھتے ہیں:

"یہ نتیجہ جو راقم مضمون نے نکالا ہے کہ حضورؐ ہر چیز کے مالک ہیں بالکل غلط اور اسلام کی صریح نقیض ہے۔ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا۔ قرآن کی نص صریح جس ستودہ صفات کے حق میں ان الفاظ میں وارد ہو قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا۔ قُلْ اِنِّیْ لَنْ يُّجِيْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا۔ جس کی اپنی شان میں یہ خداوندی ارشاد پہنچا ہو لَآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ۔ ہاں ہاں جس کی شان میں یہ بھی وارد ہوا ہو لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ جو تکلیف اور بھوک کے وقت پیٹ پر پتھر باندھے۔ جس کو بخار چڑھے تو دوسروں سے دوگنا چڑھے اور فرمائے کہ مجھے اجر بھی دگنا ملتا ہے۔ جو انتقال کے وقت بڑی تکلیف کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو۔ جو اپنی پیاری بیٹی فاطمہؓ کو صاف فرمائے لا املك لك من الله شيئا جو اپنی غلامی کا اظہار یہاں تک کرے کہ انما اكل كما يا كل العبد جو اپنے انتقال کے وقت وصیت فرمائے کہ لا تجعلوا قبری وثنا یعبد اگر اس بزرگ کی امت اُس کو زمین و آسمان کا مالک سمجھے تو وہ مسیحیوں کو کس منہ سے کافر کہہ سکتی ہے۔"

(اہلحدیث ۱۷ ستمبر ۱۹۳۷ء ص۴)

ناظرین کرام! مولوی صاحب کی اس تحریر کو ملاحظہ کیجئے اور دیکھئے کہ ایک ایک لفظ سے چکڑالویت ٹپک رہی ہے یا نہیں؟ حضورؐ کا مالک ہونا انہیں کتنا بُرا معلوم ہوا ہے کہ اس کی تردید میں قلم بے لگام ہوا جا رہا ہے۔ اور آپ "ہاں ہاں" کہہ کر سرورِ دو عالم کی رفعت کا رد فرما رہے ہیں۔ فالی اللہ المشتکی

چکڑالویوں نے جب یہ کہا کہ محمدؐ رسول اللہ کو اصل مطاع اور احکم الحاکمین ماننا شرک ہے

کیونکہ اصل مطاع اور احکم الحاکین خدا ہے محمدؐ رسول اللہ کو اصل مطاع اور احکم الحاکین تسلیم کرنا گویا خدا کی صف میں کھڑا کر دینا ہے تو یہی مولوی ثناء اللہ اس کا جواب دیتے ہیں۔

"ہمارا دعویٰ تھا اور اب بھی ہے کہ اللہ اور رسولؐ دونوں اصل مطاع ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اللہ بالذات اصل مطاع ہے۔ رسولؐ بحکم خدا اصل مطاع ہے مگر فریق ثانی اس عقیدہ کو شرک کہتا رہا اور کہتا ہے۔ ہم نے ہر چند کوشش کی کہ فریق ثانی ہمارا مدعا سمجھنے پر توجہ کرے۔ سمجھ کر جو چاہے کہے۔ مگر ہمیں اس امر کا افسوس ہے کہ وہ اپنی ضد پر ایسے مصر رہے کہ ان کو اس بات کا بھی خیال نہ آیا کہ ناظرین اہلِ علم ہماری تحریر کو دیکھ کر ہماری نسبت کیا رائے قائم کریں گے"

"ہم ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم احکم الحاکین ہیں مگر بالغیر کی قید یاد رہے"۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مخلوق ہیں احکم الحاکین باذن خدا ہیں" (اہلحدیث ۸ مئی ۱۹۳۱ء ص۳)

لیجئے صاحب! مولوی صاحب نے خود اپنا رد کر ڈالا۔ اس تحریر میں جہاں کہیں لفظ "مطاع" ہے۔ وہاں لفظ "مالک" رکھ لیجئے اور یہی تحریر ان اندرونی چکڑالویوں کے رد میں ہمارا جواب سمجھئے۔ مولوی صاحب! آپ کی پیشکردہ آیات کا بھی جواب ہو گیا کہ اگر کسی ملک کی نفی ہے تو ملک بالذات کی۔ ورنہ ہم آپ سے پوچھتے ہیں اور آپ ہی کی پیش کردہ آیات میں سے ایک آیہ یعنی لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ پیش کر کے پوچھتے ہیں کہ اس نص صریح کے ہوتے ہوئے آپ نے حضورؐ کو احکم الحاکمین کیسے مان لیا۔ آپ اس کا یہی جواب دیں گے جو دے چکے کہ ہم احکم الحاکمین حضورؐ کو بالغیر مانتے ہیں اور آیت میں اگر نفی ہے تو بالذات کی۔ پس مولوی صاحب! یہی کچھ ہمارا جواب ہے۔ آیات میں نفی بالذات کی ہے چنانچہ "اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ" کا جملہ اس

امر پر آیت میں خود شاہد ہے۔ مگر اس جملہ کے ہوتے ہوئے بھی آپ نے ہمارے سامنے چکڑالوی پن کا اظہار فرمایا۔

مگر باوجود ان امور کے پھر بھی ہمیں یقین نہیں کہ مولوی صاحب حضور کی مِلک بعطاء الٰہی کو بھی مان لیں گے۔ یقیناً وہ حضورؐ کے مالک باذن خدا ہونے کو بھی تسلیم نہ کریں گے اور اسے بھی شرک کہیں گے۔ کیونکہ مولوی صاحب کی مذکورہ بالا تحریر کا جواب چکڑالویوں کی طرف سے بھی یہی ہے کہ

"نبی کو اصل مطاع بالغیر کہنا بھی شرک ہے۔ جو چیز شرک ہے وہ بماتحتی حکم خدا کی قید سے توحید نہیں بن جائے گی۔"

(اشتہار خالق و مخلوق کی اطاعت میں فرق۔ محررہ یکم نومبر ۱۹۲۹ء)

پس مولوی صاحب! اگر چکڑالویت کے الزام سے بریت چاہتے ہیں تو ہمارے آقا و مولا کو مالک باذن اللہ تسلیم کر لیں اور اگر حضور کے مالک بالغیر ہونے کا بھی مولوی صاحب کو انکار ہے تو پھر ہمارا یہ کہنا بے جا نہیں کہ یہ لوگ محمدی نہیں بلکہ اندرونی چکڑالوی ہیں۔

مولوی صاحب پھر لکھتے ہیں کہ

"ہمیں خطرہ ہوا کہ کوئی غیر مسلم اخبار پنڈت لیکھرام کی طرح اسکو اسلام کا عقیدہ نہ سمجھ لے یہ لوگ تو اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں گے مگر یہ ریشمی گرہ اُن لوگوں کے لئے مشکل پیدا کر دے گی جو غیر مسلموں سے مناظرات میں سامنے آتے ہیں۔" (اہلحدیث مذکور ص۳)

تو معلوم ہوا کہ آپ اپنے مناظروں کی سہولت اور آریوں کی خاطر سرورِ عالم کی تنقیص کے درپے ہیں۔ سو آپ کو مبارک، ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے جو محض مناظرات اور آریوں کی خاطر اپنے آقا کے کمالات کا انکار کرنا شروع کر دیں۔ اس تنقیص اور بدعقیدگی سے گھروں میں بیٹھے رہنا ہی بہتر ہے۔ حدیث میں بھی تو آیا ہے کہ آخر زمانہ میں اہل اللہ کو کنارہ کش ہونا پڑیگا۔ سو وہ یہی زمانہ ہے۔

ہاں صاحب! اگر آپ اپنے مذکورہ بالا سنہرے فقروں کو چکڑالویوں کے مقابلہ

میں لے جاکر حضور کا اصل مطاع اور احکم الحاکمین ہونا ثابت کرنا چاہیں تو ایمان سے کہئے۔ کیا کرو گے۔ اور پھر کسی آریہ کے مقابلہ میں جب کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بھرے مجمع میں آپ کو شان اور کمالات بیان کرنے پڑیں۔ اور مجمع منتظر ہو کہ دیکھیں مسلمانوں کا رسولؐ کس شان کا ہے۔ تو آپ یوں بیان کرنا شروع کر دیں کہ ہمارا رسولؐ دُنیا سے بڑی تکلیف سے رخصت ہوا، بھوک سے تکلیف پاکر پیٹ پر پتھر باندھا کرتا تھا۔ اسے سخت بخار آیا کرتا تھا۔ اور وہ کسی چیز کا بھی مالک نہ تھا۔ خدا کے آگے اُن کی کوئی بات نہ چلتی تھی۔ وہ اب مر کر مٹی میں مل گیا ہے۔ اسے دیوار کے پیچھے کا بھی علم نہ تھا۔ وہ ایک ہمارے جیسا بشر تھا۔ اُسے اپنی بھی کچھ خبر نہ تھی تو مولوی صاحب! فرمایئے کہ کتنے غیر مسلم مسلمان ہوں گے؟ اور لوگ حضورؐ کا کیا نقشہ لے کر جائیں گے؟

مولوی صاحب اس کے آگے رقمطراز ہیں کہ :۔

"حنفی دوستو! آؤ قرآن مجید کی نص سنو۔ سورۂ نمل میں غلام اور مولیٰ کا ذکر کر کے فرمایا ہے کہ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ غلام اپنے مالک کے مال میں برابر شریک ہو جائے"۔

افسوس وہابیوں نے محبوب کبریا کو محض ایک غلام ہی سمجھا۔ وہابیو! سرورِ عالم محض غلام ہی نہیں۔ جو تمہارا یہ کہنا صحیح ہو۔ یوں تو ہم بھی سب اسی کے غلام ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے محبوب بھی ہیں۔ رسول بھی ہیں اور مصطفےٰ و مجتبےٰ رسول۔ مگر تم نے نرا ایک غلام سمجھ کر یہ کچھ لکھ مارا۔ اگر غلام مالک کے مال میں برابر کا شریک نہیں تو وہ اس کے حکم و مطاعیت میں بھی شریک نہیں۔ پھر جب محمدؐ رسول اللہ باوجود غلام ہونے کے اصل مطاع اور احکم الحاکمین ہو سکتے ہیں تو کیا وجہ کہ مالک نہ ہو سکیں؟" (الفقیہ امرتسر ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۷ء)

(۴) آخر میں ایک اور صاحب علم مولانا حکیم فیروز الدین[1] طغرائی صاحب کی

---

[1] حکیم صاحب اُردو، فارسی اور عربی کے بلند پایہ شاعر، حاذق طبیب، مستند عالم دین اور مشہور صحافی تھے۔ علامہ عبداللہ العمادی کے بعد ماہنامہ تہذیب الاخلاق امرتسر کے اڈیٹر رہے اور اس کے بعد وکیل امرتسر کے چیف اڈیٹر۔

مندرجہ ذیل تحریر ملاحظہ ہو (یہ تحریر ناشرین برہان القرآن نے بطور دیباچہ کتاب بھی شائع کی تھی۔

دیباچہ برہان القرآن

کافۂ اہلِ اسلام کے نزدیک یہ حقیقت مُسلّم ہے کہ قرآنِ حکیم ایک آخری اور مکمل پیغامِ عمل ہے اور اس میں کسی ترمیم و تحریف کا امکان نہیں۔ یہ یقین محض خوش اعتقادی کی بناء پر نہیں، بلکہ اِس کتابِ مجید کے متعدد مقامات پر خود بھی تصریح فرمائی ہے۔ مثلاً تکمیل کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ.. الخ $\frac{5}{4}$

آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا۔ اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔

تحفّظ و صیانت کے بارہ میں فرمایا۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ $\frac{15}{9}$

اس ذکر (قرآن) کو ہمیں نے نازل کیا اور ہمیں اس کے نگہبان ہیں۔

جہاں قرآنِ کریم نے ضروریاتِ وحی کے اعتبار سے اپنے مکمل اور محفوظ ہونے پر روشنی ڈالی ہے۔ وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ اُس کی تعلیمات و احکام، اِس خصوص میں نہایت مفصّل اور جزو و کل پر حاوی ہیں، چنانچہ وارد ہے۔

کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ۔ $\frac{11}{1}$

ایسی کتاب جس کی آیات کو خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے (دلائل سے) محکم اور مفصّل نازل کیا گیا۔

دوسرے مقامات پر تَفْصِیْلًا لِّکُلِّ شَیْءٍ $\frac{6}{154}$ اور تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ $\frac{16}{89}$ اور لَا رَطْبٍ وَّ لَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ $\frac{6}{59}$ کے صریح الفاظ آئے ہیں۔ جن سے پورے طور پر اس حقیقت کا انکشاف ہو جاتا ہے کہ کلامُ اللہ جو حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی کیا گیا، ایک ایسا مُبین اور مفصّل دستور العمل ہے، جن کے ہوتے ہوئے کسی اور وحی کی مطلق ضرورت نہیں رہتی۔

اس میں شک نہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہدِ مبارک میں بتقاضائے وقت تلقین و ارشاد کے طور پر یا بعض متغیرات کے انفصال کے رنگ

ایرادالی ثنایت کی مخالفین

میں اکثر احکام صادر فرمائے تھے۔ جن کو احادیث کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ ہدایات اور فیصلے بالعموم وقتی تھے ہمیشہ کے لئے مقصود نہ تھے۔ اسلئے ان کی حفاظت و تدوین کا انتظام ضروری نہ سمجھا گیا آنحضرت کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی ان کی کتابت و تسوید کیطرف توجہ نہ کی بلکہ خود رسالت پناہ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں روائت و کتابتِ حدیث سے روکا جاتا رہا۔

؟ قرونِ وسطیٰ میں تدوینِ حدیث کا خیال پیدا ہوا اور روائت و تنقید کے اصول وضع کئے گئے۔ پیغمبر علیہ السلام کے تدبر فی القرآن سے جائز حد تک مستفید ہونا بنظرِ استحسان دیکھا گیا۔ اور اس حد کے اندر رہتے ہوئے جو اجتہاد عمل میں آئے وہ محلِ اعتراض بھی نہیں ہو سکتے بدقسمتی سے بعد میں مسلمانوں کے بعض فرقوں نے اس پر اکتفا کرتے ہوئے احادیث کو وحی خفی کا خطاب دیکر آیاتِ قرآنی کی طرح حجت شرعی قرار دے لیا۔ دراصل اس عقیدہ کا منشأ و ماخذ پیغمبر اسلام کو حدِ بشری سے ارفع و اعلیٰ سمجھنا اور آپ کے عقلی اور ذہنی قویٰ کو سہو و خطا سے منزّہ خیال کرنا ہے۔ ہمارے شہر کے مشہور مناظر مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب بھی (جو فرقہ اہلحدیث کے ایک ممتاز رکن سمجھے جاتے ہیں) اسی عقیدہ کے معتقد اور اسی خیال کے موئید ہیں۔ چنانچہ پچھلے دنوں آپ نے مولانا مولوی احمدالدین صاحب امرتسری کو جو اس عقیدہ کے مخالف ہیں میاں مولابخش صاحب سوداگر صابون کی وساطت سے تقریری بحث کی دعوت دی۔ مولانا احمدالدین صاحب چونکہ نہایت ہی منکسر المزاج اور مرنجان مرنج شخص ہیں۔ بحث و نزاع کو پسند نہیں کرتے تاہم آپ نے مولانا ابوالوفا کے اصرار اور تحقیقِ حق کے خیال سے تحریری مباحثہ منظور کر لیا۔

شرائطِ مناظرہ کے متعلق میاں مولابخش صاحب کے مواجہ میں مولینا ابوالوفا نے تجویز کیا کہ فریقین میں سے جو مدعی ہو وہ چھ پرچے اور جو مجیب ہو پانچ پرچے لکھے اور مباحثہ "حجیت حدیث" پر ہو۔

ظاہراً مدعی خود مولانا ہی تھے لیکن بعد میں جب مولوی احمدالدین صاحب

مدعی قرار پائے تو مدعی کی مزیت (یعنی چھ پرچے لکھنا) تسلیم نہ کی۔ اور فرمایا کہ دونوں فریق پانچ پانچ پرچے لکھیں۔ بہر کیف یہی بات قرار پائی کہ دونوں طرف سے پانچ پانچ پرچے لکھے جائیں گے۔ ہر فریق اپنے مکان سے پرچہ بھیج دیا کرے گا۔ اور ابتدائی پرچہ مولوی احمد الدین صاحب لکھیں گے۔

مولوی احمد الدین صاحب کا مناظرہ پر بہ مجبوری رضامند ہونا۔ اور مولانا ابو الوفا کا باصرار بحث شروع کرنا۔ ذیل کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ جو مولانا (ابو الوفا) موصوف اپنے پہلے پرچے کے آغاز میں تحریر فرماتے ہیں۔ "میرا فرض ہے کہ میں کسی مسلمان کی نسبت منکرِ حدیث ہونا سنوں۔ تو حقِ خدمت ادا کروں۔ اس لئے میں نے آپکے احباب سے کہا تھا کہ باہمی تبادلۂ خیالات ہو جائے۔ مگر انہوں (یعنے آپکے احباب) نے تقریر کی تو کیا بالمشافہ تحریر کی منظوری بھی آپ کی جانب سے نہ دی۔ تو آخر کار میاں مولا بخش صاحب صابون گر کی وساطت سے طے پایا کہ اپنے اپنے مکان سے پرچہ آجایا کرے۔

مولانا ابو الوفا کی اس تحریر میں (منکرِ حدیث) کا لفظ جو مولوی احمد الدین صاحب کی نسبت سے لکھا گیا ہے۔ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ مسئلہ زیر بحث صرف یہ ہے کہ آیا حدیث، قرآن کی طرح حجت ہو سکتی ہے یا نہیں؟ مولانا ثناء اللہ صاحب کا دعویٰ ہے کہ حدیث بھی ویسی ہی حجت ہے جیسا کہ قرآن۔ مولانا احمد الدین صاحب اس کے خلاف یہ کہتے ہیں (جس کی وضاحت انہوں نے اپنے پہلے پرچہ کی ابتداء میں کر دی ہے) کہ علم حق کے دو ذرائع ہیں۔ (۱) وحی (۲) عقل

وحی منزہ عن الخطا ہے اور عقل میں سہو و خطا کا احتمال ہے۔ قرآن مجید وحی ہے اور احادیث بشرطیکہ اصول درائت پر صحیح ثابت ہوں رسول علیہ الصلوۃ والسلام کی بشری عقل کا نتیجہ ہیں۔ جن میں سہو و نسیان کا امکان بھی ہے مولانا ابو الوفاء وحی کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہوئے قرآن حکیم کو وحی جلی اور حدیث نبوی کو وحی خفی قرار دیتے اور اسی بناء پر اسے مماثل قرآن سمجھتے ہیں۔

فریقین مناظرہ کے عقائد کا خلاصہ جو بیان کیا گیا ہے۔ اس کا لحاظ کرتے ہوئے

کیا اِن میں سے ایک فریق دوسرے کو منکرِ حدیث کہنے میں حق بجانب ہو سکتا ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے تو کیا یہ صحیح نہیں کہ مولانا ابوالوفاء نے اپنے مخالف کی نسبت غلط فہمی پھیلانے کی کوشش کی؟ جب تحریری مناظرہ میں یہ حال ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ اگر تقریری مناظرہ کی منظوری دیدی جاتی تو سامعین کے اشتعال کے لئے کیا کیا سامان نہ بہم پہنچائے جاتے۔

مولانا ثناء اللہ صاحب کے الفاظ جو نقل کئے جا چکے ہیں۔ ان سے ظاہر ہے کہ اس مناظرہ کو مولانا ممدوح نے باصرار شروع کیا۔ اس صورت میں ہم اس معمّے کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اور شائد ناظرین بھی ہمارے ہم آہنگ ہو کر قصورِ فہم کا اعتراف کریں کہ شدید ضرورت محسوس کرنے کے باوجود، اپنی قرارداد کے مطابق پانچ پانچ پرچے لکھنے کی بجائے۔ دوسرے ہی پرچے پر بحث کو بند کر دینا کیا معنی رکھتا ہے؟

آپ اپنے دوسرے پرچہ کے آخر میں لکھتے ہیں۔ "اس لئے آخری التماس ہے کہ فریقین کے احباب کا تقاضا ہے کہ ایک روز تھوڑا سا وقت زبانی گفتگو ہو جائے۔ اس گفتگو میں مرقومہ گفتگو سے باہر نہیں جایا جائے گا۔"

آپ کی دو حرفی تحریر گوناں گوں نیرنگیوں کا مجموعہ ہے۔ پہلے خود ہی لکھ چکے ہیں کہ فریق ثانی کے احباب نے بالمشافہ گفتگو کی منظوری نہیں دی مگر اب فرماتے ہیں کہ وہی احباب زبانی گفتگو کا تقاضا کرتے ہیں۔ ع

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

علاوہ ازیں آپ کا یہ لکھنا کہ "ایک روز تھوڑا سا وقت زبانی گفتگو ہو جائے"۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کا اعتراف ہے کہ ہنوز بحث کی ضرورت باقی ہے، بایں ہمہ بحث کو صرف دو پرچے لکھ کر (پانچ پانچ پرچوں کے خلاف) ذاتی اختیار سے موقوف کر دیا گیا، یہ ایسا محیر العقول طرزِ عمل ہے، جس کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ ع

"کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمار"

مزید تعجب یہ ہے کہ آپ اپنے اخبار اہلحدیث مطبوعہ ۲۵ اگست ۱۹۲۲ء میں رقمطراز ہیں کہ آج ۱۶ اگست ۱۹۲۲ء تک ایک پرچہ آیا اور ایک گیا۔ حالانکہ

واقعیت یہ ہے کہ اشاعتِ اخبار سے بہت پہلے یعنی ۱۷ اگست ۱۹۲۲ء کو آپکے پاس دوسرا پرچہ بھی پہنچ چکا تھا۔ اس صورت میں اگر بالفرض آپ ۱۶ اگست کو یہ الفاظ حوالۂ قلم کر بھی چکے تھے۔ تاہم اخبار چھپنے سے پہلے آپ ان میں ہر طرح ترمیم و تنسیخ کر سکتے تھے۔ آپکو لازم تھا کہ اپنے ناظرین کو صحیح اطلاع دینے کے لئے یوں تحریر فرماتے "چنانچہ ۱۷ اگست تک دو پرچے آئے اور ایک گیا" مگر آپ نے دوسرے پرچہ کے آنے سے اپنے قارئین اخبار کو نہ تو اطلاع ہی دی، اور نہ اسے آج تک شائع کیا۔

اس قدر تصریح کے بعد یہ امر بھی ناگزیر ہے کہ فریقین کی تحریروں کے متعلق کسی قدر اظہارِ رائے کیا جائے۔ مباحث علمیہ کے متعلق کوئی قابلِ قدر خیال ظاہر کرنا تو علماء ہی کا حصہ ہے۔ البتہ ہم اپنے فہم ناقص کے مطابق اتنا کہہ سکتے ہیں کہ مولانا ابوالوفاء کا مضمون خود انہیں کے قول کے مطابق ہنوز تشنہ توضیح ہے اور مولوی احمد الدین صاحب نے مولانا کی خاموشی کے بعد ایک مطول پرچہ لکھ کر اپنے استدلال کو مکمل کر دیا ہے لیکن ان کی تحریر میں ادائے مطلب ہی کا زیادہ تر لحاظ رکھا گیا ہے۔ صحتِ زبان اور عبارت آرائی کی جانب قطعاً توجہ نہیں دی گئی اگر حسنِ معنوی کے ساتھ ساتھ حسنِ ظاہری کی بھی رعایت کی جاتی تو مذاقِ ادبیت بھی حلاوت اندوز ہو سکتا۔ اس کے علاوہ بعض دلائل اور حوالے مکرّر سہ کرّر آگئے ہیں اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ مضمون تھوڑا تھوڑا مختلف اوقات میں لکھا گیا ہوگا۔ اور نظر ثانی کی فرصت نہ مل سکی ہوگی۔

مولانا ابوالوفاء نے جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ اس مبحث کو غیر مکمل چھوڑ دیا اور مولانا احمد الدین صاحب نے تیسرا پرچہ بھی نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھ کر مسئلہ زیر بحث کے ہر ایک پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ تیسرا پرچہ اسی لئے لکھا گیا ہے کہ مولانا ابوالوفاء بھی اگر چاہیں تو بحث کو جاری رکھیں۔ سیر کن بحث کی دو ہی صورتیں ہیں۔ تقریری یا تحریری۔ تقریری کے لئے ایک تو کئی مجلسوں کی ضرورت

ہو گی۔ دوسرے متعصب لوگوں کے اشتعال سے فساد کا بھی اندیشہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے سر دست تحریری بحث ہی مناسب سمجھی گئی ہے۔ (خاکسار طغرائی ۸ فروری ۱۹۲۳ء)

اس مناظرے کے خود مولانا ثناءاللہ پر اثرات

یہ تو تھے مبصرین کے تاثرات۔ خود مولانا ابو الوفاء ثناء اللہ کی اس مباحثے کے صرف ایک ایک پرچے کے لکھے جانے کے بعد خواجہ صاحب سے مرعوبیت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اپنے ہفت روزہ اہلِ حدیث میں اس مباحثے کی پہلی قسط کو درج کرتے ہوئے تمام مسلم فرقوں کے علماء سے عموماً اور اہلحدیثوں سے خصوصاً یہ اپیل کی کہ

"دشمن (منکرِ حدیث) کے حملے کو روکنے میں سب فرقے شریک ہوں۔ لیکن اہلحدیث اپنی ذمہ داری کی وجہ سے ان سب میں پیش پیش ہونے چاہئیں یہ میں نے اس لئے کہا ہے کہ جماعت اہلحدیث اپنا فرض محسوس کرے"

اس سے آگے لکھتے ہیں کہ

"جتنے آلاتِ علمی سے حدیث پر حملہ ہو سکتا ہے اس بحث میں وہ سارے آلات استعمال ہوں گے اس لئے ناظرین تک اس حملے کی اطلاع کرنا میرا اسی طرح فرض ہے جس طرح سرحدی افسر کا فرض ہے کہ دشمن کی ہر طرح کی تیاری کی اطلاع مرکزی حکومت کو کرتا رہے تاکہ اس حملے کے دفع کرنے پر تیار ہو سکے۔

میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے محدود علم کی وجہ سے میرا جواب ناکافی ہو گا اس لئے بحکم فَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ (۱۲/۷۶) حضرت علماء سے امید ہے کہ میرے ناقص جوابات کو ناقص پاکر مکمل

جوابات سے مخالف کے حملے کو روک کر اپنا فرض ادا کریں۔

اِطلاع :۔ کوئی صاحب اگر جواب بھیجیں گے تو درج کیا جائے گا۔ انشاء اللہ

(ابوالوفاء) ــــ (ہفت روزہ اہلحدیث امرتسر ۲۵ اگست ۱۹۲۲ء)

اس مباحثہ کے موقعہ پر مولانا کے اس اعتراف عجز کی اہمیت اس لئے اور بڑھ جاتی ہے کہ مولانا نے اپنی تمام عمر کسی بھی مناظرے میں اس طرح کے عجز کا اظہار نہیں کیا جس سے واضح ہے کہ وہ حضرت خواجہ کے آلات علمی سے کسقدر خائف تھے۔ مباحثہ کا چیلنج تو انہوں نے اس لئے دے دیا تھا کہ وہ خواجہ صاحب کے مزاج سے واقف تھے۔ اور انہیں علم تھا کہ خواجہ صاحب اس کے لئے تیار نہیں ہوں گے کیونکہ مسلمانوں کے درمیان باہم مناظروں کو حضرت خواجہ باہمی افتراق کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سوائے اس ایک مباحثے کے خواجہ صاحب کے اور جتنے مباحثے اور مناظرے ہوئے سب غیر مسلموں سے ہوئے۔

دراصل خواجہ صاحب کے ساتھ مولانا ثناء اللہ کے بہت پرانے روابط تھے، انہیں روابط کے زیر اثر انہوں نے ۱۹۰۲ء میں عربی میں تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن لکھی جس میں قرآن کی تفسیر قرآن ہی سے کی گئی ہے (جو خواجہ صاحب کا نقطۂ نظر تھا) لیکن اس تفسیر کے نتیجے میں مولانا پر خود ان کے اہلحدیث بھائیوں نے کفر کے فتوے لگائے اور غزنوی و روپڑی حضرات نے مولانا کے نام میں دم کر دیا۔ بالآخر مولانا کو اس میں شائع کردہ اپنے خیالات سے رجوع کرنا پڑا۔ اور اس کے بعد وہ خواجہ صاحب کے مقابلہ پر کھڑے ہو گئے (ممکن ہے اپنے اہلحدیث بھائیوں کو مزید اطمینان دلانے کیلئے) جسکا نتیجہ زیر نظر تحریری مباحثہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے خواجہ صاحب اور ان کے ہم خیال حضرات پر کبھی کوئی فتویٰ نہیں لگایا بلکہ اس مباحثہ کے بعد مولانا ثناء اللہ نے اپنی صاحبزادی کا نکاح حضرت خواجہ احمد کے ایک مرید خواجہ غلام محمد محقق کے صاحبزادے سے کیا جو خواجہ صاحب کے خیالات کا تھا۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ فی الحقیقت مولانا ان خیالات کو اتنا غلط نہیں سمجھتے تھے جس قدر اپنے ماحول کی مجبوری کے تحت وہ ظاہر کرتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب

باب اوّل

رسول بشر ہوتے ہیں، وحی کے علاوہ ان کے اقوال وافعال بشری عقل و اختیار کی پیداوار ہوتے ہیں۔

سلسلۂ رشد و ہدایت جب سے اس دنیا میں حضرتِ انسان نے قدم رکھا ہے حق تعالیٰ کی طرف سے سلسلۂ رشد و ہدایت چلا آرہا ہے۔ سب سے پہلے انسان خود آدم تھے اور وہی سب سے پہلے نبی بھی تھے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَ نُوۡحًا وَّ اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿ۙ۳۳﴾ (۳۳/۳) بیشک اللہ نے آدمؑ کو، نوحؑ کو، آلِ ابراہیمؑ اور آلِ عمرانؑ کو جہان والوں پر منتخب کرلیا تھا۔

اس آیت سے آدم کا نبی ہونا معلوم ہوتا ہے۔ قصۂ آدم میں جب انسان کو جنت بدر کرکے زمین پر بھیجا گیا تو اسی وقت بتا دیا گیا تھا۔

قُلۡنَا اہۡبِطُوۡا مِنۡہَا جَمِیۡعًا ۚ فَاِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ مِّنِّیۡ ہُدًی فَمَنۡ تَبِعَ ہُدَایَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۳۸﴾ (۳۸/۲) ہم نے کہا، تم سب جنت سے نیچے اتر جاؤ، پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا اُن پر نہ کوئی خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔

چنانچہ رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ پہلے ہی دن سے شروع ہو گیا تھا۔ اس رُشد و ہدایت کو لانے والے انسان ہی ہوا کرتے تھے۔ وہ کبھی مافوق البشر نہیں ہُوئے نہ انہوں نے مافوق البشر ہونے کا کبھی دعویٰ کیا، بلکہ انہوں نے نہایت صفائی کے ساتھ اس کا اعلان کیا کہ ہم بشر اور صرف بشر ہیں۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَمَا كَانَ لَنَا اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ٥ (۱۴/۱۱)

لوگوں سے ان کے رسولوں نے (ہمیشہ) یہی کہا کہ ہم بھی تمہاری طرح انسان ہی ہیں لیکن اللہ جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے احسان کر دیتا ہے (اور اسے وحی کے لئے منتخب کر لیتا ہے) بغیر خدا کے حکم کے ہماری کیا مجال ہے کہ ہم کوئی دلیل لا سکیں اور ایمان والوں کو خدا ہی پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔

خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار یہ اعلان کرایا گیا کہ

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (۱۸/۱۱۰) اے پیغمبر اسلام! کہہ دیجئے کہ میں تمہاری ہی طرح ایک انسان ہوں مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔

بعینہٖ یہی الفاظ سورۂ حٰم سجدہ (۴۱/۶) میں بھی آئے ہیں پھر سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ٥ (۱۷/۹۳)

اے پیغمبر اسلام! آپ کہہ دیجئے کہ میرے پروردگار کی ذات پاک ہے، میں تو محض ایک انسان اور ایک رسول ہوں۔

لیکن انسان کی اعجوبہ پسندی نے کبھی بھی اسے باور نہیں کیا کہ ایک رسول اور نبی بھی انسان ہو سکتا ہے۔ اس کی سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آسکی کہ اس منصب جلیل پر فائز شخصیت بشر ہو سکتی ہے۔ سورۂ انعام میں ہے۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ (۶/۹۱) انہوں نے جب یہ کہا کہ اللہ نے بشر پر کچھ نازل نہیں کیا تو انہوں نے اللہ کی قدرت کا صحیح اندازہ ہی نہیں کیا۔

سورۂ ابراہیم میں ہے

قَالُوْا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (۱۴/۱۰) انہوں نے کہا کہ تم تو ہم ہی جیسے انسان ہو (تم رسول کیسے ہو سکتے ہو؟) تم یہ چاہتے ہو کہ جن معبودوں کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کرتے آئے ہیں اس سے ہمیں روک دو۔

سورۂ انبیاء میں ہے

هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ۔ (۲۱/۳) یہ تمہاری طرح کا ایک آدمی ہی تو ہے۔ کیا تم دانا بینا ہوتے ہوئے اس کی شعبدہ بازی میں آتے ہو؟

سورۂ مؤمنون میں ہے

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۚ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ۔ (۲۳/۲۴) یہ تو تم ہی جیسا ایک انسان ہے تم پر برتری حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اللہ کو بھیجنا ہی ہوتا تو فرشتے بھیجتا۔ ہم نے اپنے پچھلے باپ دادوں میں یہ بات کبھی نہیں سنی (کہ اللہ انسانوں کو بھی رسول بنا کر بھیجتا ہے)

اس سے ذرا آگے ہے

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ (۲۳/۳۳) یہ تو تم جیسا ہی آدمی ہے، جو تم کھاتے ہو وہی یہ کھاتا ہے جو تم پیتے ہو وہی یہ پیتا ہے۔

سورۂ شعراء میں ہے

مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ۔ (۲۶/۱۵۴) تو تو ہماری ہی طرح کا ایک آدمی ہے (تو کیسے رسول ہو سکتا ہے)

اگر تو سچا ہے تو کوئی نشانی لا۔
اس سے ذرا آگے ہے۔

وَمَا اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ۔

(۲۶/۱۸۶) تو تو ہم ہی جیسا ایک انسان ہے۔ ہم تو تجھے بالکل ہی جھوٹا خیال کرتے ہیں۔

سورۂ یٰسٓ میں ہے

قَالُوْا مَا اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَمَا اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ۔ (۳۶/۱۵) انہوں نے کہا کہ تم تو ہماری ہی طرح کے انسان ہو (تم رسول کہاں سے ہو گئے؟) اللہ نے کچھ نازل نہیں کیا تم محض جھوٹ بولتے ہو۔

سورۂ تغابن میں ہے۔

فَقَالُوْا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا (۶۴/۶) تو انہوں نے کہا، کیا ہماری رہنمائی ایک انسان کرے گا؟ چنانچہ انہوں نے انکار کر دیا اور منہ موڑ لیا۔

سورۂ ہود میں ہے

مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ (۱۱/۲۷) ہمیں تو تم اپنے جیسے ایک آدمی ہی نظر آتے ہو۔ تمہاری پیروی بھی انہی لوگوں نے کی ہے جو کھلی آنکھوں ہمارے کمین ہیں اور ہمیں اپنے اوپر تمہاری کوئی برتری بھی نظر نہیں آتی۔

سورۂ بنو اسرائیل میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى اِلَّا اَنْ قَالُوْا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (۱۷/۹۴) اور لوگوں کو جب ان کے

پاس ہدایت آگئی تو ایمان لانے سے صرف اِس چیز نے
روکا کہ انہوں نے کہا، کیا اللہ نے ایک بشر کو رسول بنا کر بھیج دیا
ہے (بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟)

اِن لوگوں کا کہنا یہ تھا

وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝

(۲۳/۳۴) اور اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک آدمی کی اطاعت کر لی تو تم نے
تو اپنا ستیاناس کر لیا۔

ان تمام آیات سے واضح ہے کہ روزِ اوّل سے انسان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ بشر بھی رسالت اور نبوت کے منصب پر فائز ہو سکتا ہے اور اپنے ہی جیسے انسانوں کو رشد و ہدایت عطا کر سکتا ہے۔ قرآنِ کریم نے چونکہ انبیاء اور رسل کی بشریت پر انتہائی زور دیا ہے اس لئے مسلمانوں کے لئے یہ تو ممکن نہیں رہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت سے انکار کر دیں۔ کیونکہ آپؐ کی بشریت کا انکار کرنا قرآن کا انکار کرنا ہو گا۔ جس کے بعد کوئی مسلمان مسلمان ہی نہیں رہ سکتا۔ لیکن جو عجوبہ پسندی دل کی گہرائیوں میں روزِ اوّل سے گھر کر چکی ہے چونکہ وہ نکل نہیں سکی۔ اس لئے لوگ آپ کی بشریت میں بھی طرح طرح کے عجائبات پیدا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اسی کا یہ اثر ہے کہ کبھی فرمودات نبوی کو فرمودات الٰہی ثابت کیا جاتا ہے، کبھی آپ کو وحی کے علاوہ بھی معصوم عن الخطا ثابت کیا جاتا ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ اگر بالفرض کبھی آنحضرتؐ سے کوئی غلطی ہو بھی جاتی تھی تو فوراً حق تعالیٰ کی طرف سے اس کی اصلاح کر دی جاتی تھی۔ آپ کا کوئی اقدام بلا مرضیٔ الٰہی اور غیبی اشارہ کے نہیں ہو سکتا تھا، آپ کی زبان سے نکلا ہوا کوئی لفظ بغیر وحی کے نہیں ہوتا تھا، وغیرہ وغیرہ

ایک آدمی کے متعلق یہ کہنا کہ وہ بشر ہے اور رسول ہے اس کی دلیل ہے کہ اس میں وہ تمام خصائص بتمامہ موجود ہیں جو ایک بشر اور ایک رسول میں

ہونے ضروری ہیں چنانچہ ہر منبر و محراب سے جب کمالات نبوی کا اظہار کیا جاتا ہے تو آپ کو اِنسانِ کامل ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا جاتا ہے۔ لیکن دوسرے لمحے جب عقیدت مندانہ اعجوبہ پسندی کا دورہ پڑتا ہے تو آپ کو تمام بشری خصوصیات سے منزہ اور مبّرا ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی جانے لگتی ہے جو ہماری عقیدتمندی کا ایک تضاد ہے کہ ایک طرف تو آپؐ کو اِنسان کامل بتایا جائے۔ اور دوسری طرف انہیں اتنا عاجز اور ناکارہ ثابت کیا جائے کہ نہ آپ اپنے اختیار و ارادہ کے مالک تھے نہ حریت فکر و نظر کے وارث۔ آپ اپنی مرضی سے ایک قدم نہیں اُٹھا سکتے تھے اور اپنے ارادہ سے ایک لفظ نہیں بول سکتے تھے۔ آپؐ بے جان مشین کا ایک بےجان پُرزہ تھے کہ اپنے انجینئر کے مرضی کے مطابق حرکت کرنے پر مجبور تھے۔ دو سال کے ایک بچّہ کی طرح آپ اس کے محتاج تھے کہ جبریلؑ آپ کی انگلی پکڑ کر چلائیں اور منہ میں اپنے بول ڈالیں۔ آپ کا بس یہ حال تھا ؎

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند ٭ انچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم

ہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مجسمہ تراشا ہے جو اپنے کھڑا کرنے والے کی مرضی کے مطابق جہاں اسے کھڑا کر دیا گیا کھڑا ہے، اسکی اپنی خواہش کوئی ہے ہی نہیں۔ ہم ایک آدمی سے حرکت کرنے کی قوت سلب کر لیتے ہیں اور خوش ہیں کہ وہ بڑا مطیع و فرماں بردار ہے۔ ذرا حرکت نہیں کر رہا ہم اس کی بصارت سلب کر لیتے ہیں اور خوش ہیں کہ بڑا نیک آدمی ہے۔ ہزاروں حسینائیں سامنے سے گذر جاتی ہیں وہ کسی کو بُری نظر سے نہیں دیکھتا۔ ہم اس کی زبان بند کر دیتے ہیں اور نازاں ہیں کہ وہ بڑا صابر ہے کہ کسی کی بدگوئی نہیں کرتا۔ اس کی خواہشاتِ نفس کو چھین لیتے ہیں۔ اور بہت فرحاں ہیں کہ وہ بڑا ہی پارسا ہے کسی کی طرف سے اس کے دل میں بُرا خیال بھی نہیں آتا۔ ہم اس کی سماعت کی صلاحیت ہی ختم کر دیتے ہیں۔ اور فخر کرتے ہیں کہ وہ بڑا ہی پارسا ہے کسی کی بُرائی نہیں سُنتا، ایک پتھر کا

کا مجسمہ ہے جہاں ڈال دیا پڑا ہے۔ نہ اپنی مرضی سے سوچ سکتا ہے نہ اپنی خواہش سے کوئی قدم اُٹھا سکتا ہے نہ اپنی صواب دید سے کوئی فیصلہ کر سکتا ہے نہ اپنی فہم کے مطابق کوئی مشورہ دے سکتا ہے اور اس طرح ہم سمجھتے ہیں کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بلند کر رہے ہیں۔ آپ کی برتری اور فضیلت ثابت کر رہے ہیں۔ ہم اتنا نہیں سمجھتے کہ اس طرح ہم ان کی شان بلند نہیں کرتے بلکہ آپؐ کی شان گھٹانے کے مجرم بن رہے ہیں۔ کیوں کہ

تواضع زگردن فرازاں نکوست ⁂ گدا اگر تواضع کند خوئے اوست

استغفراللہ ثم استغفراللہ۔ فرشتوں میں قدرت الٰہیہ نے گناہ کرنے کی قدرت ہی نہیں رکھی تو گناہ نہ کرنا ان کے لئے کوئی کمال نہیں ہے۔ کمال تو ہم انسانوں کے لئے ہے کہ قدم قدم پر ترغیبات و تحریصات کے جال بچھے ہوئے ہیں اور پھر گناہ نہ کریں۔

درمیان قعرِ دریا تختہ بندم کردہٗ ⁂ باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

یاد رکھئے کہ ایک پیغمبر جہاں رسول ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی وہ بشر بھی ہوتا ہے اور دونوں منصبوں کی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے اِس میں جہاں رسالت کی خصوصیات یعنی دیانت وامانت، جراٴت وہمت، بے کم وکاست پیغام رسانی، صبر وضبط وغیرہ ضروری خصائص ہوتی ہیں وہیں بشری خصوصیات بھی بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہیں، یعنی عقل وشعور، جذبات ومیلانات، بشری احتیاجات، اختیار وارادہ کی آزادی، حریت فکر وعمل، اجتہادی صلاحیت وغیرہ خصائص بھی موجود ہوتے ہیں۔ وہ رسالت اور بشریت دونوں کے خصائص کا جامع ہوتا ہے۔ اس کی ذات میں یہ تمام خصوصیات مجتمع ہو جاتی ہیں۔ یہ خصوصیات کوئی آرائشی کھلونوں (Decoration Peacis) کی طرح محض نمائشی نہیں ہوتیں بلکہ وہ ان تمام خصائص سے اپنے اپنے مقام پر کام بھی لیتا ہے اور پورے توازن کے ساتھ کام لیتا ہے۔ اگر وہ ان صلاحیتوں سے کام ہی نہ لے تو ان

صلاحیتوں کو عطا فرمانے کا کوئی مقصد ہی نہیں رہتا۔ وہ محض کارِ عبث ہوگا جو حق تعالیٰ سے کبھی بھی سرزد نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان دونوں صلاحیتوں کے نتائج یکساں نہیں ہوتے دونوں میں فرق ہوتا ہے۔

اب مثلاً **حق** نام ہے منشائے الٰہی کا۔ کسی مخلوق کا اپنا منشاء، اگر منشائے الٰہی کے مطابق نہ ہو تو وہ نہ حق ہو سکتا ہے نہ اسے حق کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ کیسے معلوم ہو کہ فلاں بات حق ہے اور فلاں بات حق نہیں ہے۔ حق کو دریافت کرنے کے دو ہی طریقے ہیں۔

ایک **وحی الٰہی** ——— دوسرے **عقلی ذرائع**

اور ان دونوں میں تین بڑے بڑے فرق ہیں:

(۱) **اوّل** وحی الٰہی صرف تصرف الٰہی سے ہوتی ہے اس میں کسی انسان کی عقلی اور اختیاری کوششوں کا کوئی دخل نہیں ہوتا، یعنی کوئی شخص اپنی خواہش اور کوشش سے اسے حاصل نہیں کر سکتا۔ وحی کی اطاعت یقیناً اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہوتی ہے ——— اس کے برعکس عقلی ذرائع سے بھی اگرچہ منشائے الٰہی کی پیروی مقصود ہوتی ہے لیکن چونکہ ان میں بشری عقل و اختیار کا دخل ہوتا ہے اس لئے وہ اِن داناؤں کی بھی اطاعت ہوتی ہے جن کی سعی و اجتہاد سے وہ علوم دریافت ہوئے اور وہ معلومات حاصل ہوئیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ تمام کی تمام اطاعت دراصل اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہے۔ مگر وحی کی اطاعت خاص طور پر اللہ کی اطاعت ہے اور جس اطاعت میں بشری عقل و اختیار کا دخل ہوتا ہے صرف وہی اطاعت ٹھیک طور پر بشری اطاعت کہلا سکتی ہے۔

دوم عقلی ذرائع کے ساتھ ہم اللہ تعالیٰ کے کاموں سے قیاس کر کے اس کا منشاء دریافت کرتے ہیں۔ لیکن وحی کے ذریعہ سے خود اللہ تعالیٰ اپنا منشاء ہم کو آپ ہی بتلا دیتا ہے۔ (اور اس لئے ظاہر ہے کہ)

وحی کا حکم یقینی ہوتا ہے ـــــ لیکن عقلی ذرائع سے حاصل کردہ حکم یقینی نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس میں غلطیاں بھی ضرور ممکن ہوتی ہیں۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ کی خاص اور یقینی اطاعت صرف وحی کی اطاعت ہی ہوتی ہے۔

سوم وحی کے ذریعہ سے جو علوم ملتے ہیں وہ ہمیشہ کے لئے صحیح ہوتے ہیں کیونکہ وہ ماکان اور مایکون کے عالم کی طرف سے عطا ہوتے ہیں۔ لیکن بشری عقل چونکہ محدود ہے اس لئے اس کی معلومات وقتاً فوقتاً ادلتی بدلتی رہتی ہیں۔ البتہ ہم بحیثیت مجموعی بہتری کی طرف ترقی کرتے جاتے ہیں۔ عقلی فیصلے مختلف اوقات میں مختلف بھی ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی بے تغیر اطاعت صرف وہی ہو سکتی ہے جو اس کی وحی کی اطاعت ہو۔

اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور مخلوق کی اطاعت ہرگز ہرگز ایک ہی طرح کی نہیں ہوسکتیں۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے والے کے لائق ہے اور مخلوق کی اطاعت وہ ہے جو مخلوق کے لائق ہے۔ اللہ کے رسول بھی مخلوق ہی ہوتے ہیں۔ پس اللہ اور اس کے رسولوں کی اطاعت میں بھی وہی فرق ہونا لازم ہے جو خالق اور مخلوق میں ہونا ضروری ہے۔ جس طرح

اللہ کے غنی کرنے (۹/۷۴) اور رسول کے غنی کرنے (۹/۷۴) میں فرق ہے۔

وَمَا نَقَمُوْا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰھُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ مِنْ فَضْلِہٖ (۹/۷۴) اور ان منافقین نے یہ بدلہ اور انتقام اس احسان کا لیا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے انہیں غنی اور دولت مند کر دیا ہے۔" ظاہر ہے کہ غنی کر دینے کی نسبت اس آیتِ کریمہ میں اللہ اور اس کے رسول دونوں کی طرف کی گئی ہے مگر اس غنی کرنے کی کیفیت جو حق تعالیٰ کی طرف منسوب ہے قطعاً اس سے مختلف ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہے۔ دونوں

نے ایک ہی طرح عنی نہیں کیا ہے۔ اسی طرح اللہ کا شکر کرنے اور ماں باپ کا شکر کرنے میں بھی فرق ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۔ ۔ ۔ ۔ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ۭ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝ (۳۱/۱۴) اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے بارہ میں نصیحت کی۔ اسکی ماں نے ضعف پر ضعف پاکر اسے اٹھائے رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑایا۔ کہ میرا اور اپنے والدین کا شکر ادا کرتے رہو"

شکر ادا کرنا تو دونوں کے لئے ہوگا۔ اللہ کے لئے بھی اور والدین کے لئے بھی۔ لیکن اس شکر ادا کرنے کی کیفیت دونوں صورتوں میں یکساں نہیں ہو سکتی۔ حق تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی کیفیت لازماً وہ نہیں ہوگی جو والدین کا شکر ادا کرنے کی ہوگی۔ نیز سورۂ نساء کے شروع میں اللہ تعالیٰ اور رشتہ داریوں کے سلسلہ میں تقویٰ کا حکم دیا گیا ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَاۗءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ (۴/۱) اور اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دیکر تم باہم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رشتہ داریوں کے حقوق سے ڈرو۔

لیکن اللہ کے سلسلہ میں جو تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ بعینہ وہ تو نہیں ہے جو رشتہ داریوں کے حقوق کے بارہ میں صادر فرمایا گیا ہے، دونوں کی کیفیت میں بڑا فرق ہے اس کے آگے سورۂ مائدہ میں مؤمنوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ۝ (۵/۵۵) بے شک تمہارے مددگار اللہ اور اس کا رسول اور مؤمن لوگ ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ کے سامنے جھکے رہتے ہیں۔

اِس آیت میں مؤمنوں کے مددگار اور کارساز۔ اللہ، اس کے رسول اور جماعت مؤمنین کو بتایا گیا ہے لیکن ان تینوں کی کارسازی اور مدد کی کیفیت ایک سی تو نہیں ہے، جو مدد اور کارسازی کی کیفیت اللہ کی ہے وہ اس کے رسول کی نہیں اور جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد اور کارسازی کی کیفیت ہے وہ جماعت مؤمنین کی مدد اور کارسازی کی نہیں ہے۔ تینوں کی کیفیت میں بڑا فرق ہے۔

بعینہ اسی طرح قرآن کریم نے اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت کا متعدد مقامات پر حکم دیا ہے۔ (۳/۳۲، ۳/۱۳۲، ۴/۵۹، ۵/۹۲، ۸/۱، ۸/۲۰، ۸/۴۶، ۲۴/۵۴، ۴۷/۳۳، ۵۸/۱۳، ۶۴/۱۲) بعض مقامات پر تنہا رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے تو اللہ کی اِطاعت اور رسول کی اطاعت بالکل یکساں تو نہیں ہو سکتی۔ اللہ کی اطاعت کرنے کی جو کیفیت ہوگی وہ لامحالہ رسول کی اِطاعت کی نہیں ہو سکتی۔ دونوں میں یقیناً فرق کرنا ہوگا۔

رسُولِ اکرم کی بشریت

قرآنِ کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کچھ عام انسانوں سے مختلف نہیں تھی۔ جیسے عام انسانوں کی بشریت ہوتی ہے ویسی ہی بشریت آپ کی بھی تھی، سورۂ کہف اور سورۂ حٰمٓ سجدہ میں ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ (۱۸/۱۱۰، ۴۱/۶) اے پیغمبر آپ کہدیجئے کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک اِنسان ہوں۔ میری طرف وحی کی جاتی ہے۔

اِن دونوں آیات میں تصریح ہے کہ آپ کی بشریت ایسی ہی ہے جیسے دوسرے تمام انسانوں کی۔ لہٰذا جیساکہ دوسرے اِنسانوں میں بشری عقل اور بشری اختیار و اِرادہ ہوتا ہے۔ آپ میں بھی بشری عقل اور بشری اختیار و ارادہ موجود تھا۔ پھر سورۂ انعام میں ہے۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَکُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰہِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ

وَلَا اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّىْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَیَّ (۵/۶)

اے پیغمبر! آپ کہدیجئے کہ میں یہ تو نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں، نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں (بشر نہیں ہوں)، میں تو انہی احکام کی پیروی کرتا ہوں۔ جو میری طرف وحی کئے جاتے ہیں۔

اسی طرح سورۂ یونس میں ہے

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَیَّ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّىْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ (۱/۱۵) میں تو انہی احکام کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کئے جاتے ہیں مجھے اندیشہ ہے بڑے دن کے عذاب کا، اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں

لہٰذا جس طرح ہم وحی الٰہی کے محکوم ہیں۔ اور ہمیں اس کی پیروی لازم ہے بعینہٖ اسی طرح آپ بھی وحی الٰہی کے محکوم ہیں اور آپ پر بھی اس کی پیروی لازمی ہے۔ لہٰذا وحی کے محکوم دونوں ہیں۔ اور اس خصوصیت میں بھی آپ کو کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے۔ پھر سورۂ یونس کی آیت کریمہ نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ احکامِ وحی کی نافرمانی سے جیسے عذابِ آخرت کا ہمیں اندیشہ ہے۔ ویسا ہی اندیشہ آپ کو بھی ہے۔ پھر سورۂ زخرف میں ارشاد ہے۔

وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ ۝ (۴۴/۴۳)

اور یقیناً یہ قرآن (اے پیغمبر) آپ کے لئے اور آپ کی قوم کے لئے ایک نصیحت ہے اور تم سب سے اس کی باز پُرس کی جائے گی۔

لہٰذا جس طرح آپ کی قوم، یعنی مخاطبین اپنے عقلی و اختیاری کاموں کے مسئول اور جوابدہ ہیں۔ اسی طرح آپ بھی جوابدہ ہیں جس طرح سب سے باز پرس ہوتی ہے۔ آپ سے بھی باز پُرس ہوتی ہے۔ اس جوابدہی سے کوئی باہر نہیں ہے۔

اِس سے ظاہر ہے کہ آپ کے وہ تمام کام جو عقلی و اختیاری ہوتے تھے اور جو گذشتہ قرآنی تصریحات کے مطابق زیرِ حساب تھے اور جن کے آپ جوابدہ اور مسئول تھے وہ لامحالہ وحی الٰہی تو نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ وحی الٰہی ہوں تو ان کی باز پرس کیسی؟ اور [redacted] زیرِ حساب کیوں ہوں؟

اِس کے علاوہ وقتی امور میں آپ کو حضراتِ صحابہؓ کے ساتھ مشوروں سے پختگی حاصل کرنے کا بھی حکم تھا۔ چنانچہ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (۳/۱۵۹)

اور معاملات میں صحابہؓ سے مشورہ کر لیا کیجئے، پھر جب آپ کوئی پختہ رائے قائم کر لیں تو اللہ پر بھروسہ کیجئے (اور اس پر عمل پیرا ہو جایئے)

ظاہر بات ہے کہ جن وقتی امور کے متعلق آپؐ کو صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ مشوروں کا حکم دیا گیا تھا۔ ان امور کے متعلق آپ کے پاس کوئی وحی نہیں آچکی ہوتی تھی۔ جن امور کے متعلق وحی کے ذریعہ حکم الٰہی آچکا ہو۔ ان میں کسی سے مشورہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہرحال جیسے تمام مسلمانوں کو باہمی مشورہ کا حکم دیا گیا ہے۔

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) مسلمانوں کے معاملات ان کے باہمی مشورہ سے طے ہونے چاہئیں۔

اِسی طرح آپ بھی مشورت کے مامور تھے۔

آپ کے بشری جذبات بھی تھے۔ اور ان جذبات کے ماتحت آپ (وقتی) غلطیاں بھی فرماتے تھے جس پر تادیب اور تنبیہ بھی نازل ہوتی تھی۔ سورۂ توبہ میں ہے۔

عَفَا اللَّهُ عَنكَ لِمَ أَذِنتَ لَهُمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَتَعْلَمَ الْكَاذِبِينَ (۹/۴۳) اے پیغمبرؐ اللہ آپ کو معاف فرمائے (لیکن) تم نے ان منافقین کو جہاد سے رخصت کی

اِجازت کیوں دیدی۔ آپ کو معلوم تو ہو جاتا کہ کون لوگ سچ بول رہے (اور انہیں واقعی کوئی عذر ہے) اور آپ جھوٹوں کو بھی جان لیتے۔

جنگِ تبوک کے موقعہ پر جبکہ نفیرِ عام کا حکم صادر ہو چکا تھا۔ کچھ منافقین نے جھوٹے عذر گھڑ کر آپ سے اجازت چاہی کہ انہیں شرکت سے معاف فرما دیا جائے۔ آپ نے جذباتی رحمدلی اور لطافت سے کام لے کر انہیں معافی دیدی۔ اس پر یہ تادیب و تنبیہ فرمائی گئی تھی۔

آپ کو تاکیدی حکم تھا کہ آپ کسی کام کے متعلق یہ حتمی وعدہ کبھی نہ کریں کہ میں یہ کام کل کر دوں گا۔ آپ کو کیا پتہ کہ وہ کام آپ کل کر سکیں گے یا نہیں، اگر وعدہ ہی کرنا ہو تو اس کے ساتھ اِنْشَاءَ اللّٰہُ ضرور کہدیجئے۔ یعنی بشرطیکہ خُدا نے چاہا۔ چنانچہ سُورۂ کہف میں ہے۔

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ ز وَاذْکُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ وَقُلْ عَسٰٓی اَنْ یَّھْدِیَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ ھٰذَا رَشَدًا ۝ ($\frac{18}{23-24}$) اور آپ کسی چیز کے متعلق یہ ہرگز نہ کہئے کہ میں فلاں کام کل کرنے والا ہوں۔ البتہ یہ کہ خُدا ہی ایسا چاہے۔ اور جب اپنے پروردگار کو بھول جائیں تو اسے یاد کر لیا کیجئے۔ اور کہئے کہ کچھ بعید نہیں۔ خُدا مجھے نیکی کا اس سے قریب تر راستہ دکھا دے۔

لہٰذا جیسے سب مسلمان مامور ہیں کہ آئندہ کے متعلق بغیر اِنْشَاءَ اللّٰہُ کے کہے کوئی حتمی وعدہ نہ کریں۔ آپ بھی اسی حکم کے مامور ہیں کیونکہ علم غیب جیسے عام مُسلمانوں کو نہیں ہے۔ آپ کو بھی نہیں ہے۔

آپؐ کو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ کل کو اس دُنیا میں یا مرنے کے بعد خُدا کے ہاں میرے ساتھ کیا سلوک ہونا ہے۔ آپ کا حال اس بارہ میں بھی عام مسلمانوں سے مختلف نہیں تھا۔ سُورۂ احقاف میں ہے۔

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ (۴۶/۹) (اے پیغمبر!) آپ کہہ دیجئے کہ میں کوئی انوکھا رسول تو ہوں نہیں (جو سب رسولوں کا حال تھا وہی میرا ہے) اور مجھے کچھ پتہ نہیں کہ میرے ساتھ اور تمہارے ساتھ کیا ہونا ہے۔ میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔

لہٰذا مجھے اور تمہیں کس انجام سے دوچار ہونا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں اس آیت کی رو سے جیسے اپنے انجام سے ایک عام آدمی بے خبر ہوتا ہے آپ بھی بے خبر ہی تھے۔

جیسا کہ شیطان عام انسانوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کرتا رہتا ہے۔ وہ آپ کے قلب اطہر میں بھی اسی طرح وسوسہ اندازیاں کرتا رہتا تھا۔ جیسا کہ عام انسان شیطان کی فساد انگیزیوں کی زد میں ہر وقت رہتے ہیں۔ آپ بھی اس سے محفوظ و مصئون نہیں تھے۔ آپ کو حکم دیا گیا تھا کہ جب شیطان کی فساد انگیزی کا کوئی اثر محسوس ہو تو آپ حق تعالیٰ سے پناہ طلب فرما لیا کریں۔ چنانچہ سورۃ اعراف میں ہے۔

وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (۷/۲۰۰) اور اے پیغمبر! اگر شیطان کی طرف سے کسی قسم کی وسوسہ اندازی اور فساد انگیزی کا احساس ہو تو آپ اللہ سے (اس کی) پناہ مانگ لیا کیجئے۔ یقیناً وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

یہی مضمون دوسری جگہ سورۃ المؤمنون میں دوسرے الفاظ کے ساتھ یوں آیا ہے۔

وَقُلْ رَبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ ۝ وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَنْ يَحْضُرُونِ ۝ (۲۳/۹۷-۹۸) اور اے پیغمبر!

اور اے پیغمبر! کہئے کہ اے میرے پروردگار! میں شیطانوں کے وسوسوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور اے میرے پروردگار! میں اس سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ مجھ پر یورش کریں۔

جس طرح عام انسانوں سے لغزشیں ہو جاتی ہیں۔ آپ سے بھی بعض لغزشیں سرزد ہو جاتی تھیں۔ اور آپ کو حکم تھا کہ آپ ان لغزشوں سے استغفار فرماتے رہیں۔ اگرچہ یہ لغزشیں عام لوگوں کی لغزشوں سے اپنی حقیقت میں مختلف ہوتی تھیں کہ عام لوگ تو جان بوجھ کر گناہ کر بیٹھتے ہیں لیکن آپ سے ایسی لغزشیں نہیں ہو سکتی تھیں البتہ نیک نیتی سے اجتہادی غلطیاں ہو جاتی تھیں کیونکہ اعلیٰ درجہ کے مؤمنوں کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ

اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ (۵۳/۳۲)

مومنین وہ ہیں جو بڑے بڑے گناہوں اور کھلے کھلے قبیح افعال سے پرہیز کرتے ہیں اِلّا یہ کہ کچھ قصور ان سے سرزد ہو جائے۔

لیکن حسنات الابرار سیئات المقربین (نیک لوگوں کی نیکیاں بھی بعض اوقات مقرب لوگوں کے لئے برائیاں بن جاتی ہیں) لہٰذا ایک بلند مرتبہ اولوالعزم رسول کے لئے اس قسم کی اجتہادی غلطیاں بھی لغزشیں ہی شمار ہوں گی۔ چنانچہ سورۂ المومن میں ہے۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ (۴۰/۵۵) (تو اے پیغمبر! آپ صبر کیجئے یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اور اپنی لغزش کے لئے استغفار (خدا کی حفاظت طلب) کیجئے۔ اور اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ شام اور صبح کو تسبیح کرتے رہیئے۔

اس ساری تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی بشریت بعینہ ایسی ہی تھی جیسی کہ عام لوگوں کی ہوا کرتی ہے آپ کی ذات والا صفات میں

بھی وہ تمام بشری خصوصیات موجود تھیں جو عام انسانوں میں ہوا کرتی ہیں اور ان کمزوریوں کے باوجود آپ کے قدموں کا کسی موقعہ پر عمداً نہ ڈگمگانے ہی میں آپ کا فضل و کمال مضمر ہے۔ اس ساری تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آپ کی عقلی اور اختیاری باتیں یقیناً ایسی بھی ہوا کرتی تھیں جو بغیر وحی کے ہوتی تھیں اور آپ یقیناً بہت سے امور میں اپنی عقل و اجتہاد اور اہل الرائے کے مشورہ سے بھی کام لیا کرتے تھے۔

عقلی و اختیاری امور کی اہمیت

لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ ایسی عقلی ذرائع والی اطاعت دین میں ضروری نہیں ہے یا یہ کہ اہمیت صرف اسی اطاعت کی ہے جو وحی کے ذریعہ والی ہو۔ ہرگز نہیں۔ دینی معاملات کا انحصار بہت کچھ عقلی ذرائع پر بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان ذی شان،

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) اور مسلمانوں کا

کام باہمی مشورہ کرنا ہے۔

کے مطابق مسلمانوں کو اپنی ضروریات مشوروں سے بھی پوری کرنی چاہئیں۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مشورے فرمانے کا حکم تھا۔ لہٰذا مجلس شوریٰ کے فیصلوں کی مخالفت بھی منشائے الٰہی کے خلاف لینی گناہ ہے۔ اور اس کی متابعت ثواب اور نیکی ہے۔ معروف کاموں میں اولوالامر کی اطاعت کا حکم صراحتہً موجود ہے۔

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ۔ (۴/۵۹)

اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو رسول اور اولوالامر کی۔

اسی طرح اپنے عقل و اختیار سے کوئی بات طے کرنا بھی حق تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ (۲۹/۶۹)

اور جو ہماری راہ میں کوششیں کرتے ہیں۔ ہم انہیں اپنی راہیں دکھا دیتے ہیں۔

لہٰذا دین میں ان تمام مسائل کی بھی اپنی قدر و قیمت ہے جو باہمی مشورہ سے یا عقل و اجتہاد سے طے پا جائیں۔ البتہ یہ فیصلے وحی کی طرح ابدی نہیں ہوتے۔

مُحْرِم (یعنی حاجی جب احرام کی حالت میں ہو تو وہ) اگر کسی خشکی کے جانور کو مار ڈالے تو اس کو اس کا کفارہ دینا واجب ہے۔ اور یہ کفارہ یعنی مقتول جانور کے مثل کا فیصلہ دو عدل والے منصف کریں گے۔ اور ان منصفوں کے فیصلہ کو ماننا اور اس کے مطابق فدیہ ادا کرنا مُحرِم کا دینی فریضہ ہے۔ اور یہ خود قرآنی حکم ہے۔ یہ دو عدل والے منصف جو کچھ فیصلہ کرتے ہیں وہ عقل و اجتہاد ہی سے کرتے ہیں۔ وحی سے تو نہیں کرتے۔

یہی حال میاں بیوی کے تنازعہ کی صورت میں ان کے درمیان صلح کرانے والے

حَکَمًا مِّنْ اَھْلِہٖ وَحَکَمًا مِّنْ اَھْلِھَا (۴/۳۵)

ایک حَکَم شوہر کے خاندان سے اور دوسرا حَکَم بیوی کے خاندان سے

کا بھی ہے کہ یہ دونوں حَکَم اپنے عقل و اجتہاد سے تنازعہ کو حل کر کے اپنی صوابدید کے مطابق دونوں کو صلح کی تجویزیں پیش کریں گے۔ ان کے پاس کوئی وحی کا حکم تو نہیں ہوتا۔ اور میاں بیوی کو ان حکموں کے ساتھ پورا پورا تعاون کرنا ضروری ہے۔ یہ بھی قرآن ہی کا حکم ہے کہ جب دو مسلمان فریقوں میں تنازعہ ہو جائے تو دونوں کے درمیان صلح کرانا ضروری ہے۔ اگر ان میں سے کوئی فریق صلح کا فیصلہ تسلیم کرنے کو تیار نہ ہو تو حکم ہے کہ اسے سزا دو۔

وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَھُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰھُمَا عَلَی الْاُخْرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰہِ (۴۹/۹)

غرض یہ کہ عقل و اجتہاد سے جو فیصلے کئے جائیں ان کو بھی قرآن کریم نے پوری

پوری اہمیت دی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ادنیٰ عدالتوں کے فیصلہ کی اپیل اعلیٰ عدالتوں میں ہو سکتی ہے ـــــــــــ مگر اعلیٰ عدالت کے آخری فیصلہ کو اگر نہ مانا جائے تو فرمائیں کہ کیا کیا جائے۔ اگرچہ اعتقاداً ان فیصلوں کو غلط بھی سمجھا جائے مگر عملاً اسے تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہو سکتا۔ سیشن جج کے فیصلہ کو ہائی کورٹ میں چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ اور ہائی کورٹ کے فیصلہ کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اب سپریم کورٹ کے فیصلہ کو کہیں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ اب اسے ماننا ہی پڑے گا۔ اس سے صاف طور پر کھل جاتا ہے کہ عقلی ذرائع والی اطاعت بھی دین میں ازبس ضروری ہے۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ وحی کی ضرورتوں کے مطابق جس قدر قطعی اور واجب الاتباع وحی درکار تھی وہ کامل واکمل طور پر قرآن مجید میں جمع کر دی گئی ہے۔ باقی ضروریات عقلی ذرائع پر چھوڑ دی گئی ہیں۔ تاکہ عقلی ذرائع اور صحیفۂ فطرت فضول اور نکمے نہ ہو جائیں۔ نہیں نہیں بلکہ ہم وحی کے ماتحت چل کر عقلی ذرائع سے ان لوگوں کی نسبت بہت زیادہ ترقیات کر سکتے ہیں۔ جو محض عقل پر چلتے ہیں۔ پھر جو باتیں قرآن مجید نے عقلی ذرائع پر چھوڑ دی ہیں۔ ان میں رسولِ خدا بھی بشری عقل سے بالضرور کام لیتے تھے۔ اور اجتہاد اور مشورے بھی کرتے تھے۔ پس آپ کی معقول باتوں سے فائدہ نہ اٹھانا صریح ظلم ہے۔ جب کہ قرآن مجید احسن و اہدیٰ بات کی پیروی کی تائید کرتا ہے۔ چنانچہ سورۂ زمر میں ہے۔

الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ (۳۹/۱۸) جو لوگ باتوں کو سنتے ہیں، پھر بہترین بات کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنہیں اللہ نے رہنمائی عطا فرمادی ہے اور یہی لوگ درحقیقت اہل خرد و دانش ہیں۔

اور سورۂ قصص میں ہے۔

قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (۲۸/۴۹) اے پیغمبر! آپ کہدیجئے کہ اللہ کے پاس سے کوئی دوسری

کتاب لے آؤ جو قرآن اور تورات سے زیادہ ہدایت والی ہو تو میں اس کا اتباع کروں گا۔ اگر تم سچے ہو۔

بہرحال قرآن کریم نے بتایا ہے کہ ہر احسن یعنی زیادہ متوازن اور زیادہ بہتر بات اور اہدیٰ یعنی زیادہ ہدایت والی اور رہنمائی کرنے والی بات اس قابل ہے کہ اس کا اتباع کیا جائے تو ظاہر ہے کہ اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عقل واختیار سے اجتہاد فرما کر کوئی بات بتائیں تو اس کے احسن واہدیٰ ہونے میں کیا شک کیا جا سکتا ہے۔ کیا اپنے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی عقل ہی سے مستفید اور مستفیض نہ ہونا صریح کفرانِ نعمت نہیں ہے؟ یاد رکھئے کہ احادیث نبوی بحیثیت معقول اور احسن و اہدیٰ ہونے کے ہماری بھی ہیں اور ہم اُن کی اس حیثیت سے بڑی قدر کرتے ہیں لیکن ہم انہیں بحیثیت وحی کے ماننے سے اختلاف کرتے ہیں۔

ساری بحث کا ماحصل یہ ہے کہ وہ چیز جس میں غلطی کا امکان نہ ہو اور جس میں تغیر و تبدل نہ کیا جا سکتا ہو۔ وہ صرف وحی الٰہی ہی ہو سکتی ہے۔ اور بس۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس وحی الٰہی کی تلاش کے لئے کیا ہمیں دربدر مارے پھرتے رہنا چاہیئے اور کیا اس کی جستجو میں ہمیں کہیں تورات کو، اور کہیں انجیل کو، اور کہیں زبور کو، اور کہیں ملتِ ابراہیمؑ و صحف ابراہیمؑ کو اور کہیں دیگر انبیاء کی کتب کو، اور کہیں ان انبیاء کی حدیثوں کو، اور کہیں بخاری کو، اور کہیں مسلم کو، اور کہیں ابوداؤد کو، اور کہیں ترمذی کو، اور کہیں نسائی کو، اور کہیں ابن ماجہ کو، اور کہیں مؤطا امام مالک کو اور کہیں دوسرے اماموں کی مسندوں، معجموں اور مستدرکوں کو، اور کہیں اسماء الرجال کی ضخیم ضخیم کتابوں کو ڈھونڈتے پھرنا چاہیئے؟ اور پھر باوجود اس کے بھی تمام الٰہی وحیوں کے مل جانے کا کبھی بھی یقین حاصل نہ ہو۔ یا کیا یہ مناسب ہے کہ حق تعالیٰ خود ہی رحم فرما کر ضروری وحیوں کا ایک ہی دستور العمل تیار کر کے ہمیں دے دے۔ جو اکیلا ہی ہمارے لئے کافی ہو اور تمام وحیوں کے تلاش کی تکلیف مالایطاق سے ہمیں نجات دیدے؟

ہمارا ایمان ہے کہ قرآنِ کریم کی صورت میں حق تعالیٰ نے یہ رحمت پورے

طور پر ہم پر نازل فرمادی ہے۔ یہ بات آپ ہی اپنا ثبوت ہے۔ مگر مزید تسلی کے لئے ہم چند اور دلائل بھی پیش کرتے ہیں۔

قرآن کریم کا نظم و ترتیب ہی دلالت کرتا ہے۔ کہ یہ کتاب تمام انبیاء اور حکماء کی کتابوں کا عطر اور مجموعہ ہے چنانچہ قرآن حکیم تمام الٰہی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔

فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ (۲/۹۷) تو یقیناً جبریلؑ نے تو قرآن کو آپ کے قلب پر خدا کے حکم سے نازل کیا ہے یہ قرآن ان تمام کتابوں کی تصدیق کرتا ہے جو اس سے پہلے آچکی ہیں اور مؤمنین کے لئے ہدایت و بشارت ہے۔

اس کے ساتھ ہی پہلے لوگوں کی سنتوں کی ہدایت کرتا ہے اور ان کی پیروی کی تاکید فرماتا ہے۔

وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِ ۚ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَنْ نَشَاءُ ۗ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ۝ وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۚ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ ۖ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَىٰ وَهَارُونَ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَىٰ وَعِيسَىٰ وَإِلْيَاسَ ۖ كُلٌّ مِنَ الصَّالِحِينَ ۝ وَإِسْمَاعِيلَ وَالْيَسَعَ وَيُونُسَ وَلُوطًا ۚ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ وَمِنْ آبَائِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ وَإِخْوَانِهِمْ ۖ وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝ ذَٰلِكَ هُدَى اللَّهِ يَهْدِي بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۚ وَلَوْ أَشْرَكُوا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَإِنْ يَكْفُرْ بِهَا هَٰؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَيْسُوا بِهَا بِكَافِرِينَ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۖ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ ۗ قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْعَالَمِينَ ۝ (۶/۸۳-۹۰)

یہ ہماری دلیل ہے جو ہم نے ابراہیم کو ان کی قوم کے خلاف عطا کی تھی جس کے

درجے ہم چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں۔ بیشک آپ کا پروردگار حکمت اور علم والا ہے۔ اور ہم نے ابراہیم کو اسحٰق اور یعقوب عطا کئے۔ ان سب کو ہم نے ہدایت دی تھی اور ان سے پہلے نوح کو ہدایت عطا فرمائی تھی اور ابراہیم کی اولاد سے (ہم نے ہدایت عطا فرمائی) داؤد کو، سلیمان کو، ایوب کو، یوسف کو، موسیٰ کو، اور ہارون کو، ہم نیکو کاروں کو ایسی ہی جزاء دیا کرتے ہیں۔ اور ذکریا کو، یحییٰ کو، عیسیٰ کو اور الیاس کو، یہ سب کے سب صالح تھے، اور اسماعیل کو، الیسع کو، یونس کو، اور لوط کو ان سب کو ہم نے جہان والوں پر برتری دی تھی اور ان کے آباء سے، اولاد سے اور بھائی بندوں سے، ہم نے انہیں منتخب کیا تھا اور سیدھی راہ کی ہدایت کی تھی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے جس سے اپنے بندوں میں سے جسے چاہے وہ رہنمائی کر دیتا ہے اور اگر وہ (بفرض محال) شرک کرتے تو ان کے سارے اعمال اکارت چلے جاتے یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ہم نے کتاب اور حکومت اور نبوت عطا فرمائی تھی تو اگر اس حقیقت کا یہ (کافر) لوگ انکار کریں تو ہم نے ان پر وہ لوگ (مومنین) مقرر کر دیئے ہیں جو ان کے منکر نہیں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ہم نے ہدایت دی تھی۔ اے پیغمبر! آپ ان کی ہدایت کی پیروی کیجئے۔ اور کہہ دیجئے کہ میں اس پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ یہ تو محض جہان والوں کے لئے ایک یاد دہانی ہے۔

ان آیات کریمہ میں انبیاء سابقین کی ہدایت کی پیروی کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ ان انبیاء سابقین کی ہدایات ہمیں کہاں سے ملیں گی؟ کیا ان حضرات کی کتابیں اور صحیفے آج کہیں موجود ہیں۔ اگر موجود بھی ہیں تو کیا وہ اپنی اصلی حالت پر باقی ہیں؟ ان دونوں باتوں کا جواب نفی میں ہے۔ ان تمام کتابوں اور ان تمام سنتوں کی تصدیق اور ان کی پیروی کی تاکید قرآن کریم انہیں اپنے اندر محفوظ کر کے کرتا ہے۔ سورۂ شوریٰ میں ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوحًا وَالَّذِيْۤ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰۤى اَنْ اَقِيْمُوا

الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ
اِلَيْهِ ؕ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ■

(۴۲/۱۳) خدا نے تمہارے دین کے وہی شرائع مقرر کئے ہیں۔ جن کی اس نے نوحؑ کو وصیت کی تھی اور جو ہم نے (اے پیغمبر اسلام!) آپ کی طرف وحی کئے ہیں۔ اور جو ہم نے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو وصیت فرمائے تھے۔ کہ دین الٰہی کو قائم رکھو اور اس میں باہم اختلاف نہ کرو۔ مشرکین کو یہ بات بڑی گراں گذرتی ہے جس کی طرف آپ انہیں بُلا رہے ہیں۔ اللہ جسے چاہے اپنے پیغام کے لئے منتخب کر لیتا ہے۔ اور جو اس کی طرف رجوع ہوتا ہے اسی کو اپنی طرف ہدایت عطا فرماتا ہے۔

لہٰذا وہ تمام ہدایات جو انبیاء سابقین کو عطا فرمائی گئی تھیں اور جن کی پیروی کی تاکید ہمیں فرمائی گئی ہے۔ وہ سب قرآنِ کریم میں جمع کر دی گئی ہیں۔ ان کا کہیں الگ وجود نہیں ہے۔

حضورؐ کی زندگی کے واقعات

قرآن کریم نے اپنے دفتین میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے تمام ضروری حالات و واقعات اور اقوال و افعال کو شامل کر کے محفوظ کر لیا ہے۔ کیونکہ ان واقعات و حالات اور اقوال و افعال کی ہم سے پیروی کرائی تھی اور ان میں ہمارے لئے کوئی نہ کوئی ہدایت موجود تھی۔ جنگِ بدر، جنگِ احد، غزوۂ احزاب، غزوہ بنو قریظہ و بنو نضیر، جنگِ حنین کے واقعات وغیرہ ان کے واقع ہو جانے کے بعد بھی قرآن حکیم میں لے آنا ضروری سمجھا گیا۔ حالانکہ یہ واقعات جب وقوع پذیر ہو چکے تو تاریخ کا ایک حصہ بن چکے تھے۔ یہ واقعات احادیث کی کتابوں، مغازی اور سیر کی تصنیفات اور تاریخی تالیفات میں تفصیل کے ساتھ آسکتے تھے اور آ گئے تھے۔ لیکن ان کو کافی نہیں سمجھا گیا۔ اسی طرح حضرت زینب بنتِ جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ آپ کے نکاح فرمانے کا واقعہ بھی قرآن میں لانا ضروری سمجھا گیا۔

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْۤ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ

عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ ؕ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝ (۳۳/۳۷) اور یاد کیجئے جب آپ اس شخص (زیدؓ) سے کہہ رہے تھے جس پر آپ نے بھی احسان کیا تھا اور اللہ نے بھی احسان کیا تھا کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس روکے رکھو (اسے طلاق نہ دو) اور اللہ کا خوف کرو (اور اے زیدؓ) تم اپنے دل میں وہ بات چھپا رہے ہو جسے خدا خود ہی ظاہر کر دے گا اور (اے زیدؓ) تم (سچ بات کہتے ہوئے) لوگوں سے ڈر رہے ہو۔ حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اسی سے ڈرو۔ تو جب زیدؓ نے اس سے اپنی حاجت پوری کر لی (اور اسے طلاق دیدی) تو ہم نے اس کا نکاح آپ سے کرا دیا۔ تاکہ منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارہ میں جب وہ ان سے حاجت پوری کر لیں (اور طلاق دے دیں) مومنوں پر کوئی تنگی نہ رہے۔ اور اللہ کا فیصلہ ہو کر ہی رہتا ہے۔

نیز جنگِ احد کے موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کل ایک ہزار مجاہدین تھے۔ اس میں سے عبداللہ ابن ابی ابن سلول منافق کے ساتھ تین سو سوار میدان جنگ سے مدینہ کو لوٹ گئے۔ اور آپ کے ساتھ صرف سات سو مجاہد رہ گئے منافقین کی اس حرکت سے سچے مسلمانوں کے حوصلے بھی پست ہونے لگے تو بعد میں جب یہ سوال سامنے آیا کہ ان منافقوں کے ساتھ جنہوں نے عین وقت پر دھوکہ دیا، کیا سلوک کیا جائے۔ اس بارہ میں صحابہؓ میں دو پارٹیاں ہو گئیں ایک پارٹی کی رائے تھی کہ ان کو سزا دی جائے۔ اور قتل کر دیا جائے۔ دوسری پارٹی کی رائے تھی کہ وہ مسلمان ہیں کلمہ پڑھتے ہیں، ہمارے ساتھ نمازیں پڑھتے ہیں ان کی اس غلطی کو معاف کر دیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی پارٹی کے ہم خیال تھے جو معافی دینے کے حق میں تھی۔ قرآن کریم نے اس واقعہ کو بھی اپنے اندر محفوظ کر لیا ہے۔ چنانچہ سورۂ نساء میں ہے۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝ (۴/۸۸) مسلمانو! تمہیں کیا ہوگیا کہ منافقین کے بارے میں تمہارے دو گروہ بن گئے۔ اللہ نے تو منافقوں کو ان کے اعمالِ بد کے سبب اوندھا کر دیا تھا۔ کیا تم چاہتے ہو کہ انہیں حق کی راہ دکھا دو جنہیں اللہ نے گمراہ کر دیا ہے۔ (یاد رکھو) جنہیں اللہ ہی گمراہ کر دے تو ان کے لئے (اے پیغمبر!) کوئی راہ نہیں پا سکے گا۔

اس واقعہ کا تذکرہ اس کے وقوع پذیر ہو چکنے کے بعد قرآن کریم میں لے آنا ضروری قرار پایا۔ علاوہ ازیں تقسیم میراث، نکاح و طلاق، حلال و حرام عورتیں، حرام و حلال مطعومات غسل، وضو اور دیگر روزمرہ کی ضروریات کا جو بالیقین پہلے بھی کسی نہ کسی رنگ میں عمل میں آتی رہتی تھیں۔ ان سب کا بیان قرآن میں داخل کرنا لازم سمجھا گیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر بار اور ازواج مطہرات کے حالات تک بھی قرآن میں لائے گئے۔ یہ سب کچھ کس لئے کیا گیا؟ کیا احادیث نبوی کا استقلال قائم رکھنے کے لئے؟ اگر احادیث نبوی حفاظت الٰہی میں رکھنے کے قابل مستقل اصول سمجھی جاتیں تو یہ باتیں ان احادیث میں رہکر بھی قابلِ سند ہو سکتی تھیں (اور) ان کو قرآن کریم میں لانے کی کوئی مزید ضرورت نہ تھی۔

کیا وحی الٰہی اور عقل انسانی ایک ہو سکتی ہیں؟

یقیناً اگر حق تعالیٰ کسی دانا آدمی کی بات کی تصدیق و توثیق فرمادیں تو بعد از تصدیق الٰہی وہ شامل وحی ہو جاتی ہے لیکن قبل از تصدیق الٰہی عقلی متابعت کے ہی لائق رہتی ہے۔ عقلی متابعت بھی جیسا کہ اس کا حق ہے ضروری ہے۔ اس اطاعت کے بغیر دنیا کا کاروبار نہیں چل سکتا۔ اگر اس اطاعت سے انکار کر دیا جائے۔ تو دنیا آج ہی تہ و بالا ہو جائے۔ ماں باپ کی اطاعت، استاد کی اطاعت، حکام کی اطاعت، بادشاہ کی اطاعت، شوریٰ کی اطاعت، منصفوں اور

حکموں کی اطاعت، سب عقلی طریق سے فرض ہیں۔ مگر اس سے وہ وحی الٰہی نہیں بن جاتی ہیں۔

واضح رہے کہ حق تعالیٰ اگر اپنے تصرف سے بذریعہ کسی مخلوق کے اپنا کوئی حکم ہم تک پہنچا دے تو وہ حکم اللہ کا ہی ہوتا ہے درمیانی واسطے اور ذریعہ کا یعنی پیغام لانے والے کا حکم نہیں بن جاتا جیسا کہ ارشاد ہے:

قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ یَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ۔ (۶/۵۷)

اے پیغمبر! کہدیجئے میں اپنے رب کی طرف سے کھلی دلیل پر قائم ہوں لیکن تم نے اسے جھٹلا دیا۔ جس چیز کی تم جلدی مچا رہے ہو وہ میرے پاس تو ہے نہیں۔ حکم تو اللہ ہی کا ہے۔ وہی حق بات بیان کرتا ہے۔ اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

اور ارشاد ہے:

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ۔

(۱۲/۴۰) جن کی خدا کے سوا تم پرستش کرتے ہو وہ محض نام ہی نام ہیں۔ جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے کوئی دلیل نہیں اتاری حکم تو اللہ ہی کا ہے۔ اس نے یہی حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو یہی استوار دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔

مستزید ارشاد ہے:

مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ ز وَّلَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا۔

(۱۸/۲۶) ان کا اس کے سوا کوئی کارساز نہیں اور وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ بہرحال وحی کا حکم خدا ہی کا حکم ہوتا ہے۔ جبریلؑ یا اسکے رسول کا حکم نہیں ہوتا۔ جن کے ذریعے سے حق تعالیٰ نے وہ وحی ہم تک پہنچائی ہے۔ البتہ مجازی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍ (۶۹/۴۰) یقیناً قرآن ایک بزرگ رسول کا قول ہے۔

رسول اس صورت میں آلۂ ابلاغ اور ذریعۂ تبلیغ ہوتا ہے اور آلہ یا واسطہ کی ظاہری

اطاعت حقیقت کے لحاظ سے اللہ ہی کی اطاعت ہوتی ہے۔

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (۴/۸۰) جو رسول کی اطاعت کرتا ہے، وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔

یاد رہے کہ ایلچی اپنے بادشاہ ہی کا پیغام لاتا ہے۔ جو بات پیغام میں نہ ہو اور ایلچی اپنے فہم سے نکال کر پیش کرے وہ عقل و فہم ہی کہلاتی ہے نہ کہ عین پیغام اور بشرط مطابقت پیغام مانی جاتی ہے۔ اور بصورت مخالفت قابلِ رد ہوتی ہے مگر بصورت زیادت صرف ایلچی کی عقل ہی قرار پاتی ہے — بیشک بادشاہ ایلچی کو یہ حکم بھی دے سکتا ہے کہ اگر میرے پیغام میں تجھے کوئی شک رہ جائے۔ تو اہل کتاب سے پوچھ لینا۔

فَاِنْ كُنْتَ فِیْ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ فَسْــٴَـلِ الَّذِیْنَ یَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ۝ (۱۰/۹۴) تو اے پیغمبر! اگر تمہیں اس کتاب کے متعلق جو ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے کوئی شک ہو تو آپ ان لوگوں سے پوچھیے جو آپ سے پہلے خدا کی کتاب پڑھتے رہتے ہیں۔ یقیناً آپ کے پاس آپ کے پروردگار کی طرف سے حق ہی آیا ہے لہٰذا آپ شک و شبہ کرنیوالوں میں سے نہ بنیئے۔

اگر کسی بات کا علم نہ ہو تو اہلِ ذکر سے سوال کرنا۔

فَسْــٴَـلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۶/۴۳) اگر تم نہ جانتے ہو تو اہلِ ذکر سے پوچھ لو۔

اہل الرائے لوگوں سے مشورہ بھی کر لینا

وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (۳/۱۵۹) اور ان سے مشورہ کر لیا کرو۔ تو جب آپ مشورہ کر کے بات طے کر چکیں تو اس کے بعد اللہ پر بھروسہ کیجئے۔

اور جو لوگ تمہارے تابعدار ہیں۔ انہیں بھی ایسا ہی کرنا چاہیئے۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَیْنَهُمْ ۝ (۴۲/۳۸) اور مسلمانوں کے تمام معاملات باہمی مشورے سے طے ہونے چاہیئں۔

تو اس سے یہ تمام باتیں اپنے عقلی درجہ سے نکل کر وحی الٰہی کا درجہ نہیں پا لیں گی۔ اس عقلی تحقیق و تدبر میں وہ ایلچی اور اس کے پیرو ایک ہی کیفیت کے ہوں گے۔

بہر حال وحی الٰہی حاکم ہے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جملہ مومنین اپنے اپنے بشری اور محدود فہم و اختیار کے مطابق اس کے محکوم اور مطیع ہیں۔ اور یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ وحی الٰہی جو حاکم ہے وہ اور چیز ہے اور انسانوں کی بشری اور محدود عقل و اختیار والی متابعت چیزے دیگر ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ عقلی اور اختیاری اطاعت میں بشری کمزوریوں کا بھی دخل ہوتا ہے۔

یہ وحی جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں چونکہ وہ اختیار انسانی کے کسی ادنیٰ شائبہ کے بغیر صرف تصرف الٰہی سے ہی ہوتی ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ وحی پانے والا انسان اس وقت "معمول" کی حالت میں ہو۔ اور اس کا اپنا اختیار و ارادہ اس وقت بالکل جاتا رہے اور قطعاً معطل ہو جائے تاکہ اس وحی میں ان جذبات کے کسی رنگ کی بالکل آمیزش نہ ہونے پائے جو انسانی اختیار و ارادہ کا تقاضا ہیں۔ یہ حالت دیکھنے والوں کو بھی نظر آ سکتی ہے۔ چنانچہ قرآنی نزول کی حالت کو صحابہ بھی دیکھتے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۝ (۵/۱۰۱)

"اے پیروانِ دعوت ایمانی! ـــــــ ان باتوں کے متعلق سوال نہ کیا کرو، جو اگر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں دکھ میں ڈالدیں اور اگر ان کا اس وقت سوال کرو گے جس وقت قرآن مجید نازل کیا جا رہا ہو تو وہ تم پر کھول دی جائیں گی۔ اللہ نے اُن سے درگذر کیا ہوا ہے۔ اور اللہ غفور و حلیم ہے۔"

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وحی کی حالت ایک خاص طرح کی ہوتی تھی جو لوگوں پر واضح ہوتی تھی۔ حق تعالیٰ نے اس حالت کی خصوصیت صرف قرآن مجید کے ساتھ دکھائی ہے۔ لیکن حدیثوں کے بیان کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عام بشری

[illegible]

ایک مغالطہ اور اس کا جواب

علمائے حدیث کی طرف سے اکثر یہ پیش کیا جاتا ہے کہ ہم تو حدیث نبوی کے متعلق وحی کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس کا اظہار امام شافعی نے کیا ہے کہ

كُلُّ مَا حَكَمَ بِهِ رَسُولُ اللّٰهِ فَهُوَ مِمَّا فَهِمَهُ مِنَ الْقُرْآنِ

(اتقان سیوطی) یعنی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے جتنے احکام ارشاد فرمائے ہیں وہ سب کے سب وہ ہیں جو آپ نے خود قرآن مجید سے سمجھے ہیں۔

جس کو حافظ ابن القیم مرحوم نے زاد المعاد میں مفصل بیان کیا ہے۔ اس عقیدہ کا ثبوت قرآن مجید سے ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کا بیان کرنا اپنے ذمہ لیا ہے

عہ قوسین کے درمیان والی عبارت مشہور اہلحدیث عالم مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم کی ہے۔

ارشاد ہے:۔

اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَ قُرْاٰنَہٗ ۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ (۷۵/۱۸-۱۹)

یقیناً قرآن کو جمع کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔ پھر بیشک اس کا بیان بھی ہماری ذمہ داری ہے۔

لیکن اسی فرض الٰہی کو دوسرے مقام پر یوں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَ اَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ وَ لَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ ۝ (۱۶/۴۴) ہم نے آپ کی طرف یہ ذکر (قرآن) اس لئے نازل کیا ہے کہ آپ لوگوں کے لئے وہ باتیں بیان کر دیں جو ان کی طرف نازل کی گئی ہیں۔ شاید وہ غور و فکر سے کام لیں۔

یہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ قرآن کا بیان کرنا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض قرار دیا گیا ہے اور سابقہ آیت (۷۵/۱۹) نے اس بیان کو فرض الٰہی بتایا ہے۔ ان دونوں آیتوں کے ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن کو بیان کرنا کسی عالم یا مجتہد کے بیان کی مثل نہیں ہے۔ بلکہ یہ بیان، بیان الٰہی ہے اس کی مثال آجکل کی اصطلاح میں یوں ملتی ہے کہ قانون سازی لیجسلیٹو کونسل کا کام ہے۔ ہائی کورٹ کا کام قانون سازی نہیں بلکہ قانون کی تشریح اور تفسیر ہے۔ مگر جس قانونی دفعہ پر ہائی کورٹ کسی صورت میں فیصلہ کر دے اور اس کی جو توضیح و تشریح کر دے تو تمام صوبہ کے لئے وہ فیصلہ یا وہ تشریح و توضیح مثل قانون کے نافذ ہوتی ہے اور اگر پریوی کونسل کے جج کسی جانب رائے قائم کر دیں تو سارے ملک محروسہ کے لئے وہ حجت ہو جاتا ہے حالانکہ وہ فیصلہ قانون نہیں بلکہ قانون کی تشریح اور حسب قانون فیصلہ ہے۔ ٹھیک اسی طرح پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو قرآن مجید کے ساتھ خاص نسبت ہے۔ اسی لئے حدیث نبوی کے احکام کو خدا تعالیٰ نے احکام الٰہیہ میں شمار کیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ قِیْلَ لَھُمْ کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (۴/۷۷)

اے نبی! آپ نے ان لوگوں کو دیکھا جن کو کہا گیا کہ جنگ سے ہاتھ بند رکھو اور نماز پڑھتے رہو۔

اس آیت میں جو کُفُّوۡا اَیۡدِیَکُمۡ کا حکم ہے۔ وہ قرآنی احکام میں نہیں ملتا پھر اس حکم کو واجب الاتباع قرار دیکر الزام کیوں لگایا گیا؟ اس کا جواب یہی ہے کہ وہ زبانِ نبوت کا ارشاد تھا جو حکم الٰہی کے برابر قرار دیا گیا۔ واللہ اعلم

دوسری مثال اس کی یہ آیت ہے۔

مَا جَعَلۡنَا الۡقِبۡلَةَ الَّتِیۡ كُنۡتَ عَلَيۡهَا۔ (۲/۱۴۳)

جس قبلہ بیت المقدس پر تو اے نبی تھا، ہم نے اس کو اس لئے مقرر کیا تھا کہ تابعین کو غیر تابعین سے جدا کر دیں۔

اس آیت میں جَعَلۡنَا کا مفعول بہ القبلۃ کو بتایا ہے اور اس جَعَلَ کو فعل الٰہی بتایا ہے حالانکہ کسی کو بھی قرآن مجید میں تلاش کرنے سے کوئی ایسا فقرہ نہیں مل سکتا جس میں یہ حکم ہو کہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو، جس سے اس حکایت کا محکی منہ مل سکے۔ آپ قرآن مجید میں ان احکام کی تلاش میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔"

اس سارے اقتباس کا حاصل یہ ہوا کہ حق تعالیٰ نے سورۃ القیامہ میں یہ بتایا تھا کہ قرآن کریم کو پڑھوانا اور اس کی تفسیر بیان کرنا ہمارے ذمہ ہے۔ لیکن سورۃ نحل میں یہ فرمایا ہے کہ "ہم نے یہ ذکر یعنی قرآن اے نبی آپ کی طرف اس لئے اتارا ہے تاکہ آپ لوگوں کے لئے وہ، جو ان کی طرف اتارا گیا ہے بیان کر دیں۔ تاکہ وہ اس میں تفکر کریں"۔ (۱۶/۴۴) اور ہمارے محترم علمائے حدیث فوراً اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ خدائی بیان و تفسیر اور رسولی تبیین ایک ہی چیز ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے خالق و مخلوق اور وحی و عقل کے درمیان جو فرق ہے ہم نے تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔ وہاں ہم نے کہہ دیا کہ خدائی تفسیر وہ ہے جو خود قرآن کریم میں موجود ہے اور جس کی وجہ سے قرآن کریم کو آہستہ آہستہ اتارنا ضروری قرار دیا گیا۔ تاکہ وہ تفسیر خود قرآن ہی میں آجائے۔

وَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَوۡلَا نُزِّلَ عَلَیۡہِ الۡقُرۡاٰنُ جُمۡلَۃً وَّاحِدَۃً ۚۛ کَذٰلِکَ ۚۛ لِنُثَبِّتَ بِہٖ فُؤَادَکَ وَ رَتَّلۡنٰہُ تَرۡتِیۡلًا ﴿۰﴾ وَ لَا یَاۡتُوۡنَکَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئۡنٰکَ بِالۡحَقِّ وَ اَحۡسَنَ تَفۡسِیۡرًا ﴿۰﴾ (۲۵ / ۳۲-۳۳) اور جن لوگوں نے قرآن کا انکار کر دیا ہے انہوں نے کہا کہ محمدؐ پر قرآن پورا ایک ساتھ کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ (آپ ان سے کہدیجئے کہ) اسی طرح (آہستہ آہستہ) نازل کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے ہم آپ کے دل کو مضبوط کریں اور ہم نے (اسی لئے) اسے آہستہ آہستہ ہی پڑھ کر سنایا ہے اور اس طرح قرآن کریم کی بہترین تفسیر و توجیہہ بھی لے آتے ہیں۔

کفّار کے اس اعتراض پر کہ یہ قرآن اس رسولؐ پر سارے کا سارا ایک ہی دفعہ کیوں نہ اتارا گیا؟ اللہ تعالےٰ نے اس اعتراض کے تین جواب دیئے ہیں اور تینوں جوابوں کی ایک ہی نوعیت ہے۔ اور وہ جواب یہ ہیں کہ قرآن کریم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اثبات قلب، معترضین کے اعتراضوں کے جوابات، اور قرآن کی تفسیر کیلئے آہستہ آہستہ اتارا جارہا ہے (۲۵ / ۳۲-۳۳)

اب یہ بات سورج کی طرح روشن ہے کہ (۱) جو تسلّی اور ثبات قلب وحی الٰہی سے حاصل ہوسکتی ہے وہ محض عقل سے نہیں مل سکتی اور (۲) جس اعتراض کا جواب عقل سے حاصل کیا جائے وہ ویسا تسلی بخش نہیں ہوسکتا جیسے کہ وہ جواب جو وحی الٰہی سے ملتا ہے اور (۳) اسی طرح محض عقلی تفسیر و تشریح کو وہ درجہ نہیں دیا جاسکتا جو خود حق تعالیٰ کی تفسیر و تشریح اور بیان کا ہونا چاہیئے۔ اہل حدیث علمائے کرام بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ثبات قلب اور کفار کے سوالوں کے جوابات اور تفسیر و بیان قرآن بذریعہ وحی ہی کے حاصل ہوتے تھے۔ فرق صرف اسقدر ہے کہ ہمارے نزدیک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام وحی قرآن مجید میں موجود ہے لیکن اہل حدیث حضرات کے نزدیک آپؐ کی بہت سی وحی، قرآن مجید سے باہر بھی ہے۔ اور یہ بات بالکل

واضح ہے کہ اگر قرآن مجید آپ کی تمام یعنی پوری وحی نہیں ہے بلکہ وحی کا صرف ایک حصہ ہے تو قرآن مجید کے یک لخت نازل ہو جانے سے باقی وحی کے لئے پیچھے آنے کا بھی موقعہ مل سکتا ہے۔ اور وہ تینوں مقصد جو قرآن کو آہستہ آہستہ نازل کرنے سے حاصل ہونے تھے۔ اب بھی وحی کے اس دوسرے حصہ (یعنی احادیث نبوی) سے حاصل کئے جا سکتے تھے۔

لہٰذا قرآنِ کریم کا وہ جواب جو اس نے کفار کے مقابلہ میں دیا تھا غلط ہو جاتا ہے۔ اہلِ حدیث حضرات کے قول کے مطابق وحی الٰہی کے دو حصے تھے۔ ایک حصہ قرآنِ کریم میں آگیا۔ دوسرا حصہ احادیث نبوی کے ذیل میں آرہا ہے۔ کفار کا یہ اعتراض تھا کہ قرآنِ کریم یکبارگی پورا کا پورا کیوں نازل نہیں کر دیا گیا۔ قرآن نے اس کے جواب میں کہا کہ اس کی تین اہم وجوہ ہیں۔ جن کی وجہ سے ہم نے اسے یکبارگی اکٹھا نازل نہیں کر دیا۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ پیغمبر خدا کے دل کو وحی کے ذریعہ سے ثبات حاصل ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ معترضین کے اعتراضات کے جوابات ساتھ ساتھ دیئے جا سکیں۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی تفسیر و تشریح ہوتی جائے۔ تو اگر قرآن سے باہر بھی وحی کا ایک حصہ (یعنی ارشادات نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام) موجود تھا جو آہستہ آہستہ آتا تھا، اور جو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی پر پھیلا ہوا تھا تو وہ تینوں فائدے جو قرآن نے بیان کئے ہیں۔ اس دوسری قسم کی وحی سے کیوں نہ حاصل کر لئے گئے۔ اس میں کونسی مشکل حائل تھی کہ قرآن کریم پورا کا پورا ایک مرتبہ نازل کر دیا جاتا اور دوسری قسم کی وحی بعد میں آتی رہتی۔ اور اس کے ذریعہ سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر کو ثبات حاصل ہوتا رہتا اور معترضین کے جواب بھی دیئے جاتے۔ اور قرآنِ کریم کی تفسیر و تشریح بھی ہوتی جاتی۔

ناظرین غور فرمائیں کہ احادیث نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وحی نہ ہونے پر یہ کیسی زبردست دلیل ہے کہ اگر اس وحی کے علاوہ جو قرآنِ کریم میں لائی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور بھی وحی ہوا

کرتی تھی تو وہ وحی قرآنِ کریم کو یک لخت نازل کر دینے کے بعد بھی اسی طرح برابر آہستہ آہستہ دی جا سکتی تھی۔ (بلکہ بقول اہلحدیث دی گئی ہے)۔ اس کے آہستہ آہستہ لانے پر کفار کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ہاں اگر کفار اس دوسری وحی پر بھی اعتراض کرتے تو اس وقت اس کے متعلق اس آیت (۲۵/۳۲-۳۳) والا جواب دینا بالکل صحیح ہوتا۔ کیونکہ اس کے بعد وحی کی کوئی تیسری قسم تو موجود نہیں تھی۔ لیکن اس حالت میں جبکہ دوسری قسم کی وحی پر کفار کو کوئی اعتراض ہی نہیں تھا ایسا جواب دینا ہرگز ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا جبکہ بقول حضرات علمائے حدیث دوسری وحی ان کاموں کے لئے موجود تھی۔

اگر حدیثوں کو بھی وحی مانا جائے تو کفّار کا اعتراض بالکل حق بجانب ٹھہرتا ہے کہ جب ان امور کے لئے ایک دوسری وحی موجود ہے تو پھر قرآن کو یکبارگی کیوں نہیں نازل کر دیا جاتا۔ اور حق تعالیٰ کے جوابات غلط ہو جاتے ہیں معاذ اللہ (کہ قرآن کے سوا وحی کا دوسرا طریقہ موجود ہوتے ہوئے مہمل جواب دیا جاتا ہے) اس سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دیگر ایسی باتوں (غیر قرآن) کے وحی ہونے کو ماننا سراسر باطل ہے۔

بہر حال اس سے معلوم ہو گیا کہ حق تعالیٰ کا بیان قرآن اور تفسیر و تشریح خود قرآن ہی میں موجود ہے اور خارج از قرآن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان و تبیین یا تفسیر و تشریح، الٰہی بیان سے الگ چیز ہے۔ دونوں کو ایک کر دینا غلط ہے۔

تبیین کے دو معنے

تبیین کے معنے جہاں تشریح و تفسیر کے آتے ہیں۔ وہیں اس کے دوسرے معنے یہ بھی ہیں کہ جو بات مجھے معلوم ہو گئی ہے۔ میں اسے لوگوں پر من و عن، بے کم و کاست ظاہر کر دوں جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ (۳/۱۸۷) اور یاد کرو جب اللہ نے ان لوگوں سے جنہیں کتاب دی گئی تھی یہ عہد لیا تھا کہ تم اسے لوگوں کے سامنے ضرور

بیان (ظاہر) کرو گے اور اسے چھپاؤ گے نہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ ان اہلِ کتاب کو جن پر وحی نازل نہیں ہوتی تھی، تاکیدی حکم دیتا ہے کہ کتاب اللہ کو لوگوں سے ہرگز نہ چھپانا، کہ کہیں خود کو مذہبی ٹھیکیدار سمجھ کر صرف اپنے مخصوص حلقے تک اسے محدود رکھو۔ اور عوام تک اسے نہ پہونچنے دو ــــ بلکہ لوگون پر اسے ضرور ظاہر کرنا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ (۱۶/۴۴) میں اپنے رسولِ پاک کو فرماتا ہے۔

وَ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔ اے پیغمبر! ہم نے آپ پر اس ذکر (قرآن) کو اس لئے نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کے سامنے جو کچھ ان کی طرف نازل کیا گیا ہے۔ اسے ظاہر کر دیں (اسے چھپائیں نہیں) شاید وہ غور و فکر کریں۔

مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن ہم نے تیرے دل (قلب) پر اس لئے نہیں اُتارا کہ تو اسے اپنے پاس ہی چھپائے رکھے اور لوگوں کو نہ سنائے یہ قرآن صرف اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ (ہم نے تم پر نازل کیا) ہی نہیں ہے۔ بلکہ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (جو ان پر نازل کیا گیا) کے مطابق تمام لوگوں کے لئے بھی ہے۔ پس یہ قرآن تجھ پر اِسلئے اُتارا گیا ہے کہ چونکہ یہ ان کی (یعنی لوگوں کی) طرف بھی اُتارا گیا ہے تو تُو ان پر ظاہر کر دے۔ حق تعالیٰ نے یہاں لِتُبَيِّنَنَّهٗ لِلنَّاسِ کے مختصر الفاظ نہیں بولے بلکہ ایسے الفاظ لائے گئے ہیں، تاکہ ظاہر کرنے کی وجہ بھی ساتھ ہی آجائے۔ لہٰذا لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ فرمایا۔ یہ دلیل تبیین کے مذکورہ بالا (ظاہر کرنیکے) معنے کی ہی تاکید کرتی ہے۔ باقی رہی غور و فکر اور تدبر والی تشریح و تفسیر تو وہ تو حسب الحکم قرآن کریم تمام لوگوں کا حق ہے جس میں رسول اور غیر رسول سب شامل ہیں۔ اس لئے اسی آیت میں ساتھ ہی فرما دیا کہ تفکر خود ان تمام لوگوں کا فرض ہے وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۱۶/۴۴)

بہر حال یہ بات بالکل واضح ہے کہ قرآن مجید رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم

کے قلب اطہر پر حضورؐ کی ذاتی ملکیت کے طور پر نازل نہیں ہوا کرتا تھا کہ اگر آپ چاہیں تو کوئی بات کسی کو پہنچا دیں۔ ورنہ اپنے پاس ہی روک رکھیں۔ نہیں نہیں بلکہ قرآن کریم اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اور واسطہ سے آیا ہے۔ مگر تمام جہان کی طرف اتارا گیا ہے اور اس پر سب کا یکساں حق ہے۔

چونکہ قرآنِ حکیم سب لوگوں کے لئے یکساں عطیۂ الٰہی اور خوانِ یغما ہے۔ اسلئے رسولِ کریم پر نہایت سختی کیساتھ لازم کیا گیا تھا کہ اس کا لوگوں پر بھی اظہار کر دیں قرآن مجید میں اس کی بار بار تاکید آئی ہے۔ کہیں فرمایا ہے کہ:۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (۵/۶۷)

اے رسول! جو کچھ آپ کی طرف آپ کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اسے آپ (لوگوں تک) پہنچا دیجئے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے پیغام رسانی (رسالت) کی تبلیغ نہیں فرمائی (آپ لوگوں سے نہ ڈریئے) اور اللہ آپ کو لوگوں (کے شر) سے محفوظ رکھے گا۔

اور کہیں ارشاد کیا ہے:۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (۱۵/۹۴) تو جو کچھ (اے رسول!) آپ کو حکم دیا جاتا ہے اسے کھول کر (واشگاف کر کے) سنا دیجئے۔

اور سینکڑوں مرتبہ حکم دیا گیا ہے۔ ذَكِّرْ (یاد دلا دیجئے) اُذْكُرْ (ذکر کر دیجئے) بَشِّرْ (بشارت دے دیجئے) أَنذِرْ (بد اعمالی کے نتائج سے ڈرا دیجئے) قُلْ (کہہ دیجئے) فَاحْكُمْ (تو فیصلہ کر دیجئے۔ حکم کر دیجئے) اور نَبِّئْهُمْ (انہیں خبردار کر دیجئے) وغیرہ وغیرہ —— ان تمام تاکیدوں سے اظہار کے سوا، تفسیر و تشریح کے معنے کبھی نہیں لئے گئے۔ لیکن ایک دفعہ لِتُبَيِّنَ (۱۶/۴۴) کا لفظ آنے سے ہمارے معزز و محترم حضرات اہلِ حدیث کی طرف سے وہی مؤکد اظہار مراد نہیں لیا گیا۔ حالانکہ عام طور پر اس لفظ کے یہی معنے لئے گئے ہیں۔ بلکہ محض بات بنا کر یہاں تبیین کے معنی تفسیر قرار دے دیئے۔ اور تفسیر بھی کیسی؟ وحی والی تفسیر جو صرف حق تعالیٰ کیلئے

ہی خاص ہے۔ مگر وہ اس آیت کے حوالے سے حضور اکرمؐ کے سپرد کردی گئی ہے۔ حالانکہ بندہ خواہ کوئی بھی ہو۔ وہ صرف بشری عقل والی تفسیر ہی کرسکتا ہے۔ وحی والی تفسیر کا کرنا تو صرف اُسیؐ کا ہی خاصہ ہوسکتا ہے جو شخص اپنے اختیار و تصرّف سے ہی وحی کیا کرتا ہے۔ کیا اس خدائی خاصہ کا حق یا منصب یا قوت یا اِختیار کِسی بندہ کو بھی مِل سکتا ہے۔ قطعاً نہیں یہ صرف حضراتِ علمائے اہلِ حدیث کا ہی اختراع ہے۔

حاصل یہ ہے کہ چونکہ قرآن مجید لوگوں کی طرف نازل کیا گیا ہے اس لئے لازم ہے کہ اس کا اظہار دوسرے لوگوں کے لئے بھی کردیا جائے زیرِ نظر آیت (۱۶/۴۴) میں اسی دلیل کو پیش کرکے، اسی اِظہار کا حکم دیا گیا ہے۔ جو سینکڑوں آیتوں میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ــــــ اور ہم نے تیری طرف یہ ذکر (یعنی قرآن) نازل کیا ہے (ذکر کا لفظ خود چاہتا ہے کہ اُسے لوگوں کو سُنا دیا جائے۔ اسلئے آگے فرمایا) لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ ۔ تاکہ آپ لوگوں پر اس چیز کو ظاہر کردیں جو ان کی طرف اتاری گئی ہے۔ (باقی رہی تدبر اور تفکّر والی تفسیر، سو وہ تو تمام لوگوں کا حق ہے۔ اس لئے قرآن کے اُتارنے کی دوسری وجہ یہ بتلائی۔ تاکہ وہ خود تفکّر کریں۔ جیساکہ اسی آیت کے اخیر پر ارشاد ہوا ہے)

وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ۝ (۱۶/۴۴) اور تاکہ لوگ خود تفکر کریں۔

اس مُبارک آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ اے پیغمبر! تم اسے بیان کردو۔ بلکہ ضمیر (اِسے) کی جگہ یہاں قرآن مجید کا وہ نام وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ (اور ہم نے آپ کی طرف ذکر کو نازل کیا ہے) ظاہر کرکے لایا گیا ہے جو اظہار قرآن کی بیّن دلیل ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں تبیین کے معنے اظہار کے ہیں۔ کیونکہ تفکّر کے لوگوں پر چھوڑنے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ بندے کی تفسیر صرف وہی ہوسکتی ہے جو وہ خود اپنی بشری عقل سے کرسکے۔ خُدائی تفسیر کا تو (جو خود قرآنِ کریم میں موجود ہے) بندہ ظاہر کرنے والا ہوسکتا ہے نہ کہ مفسر۔

علمائے اہلِ حدیث کو اعتراف ہے کہ تبیین کے دو معنے ہوتے ہیں ایک اظہار بمقابلہ کتمان۔ دوسرے تفسیر یا تشریح۔ سو جب اظہار کے معنی وہ حضرات خود بھی مانتے ہیں تو حیرت ہے کہ باوجود اس اقرار و اعتراف کے پھر بھی یہ آیت ان کی دلیل کیسے بن سکتی ہے؟ مشترک المعنی لفظ کے ایک جگہ صرف ایک ہی معنے لئے جا سکتے ہیں۔ سب کے سب اکٹھے نہیں لئے جا سکتے ـــــ علمائے اہلِ حدیث اس آیت کے متعلق فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے اظہار اور عدم کتمان کا حکم تو تھا ہی۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ آپ کو تشریح و تفسیر کا منصب بھی عطا کیا گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک ایک لفظ کے تمام معنے ایک ہی جگہ لینے جائز ہیں (العجب ثم العجب) اس پر سوائے افسوس اور حیرت کے اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

علاوہ ازیں ایک مشترک المعنیٰ لفظ کے کوئی خاص معنے متعین کرنے کیلئے سیاق و سباق میں کوئی قرینہ اور اشارہ کا ہونا ضروری ہے۔ جبکہ کوئی خاص قرینہ یا اشارہ موجود نہ ہو۔ آپ اپنے مخاطب کو کس طرح مطمئن کر سکتے ہیں کہ وہاں وہی معنے مراد ہیں جو آپ لے رہے ہیں۔

تبیین (متعدی) کے معنے ہر لغت کی کتاب میں ظاہر کرنے کے لکھے ہیں۔ قرآن مجید میں بھی یہی معنے مناسب معلوم ہوتے ہیں اور ہر جگہ پر فٹ بیٹھتے ہیں۔ اس معنے کے لئے یہ کوئی شرط نہیں کہ اس کے آگے کتمان کا لفظ بھی ضرور آیا کرے۔ اور جہاں کتمان کا لفظ نہ ہو۔ وہاں ضرور ہی تفسیر کے معنے لئے جائیں البتہ اس کے برعکس یہ بات صحیح ہے کہ بیان کے اصل معنی اظہار کے ہیں۔ لیکن اگر اس کے ساتھ عدم کتمان کا ذکر بھی ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ عدم کتمان کا لفظ واضح طور پر آجانے کی وجہ سے تبیین کے معنے بجائے اظہار کے تفسیر کر لئے جائیں۔

مثلاً چوتھے پارہ کے دسویں رکوع میں حق تعالےٰ فرماتے ہیں "یاد کرو جب ہم نے ان لوگوں سے عہد لیا۔ جن کو کتاب دی گئی ہے کہ تم لوگوں کے لئے اس کی تبیین کرو گے اور اس کا کتمان نہیں کرو گے۔

لَتُبَیِّنُنَّہٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَکْتُمُوْنَہٗ ؕ (۳/۱۸۷) تم اسے لوگوں کے لئے اس کی تشریح کروگے اور اسے چھپاؤ گے نہیں۔

اس کے بعد فرمایا۔ لیکن انہوں نے اس عہد کو پسِ پشت ڈال دیا۔

فَنَبَذُوْہُ وَرَآءَ ظُھُوْرِھِمْ (۳/۱۸۷) ہمارا خیال ہے کہ اگر علمائے اہلِ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لئے بھی (قرآنی ہدایات کے مطابق) تفسیر کا حق ثابت کر دیتے تو اس آیت سے ضرور اس کی سند پکڑتے اور دلیل یہ دیتے کہ لَا تَکْتُمُوْنَہٗ میں چھپانے کی ممانعت ہے۔ جس سے صراحتاً کتاب کے اظہار کا حکم پایا جاتا ہے۔ اور اب اگر لَتُبَیِّنُنَّہٗ میں بھی کتاب کے ظاہر کرنے کا ہی حکم ہو تو آیت میں تکرار پایا جاتا ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ یہاں تبیین کے معنے تفسیر اور شرح کر دینے کے ہی لئے جائیں۔ مگر چونکہ اس طرح (مطابق ۶/۶۵ تصریف آیات کے ذریعہ) دوسرے لوگوں کو بھی الٰہی کتاب کی تفسیر کا حق مل جاتا ہے جو حضرات اہل حدیث دینا نہیں چاہتے۔ اس لئے کہتے ہیں کہ اس آیت میں تبیین بمقابلہ کتمان ہے۔ لہٰذا اس آیت میں تو تبیین کے معنے اظہار ہی کے ہونگے حالانکہ یہاں تبیین کا حکم عدمِ کتمان (ولا تکتمونہ) کے علاوہ ہے یعنی اس آیتِ کریمہ میں دو حکم دیئے گئے ہیں۔ ایک تفسیر و تشریح کا اور دوسرے عدمِ کتمان کا اور ضروری ہے کہ کسی نہ کسی طرح ان کا دو الگ الگ حکم ہونا برقرار رہے تاکہ کتاب خداوندی میں تکرار نہ پایا جائے۔ جو کلامِ الٰہی کو معاذ اللہ مقامِ فصاحت سے گرانے کا موجب بنتا ہے۔ اسی وجہ سے بعض علماء نے یہاں تبیین کے معنی شرح کرنے یعنی مطلب کو صاف صاف بیان کر دینے کے لئے ہیں۔

شمس العلماء حافظ مولوی نذیر احمد صاحب اس آیت (۳/۱۸۶) کا ترجمہ اس طرح لکھتے ہیں۔ اور (اے پیغمبر! اہلِ کتاب کو وہ وقت کیوں نہیں یاد دلاتے) جب خدا نے اہلِ کتاب سے قول و قرار لیا کہ (یہ کتاب جو تم کو دی گئی ہے) لوگوں سے اس کا مطلب صاف صاف بیان کر دینا اور اس کی کسی بات کو نہ چھپانا۔ مگر انہوں نے (اس قول کی کچھ بھی پروا نہ کی) اور اسکو اپنے پسِ پشت پھینک دیا۔

تفسیر خازن میں لِتُبَیِّنُنَّهٗ لِلنَّاس کے تحت میں لکھا ہے۔

وذلك ان الله اوجب علی علماء التوراة والانجیل ان یشرحوا للناس ما فی هذین الکتابین من الدلائل الدالة علی نبوة محمد صلے الله علیه وسلم۔

(بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے علمائے تورات و انجیل پر واجب کیا تھا کہ وہ لوگوں کے لئے جو کچھ ان دونوں کتابوں میں دلائل بیان کئے گئے ہیں جو محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوّت پر دلالت کرتے ہیں انہیں کھول کھول کر بیان کر دیں) حاصل یہ ہے کہ اگر، تبیین کے معنے اظہار کرنے کے ہوں جیسا کہ ہمارا خیال ہے، تو اس سے بھی ہمارا مدّعا ثابت ہے اور اگر تبیین کے معنیٰ تفسیر کے لئے جائیں تب بھی ہمارا استدلال برقرار ہے کیونکہ تبیین بمعنی تفسیر بھی صرف رسول اکرم یا انبیاء کرام کا خاصہ نہیں بلکہ کلام الٰہی کی تفسیر کا حق دوسروں کو بھی دیا گیا ہے جیسا کہ لعلھم یتفکرون $\frac{16}{44}$ افلا یتدبرون القرآن — اور اس آیت لتبیننہٗ للناس $\frac{3}{187}$ سے واضح ہے۔ لہٰذا اگر اس حق تبیین کی وجہ سے رسولِ اکرم کی تفسیر وحی الٰہی کے ہم پلہ بن سکتی ہے تو پھر $\frac{3}{187}$ میں عام لوگوں کو دیئے گئے اسی حق تبیین کی وجہ سے ان کی تفسیریں بھی وحی الٰہی کے ہم پلہ (ومثلہٗ معہ) ماننی پڑیں گی۔ مقصد یہ کہ اگر بالفرض آیت لتبین للناس ($\frac{16}{44}$) میں تبیین کے معنیٰ تفسیر کے ہی لئے جائیں جیسا کہ اہل حدیث کہتے ہیں تو چونکہ یہ تفسیر لَا یَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِیْرًا $\frac{25}{33}$ والی خدائی تفسیر سے جدا اور خارج از قرآن تفسیر ہے اس لئے یقیناً بشری عقل وانبیاء والی تفسیر کا حق ہماری پیش کردہ آیات اور تمام علماء کے مسلّمات کے مطابق چونکہ ہر مسلمان کو بھی حاصل ہے (کم از کم علماء کو تو ضرور حاصل ہے) لہٰذا اگر حضور اکرمؐ کی خارج از قرآن تفسیر کو وحی الٰہی کے ہم پلّہ اور مثلہٗ معہ سمجھا گیا تو دوسرے لوگوں کی تفسیر کو بھی یہی مقام دینا پڑے گا کیونکہ آیت ($\frac{16}{44}$) میں کوئی ایسا لفظ موجود نہیں ہے جو اس کا خاصۂ رسول ہونا دکھلائے۔ غرض یہ کہ اگر تبیین کے معنے یہاں صرف اظہار کے ہی ہیں

جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے ثابت کیا ہے اور خود علماء اہلِ حدیث کو بھی اعتراف ہے کہ **تبیین** بمعنی اظہار بھی رسولِ خدا پر فرض ہے تو معلوم نہیں کہ پھر یہ حضرات اس آیت کو اپنے غلط دعوے کے ثبوت میں کیوں پیش کرتے ہیں؟

پریوی کونسل کی مثال

اس سلسلہ میں حضرات علمائے اہلِ حدیث کی طرف سے جو مثال پیش کی جاتی ہے وہ مغالطہ سے خالی نہیں۔ ان کے نزدیک ہائی کورٹ کا جج قبل از تقرر اور بعد از پنشن قانون میں تو کوئی دخل نہیں رکھتا مگر جب وہ جج کے عہدہ پر مامور ہو جاتا ہے تو اس کی حیثیت بدل جاتی ہے۔ اس وقت اس کی رائیں اور فہم بعینہٖ قانون سمجھے جاتے ہیں (خواہ وہ کسی جھوٹی شہادت کی بناء پر غلط فیصلہ ہی کر دے) اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبل از نبوت تو بشر تھے اور بشری محدود فہم و اختیار رکھتے تھے۔ مگر نبوت کے زمانہ میں آپ بشر نہیں رہے تھے۔ اور اس طرح اس وقت آپ کا محدود بشری فہم بعینہٖ وحی کی اطاعت کے مساوی ہو گیا تھا اور عقلی حیثیت سے نکل گیا تھا۔ حضرات علمائے اہلِ حدیث تسلیم فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے تمام ارشادات اور احکام آپ کا فہم ہی تھے۔ جو انہوں نے قرآن سے حاصل کیا تھا۔ مگر اس میں قابلِ غور امر یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا فہم اس وقت بھی بشری اور محدود ہی تھا یا غیر محدود خدائی فہم بن گیا تھا۔ پریوی کونسل کے جج کا فہم اور رائے ذاتی طور پر تمام لیجسیٹو کونسل کے فہم و رائے کے مساوی بلکہ بڑھ کر بھی ہو سکتا ہے۔ مگر ۔

کیا وحی الٰہی اور عقلِ انسانی بھی کسی طرح ایک ہو سکتی ہیں؟

علاوہ ازیں لیجسیٹو کونسل، مجلس واضعان قوانین کے ممبر اکٹھے ہو کر اپنے ملک کی بہتری کے لئے اپنی عقل سے قانون بناتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان قوانین کے بعض الفاظ مشتبہ رہ جائیں اور ممکن ہے کہ ان میں کوئی امر نظر انداز ہو گیا ہو۔ ایسی صورتوں میں اعلیٰ ججوں کو بھی بوقت ضرورت اپنی عقل سے کام لینے کا اختیار دینا اور کسی مناسب

تشریح کے قائم کرنے یا کسی تخصیص و ترمیم کر لینے کا مجاز یا حقدار بنانا بالکل معقول ہے۔ عقلی باتوں میں ایسے اختیار دینا صرف مناسب ہی نہیں بلکہ ضروری ہیں۔ محدود عقلوں کے نقص، بلاشبہ محدود عقلیں نکال سکتی ہیں۔ اسی لئے بعد کو ان اعلیٰ ججوں کی تشریحیں اور ترمیمیں دوسرے ویسے ہی اعلیٰ ججوں سے بدلی بھی جا سکتی ہیں۔ اس مثال سے یہ تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عقل، عقل کی جگہ برابر کام دے سکتی ہے اور اس لئے عقلی اور انتظامی کاموں میں ایسے حق ضرور ملنے چاہئیں۔ لیکن کیا اس مثال سے یہ بھی نکلتا ہے کہ وحی الٰہی کی جگہ بشر کو یہ اختیار دیا جا سکتا ہے کہ جو کچھ وہ عقل سے سوچ سمجھ کر کرے وہ بھی بعینہٖ وحی الٰہی سمجھا جائے۔

کونسل والی مثال میں دونوں طرف محدود عقلیں ہیں۔ لیکن ہماری بحث وحی اور بشری محدود عقل کے متعلق ہے۔ ہم نے پہلے ہی وحی اور عقل کے امتیاز کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے۔ اور بخوبی دکھلا دیا ہے کہ وحی اور عقل ایک دوسرے کے دائرہ سے بالکل الگ اور جدا کیفیت کی دو چیزیں ہیں۔ کیا اس لیجسلیٹو کونسل اور پریوی کونسل میں بھی یہ فرق و تمیز موجود ہے؟ پھر کیا اس قیاس مع الفارق سے بشری عقل کے کام بعینہٖ خدا کی وحی یا اس کے ہم معنے بن جائیں گے؟ حاشا و کلا

عقلی کوششیں وحی نہیں بن سکتیں

یہ بالکل سچ ہے کہ وحی الٰہی نے ہم کو قرآن پاک میں تدبر، تفکر اور تعقل سے کام لینے کی تاکید فرمائی ہے اور عقلی کوششوں، یعنی صحیفۂ فطرت سے استفادہ کرنے اور مشوروں اور منصفوں اور ججوں سے بھی کام لینے کا حکم دیا ہے اسی طرح رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو عام قرآنی احکام کے علاوہ عام عقلوں کے ساتھ علیحدہ بھی وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ اور اسکی مثل احکام دیئے ہیں۔ لیکن کیا اس سے عقلی کوششیں بعینہٖ وحی الٰہی یا اس کی ہم معنے بن جائیں گی؟ خدا ایسا اختیار کسی کو نہیں دیتا لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا (۱۸/۲۶) اگر علمائے اہل حدیث فرمائیں کہ ہم نے یہ مثال اس لئے نہیں دی کہ اس سے ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو عین وحی ہونا ثابت کریں بلکہ اس مثال سے یہ دکھلانا مقصود ہے کہ جس طرح

عقلی قانون دوسری عقلوں کو بھی اپنے جیسا حق دے سکتا ہے۔ اسی طرح قانونِ وحی بھی ایک بشر کے عقلی فیصلوں کو یہ حق دے سکتا ہے تو یہ بھی سرتا پا باطل ہے۔ اس لئے کہ عقلی قانون دوسری عقلوں کو جو حق دیتا ہے وہ بلاشبہ عقل کا حق ہوتا ہے۔ کیا اسی طرح عقل وفہم کا بھی حق ہے کہ اسے وحی الٰہی قرار دیا جا سکے؟ ہرگز نہیں کیونکہ عقل کو وحی نہیں کہا جا سکتا۔

اس پر اگر آپ فرمائیں کہ ہم تو رسول کی عقل کو ما فوق البشر عقل سمجھتے ہیں یا رسول اللہ کے فیصلوں کو وحی یا تفہیم الٰہی سے جانتے ہیں یا زیرِ حفاظت الٰہی قرار دیتے ہیں تو یہ آپ کا ایک علیحدہ دعویٰ ہوا۔ اس بات سے یہ مثال کیسے پیدا ہو گئی؟ پس علمائے اہلِ حدیث کو یہ مثال ذرہ برابر کام نہیں دے سکتی۔

پھر یہ بھی عجیب بات ہے کہ پریوی کونسل کے ججوں کو تو بوقتِ ضرورت کسی خاص امر ہی میں اختیار ہوتا ہے۔ مگر حدیثوں کو قرآن مجید سے سینکڑوں گنا زیادہ ایسی شریعت بنانے کا اختیار دے دیا گیا ہے جو بعینہٖ وحی الٰہی سمجھی جاتی ہے۔ کیا قرآن مجید نے وحی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا ذمہ لے کر بھی اس قدر حدیثوں جتنی وحی کو قرآن مجید سے باہر چھوڑ دیا ہے۔ حاشا وکلا قرآن مجید تو اپنے فرائض کی ادائیگی میں ہرگز ہرگز قصور نہیں کر سکتا۔ یہ اہلِ حدیث حضرات ہی ہیں جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشری عقل کو وحی کا درجہ دے کر بشر کو خدا بنا رہے ہیں۔ اکثر یہود و نصاریٰ اپنے احبار و رہبان اور مسیح بن مریم کو اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (اللہ کے علاوہ اپنے رب) بناتے تھے۔ ہمارے اہلِ حدیث حضرات وَالۡمَسِيۡحَ ابۡنَ مَرۡيَمَ (۹/۳۱) یعنی (نصاریٰ کی طرح) اپنے نبی یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ علیہ وسلم کو رب بنانے لگے جس سے اس آیت (۹/۳۱) میں خصوصی طور پر روکا گیا ہے۔

توحیدِ الٰہی

مخصوص خُداوندی اختیارات کو مخلوق میں تسلیم کرنا

جب کوئی شخص بیمار ہوتا ہے تو حاذق حکیموں اور ماہر ڈاکٹروں کے پاس جاتا ہے تاکہ اُن کے علم، عقل، سمجھ اور تجربہ سے فائدہ اٹھائے۔ بیمار کے لئے ایسا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن ہر چند کہ بیمار ایک بادشاہ بھی کیوں نہ ہو اور ڈاکٹر سب کے سب ارسطو بھی کیوں نہ ہوں۔ طب اور ڈاکٹری کی اعلیٰ درجے کی کتابیں مشورہ کے لئے مہیّا اور موجود ہوں اور ہر قسم کی دوائیں اور انجکشن بسہولت مل سکتی ہوں۔ اور ضرورت سے بڑھ کر خدمت گار تعمیل کے لئے منتظر بیٹھے ہوں اور حکموں کی تعمیل بلا توقف نہایت کوشش کے ساتھ ہو رہی ہو۔ پھر بھی کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ بیمار کو ضرور ہی شفا مل جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ اسے رختِ سفر باندھنا ہی پڑ جائے۔ کیونکہ نیچر کی بیشمار چیزیں اور ان کی تاثیریں مخلوق کے قابو اور علم سے ہمیشہ باہر رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس بیمار کے لئے تمام سامانوں کے مہیا ہونے کے باوجود اس بیمار کی حالت امید و بیم میں رہتی ہے۔ وہ شفا کے لئے صرف اسی ذاتِ مقدس تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اسی سے دُعائیں مانگتا ہے۔ جس کی منشاء (قانون) پر کوئی روک ممکن نہیں ہے۔ کوئی مریض کسی ڈاکٹر یا کسی حکیم سے شفایابی کی دُعائیں نہیں مانگتا۔

اسی طرح ایک کسان زمین میں ہل چلاتا ہے۔ عمدہ زمین ہے۔ وہ عمدہ بیج بوتا ہے، مناسب کھاد ڈالتا ہے۔ پانی دیتا ہے، ہر طرح کی رکھوالی اور نگرانی کرتا ہے مگر پھر بھی نیچر کی بیشمار چیزیں اور تاثیریں اس کے علم اور قابو سے باہر ہیں، مثلاً موسمی تغیرات، آندھیاں، بارشیں، اولے، زلزلے، ٹڈی دل اور اَن گنت اقسام کے مضر جراثیم اور کیڑے، دیگر دشمنوں کی روک تھام بلکہ خود اس کی اپنی کمزوریاں اور غلطیاں اس کے بس کی چیزیں نہیں ہیں۔ وہ اپنی تمام ممکن کوششوں کے باوجود ہرگز ہرگز نہیں کہہ سکتا کہ میں اناج کو سالماً و غانماً اپنے قابو میں لے آؤں گا۔ اور اس سے حسبِ منشاء فائدہ اُٹھالوں گا۔ اس کی حالت آخیر تک بیم و رجا کی سی رہتی ہے۔

لیکن انسان اپنے حاصل کردہ سامانوں کے پیچھے چل کر ہی کام کرتا ہے لیکن دُعاء اور التجاء کرنے کے لائق صرف وہ خدا ہی ہے جس کے حکم کے پیچھے پیچھے تمام اسباب چلتے ہیں (یعنی جو خود مسبب الاسباب بھی ہے)

پھر دو بادشاہ جنگ کرتے ہیں۔ اگرچہ ہر طرح کے سامان اور جرار افواج رکھتے ہوں۔ ہر طرح کے اسلحہ کا ذخیرہ ان کے پاس ہو پھر بھی ان کی حالت متردد ہی ہوتی ہے وہ جانتے ہیں کہ بسا اوقات قلیل جماعتیں جرار فوجوں کو شکست دے دیتی ہیں۔ اور دیگر قدرتی افتادیں ان کے علاوہ ہوتی ہیں۔ وہ باوجود ان تمام کوششوں کے اس احکم الحاکمین اور مالک الملک سے دُعائیں مانگتے ہیں۔ جو سبب ساز بھی ہے اور سبب سوز بھی ہے۔ وہ چاہے تو ان میں دوستی پیدا کر دے اور چاہے تو دونوں کو تباہ کر دے اور کسی تیسرے بے سرو سامان کے ہاتھ میں ملک دے دے اور چاہے تو کبھی ایک کو فتح دیدے اور کبھی دوسرے کو۔ اور چاہے تو دونوں کو واپس بھیج دے، جو چاہے سو کرے۔ مالک اپنے ملک میں مختار ہے۔ پیدا کرنا اور نتیجۂ مقصود تک پہنچانا صرف اسی کے اختیار میں ہے۔ یہی حال ہماری تمام تجارتوں، محنتوں، مقدموں، سفروں اور تمام دیگر کوششوں کا بھی ہے۔ اس بیان سے صاف کُھل جاتا ہے کہ انسانوں کے لئے باہمدگر نیچرل استمداد جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہے لیکن وہ استمداد جو محض تصرّف الٰہی سے تعلق رکھتی ہے۔ کسی دوسرے سے چاہنا اس کو دوسرا خُدا بنانا اور خُدا کی خُدائی میں شریک ٹھہرانا ہے لیکن حق تعالیٰ اپنے تصرف کے کاموں میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ یعنی یہ نہیں کہتا کہ ایک تو میں متصرف ہوں۔ اور ایک تجھ کو بھی اس قسم کے تصرف کی قوت یا اختیار (کسی ایک قسم کے کاموں میں یا چند روز کے لئے بھی) دے دیتا ہوں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دائرۂ تصرف میں کسی اور کو بھی شامل کر لیتا ہے۔ تو تمام مشرک سچے ہیں۔

کسی کے اختیاری افعال کو وحی کا درجہ دینا اسے خُدا بنانا ہے

وحی اور عقل میں بھی تصرف اور نیچر کا ہی فرق ہے (مشورہ، یعنی) عقلی مدد انسان سے مانگی جاتی ہے۔ لیکن کسی مخلوق سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمیں وحی لا دو۔

ہم نے کتاب کے شروع ہی میں وحی اور عقل کا فرق دکھلا دیا تھا۔ پس کسی محدود العقل اور کمزور بشر کے اختیاری کاموں میں اسکو ایسی قوت یا اختیار دینا کہ جس سے اس کے کام بھی بعینہ وحی کے مثل بن جائیں (جو خدا کا خاص فعل ہے) اس کو دوسرا خدا بنانا ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ خدا جو کام محض اپنے تصرف و اختیار سے بلا کسی بشری اختیار کے دخل کے کرتا ہے۔ وہ کسی بشر کا اختیاری فعل ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جو تعلیم و تفہیم خود خدا اپنے تصرف و اختیار سے کسی بشری اختیار کے دخل کے بغیر کسی بشر کو دیتا ہے (یعنی انبیاء کو جو وحی کرتا ہے) وہ بھی کسی بشری اختیار کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ وہ خود خدا ہی کا خاص فعل ہوتا ہے۔ اس سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ کسی بشر کے عقلی و اختیاری اقوال و افعال کو خدا کے تصرف یعنی وحی کا درجہ دینا اسکو خدا بنا دینا ہے۔

عقلی اجتہاد، جن میں غلطیاں واقع ہو سکتی ہیں وہ کبھی بھی وحی نہیں ہو سکتے

ہمارا شروع ہی سے یہ سوال رہا ہے کہ کیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے محدود بشری فعل و اختیار کے کام کسی طرح بھی وحی الٰہی ہو سکتے ہیں؟ اس کے جواب میں حضرات اہل حدیث نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مختار و مکلف اور جوابدہ ہونے سے ہرگز ہرگز انکار نہیں کیا بلکہ نہایت صفائی سے تسلیم فرمایا ہے کہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے اجتہادات میں غلطیاں واقع ہوتی تھیں، مگر باوجود اس اقرار کے وہ آنحضرت کے اجتہادات کو وحی کا درجہ بھی دیتے جاتے ہیں۔ چنانچہ اُن کا اعتراف ہے کہ

> "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بشر تھے۔ آپ کو حق تعالے نے بذریعہ وحی کے تفسیر قرآن کرنے کی قوت عطا فرمائی تھی جیسے ہائی کورٹ یا پریوی کونسل کے جج کو کسی قانون کی صحیح تشریح کرنیکا شاہی اختیار ہوتا ہے"۔

یہ تو بالکل صحیح ہے کہ انسان اپنی طرف سے خوب کوشش کر کے کسی بات کو اپنے خیال میں صحیح قرار دے سکتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ بات فی الواقعہ بھی ہمیشہ ہی صحیح ہوا کرے۔ پس کسی جج کو ایسی ہی صحیح تشریح کرنے کا اختیار ملے

سکتا ہے جو اس کی طاقت و عقل کے مطابق ہو۔ کسی شخص کو وہ اختیار دینا (یعنی کسی کے لئے ایسا اختیار تسلیم کرنا) جو اس کی طاقت و عقل سے بڑھ کر ہو، بالکل فضول اور بے معنی بات ہے۔ اسی معقول قاعدہ کے مطابق تمام بشری عقلوں کو آیات اللہ (قرآن کریم) میں تفکر، تدبر اور تعقل و استنباط کرنے کا اختیار خدا کی طرف سے ملا ہوا ہے۔ جیسے کہ آیت نمبر (۲۴/۴۷)

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (۲۴/۴۷)

تو کیا وہ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں؟

میں عام لوگوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ لوگ قرآن میں تدبر کیوں نہیں کرتے کیا ان کے ذہنوں پر قرآن کی طرف سے تالے (قفل) پڑے ہوئے ہیں؟ لہٰذا یہ اختیار (تدبر) صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشری عقل کے لئے ہی مختص نہیں ہے۔ لیکن کمال افسوس ہے کہ حضرات علمائے اہل حدیث اپنے بیانات میں رسولؐ کی بشری عقل کو محض عقل والا ہی حق وا ختیار نہیں دیتے بلکہ وہ قوت و اختیار دینے پر مصر ہیں جو بشری عقل کے لئے شایاں نہیں۔

عقلی و اختیاری اقوال کو وحی کہنا، دوسرا خدا بنانا ہے

بذریعہ وحی کے تفسیر کرنے کی قوت عطا فرمانا اور جج کی طرح نبی کو تشریح کرنے کا شاہی یعنی خدائی اختیار ہونا، وحی کیساتھ ہنسی کرنا اور غیر خدا کو خدائی حق دینا ہے۔ جب کسی بشر کو کسی کام کرنے کی قوت اور اختیار دیدیا گیا تو وہ کام اس قوت و اختیار والے کا اختیاری فعل ہو گیا۔ اب اس بشر کے اختیاری فعل کو وحی الٰہی ٹھہرانا جو حق تعالیٰ کا خاص فعل ہے، بشری اختیاری فعل اور خدا کے خاص فعل کو ایک بنا دینا ہے۔ پھر حضرات اہل حدیث کا دعویٰ ہے کہ

"عقلی فیصلوں میں چونکہ غلطی کا امکان بلکہ احتمال ہوتا ہے۔ اس لئے کسی کی ذات پر بالکلیہ بھروسہ کرنا گویا اس کو احتمالِ خطا سے مُبرّا جاننا ہے۔ پس آنحضرتؐ کے فیصلوں کو بلحاظ اُن کی شخصیت کے واجب التسلیم فرمانا اور چون وچرا کے

گنجائش نہ چھوڑنا صاف دلالت کرتا ہے کہ آپ جو فیصلہ فرمائیں گے وہ دوسرے عقلمندوں کے فیصلے کے مانند نہ ہوگا چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝ (۵/۶۵)

تو نہیں، تیرے رب کی قسم، (اے پیغمبر!) وہ مؤمن ہی نہیں ہو سکتے جب تک تجھے اپنے باہمی اختلافات میں حَکَم نہ بنائیں پھر جو کچھ آپ فیصلہ فرمادیں اس سے دل میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور اسے پُوری طرح تسلیم نہ کریں۔

ناظرین حضرات اہل حدیث کے جوابات کا اندازہ لگاتے وقت ہمارے سوالات بھی پیش نظر رکھا کریں۔ یہاں ہمارا سوال صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقلی و اختیاری اقوال و افعال کے متعلق ہے کہ کیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بشری اقوال بھی وحی تھے؟ جن کے لئے آپ مکلف اور جوابدہ بھی تھے۔ حضرات علمائے اہلِ حدیث فرماتے ہیں کہ عقلی باتوں میں کسی کی ذات پر بالکل بھروسہ کرنا گویا احتمالِ خطا سے مبرّا جاننا ہے یعنی **خدا** ماننا ہے۔

یہ بالکل سچی بات ہے۔ ہمارے سوال کا جواب اتنی بات سے صحیح صحیح مِل جاتا ہے مگر اسکے بعد وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کی شخصیت کو آپکے بشری اور عقلی اقوال وافعال میں بھی بالکلیہ بھروسہ کے لائق اور احتمالِ خطا سے مبرّا بنا دیا ہے یا یوں کہئے کہ حضور کو دوسرا **خدا** ٹھہرا دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ ـــــ

" اگرچہ عقل کو بالکلیہ بھروسہ کے لائق اور مبری عن الخطا ہونے کا درجہ دینا باطل ہے۔ مگر خدا نے رسول کی عقل کو یہ درجہ دیدیا ہے۔ کیونکہ حضورؐ کے فیصلے کو بلحاظ حضورؐ کی شخصیت کے واجب التسلیم فرمادیا ہے۔ اور چون وچرا کی گنجائش نہیں چھوڑی پس خدا کے ایسا درجہ و اختیار دینے سے رسول کی بشری عقل ایسی قرار پاگئی کہ دوسرے عقلمندوں کے مثل نہ رہی"۔ معاذ اللہ! سیدھے سوال کے جواب میں کیسے پیچ ڈالے جاتے ہیں صاف نہیں کہا جاتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیاری اور بشری عقل کے اقوال وافعال ہرگز ہرگز وحی نہیں تھے۔

قول اللہ اور قول البشر کی تمیز ہرگز ختم نہیں ہو سکتی

اگر حضورؐ کے بشری اقوال بھی وحی تھے تو قول البشر اور قول اللہ میں وحی ہونے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں رہتا۔ اِس سے وہ کافر سچا بن جاتا ہے جو کہتا تھا کہ یہ قرآن اسی بشر یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا قول ہے۔ قول محمدؐ کو قول الٰہی کی طرح وحی بنانا صراحتاً اس کافر کی تصدیق کرنا ہے جو کہتا تھا

اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (۷۴/۲۵)

یہ قرآن خدا کا نہیں بلکہ بشر محمدؐ کا قول ہے۔ یعنی وہ کہتا تھا کہ محمدؐ اپنے قول کو اللہ کا قول کہتا ہے۔ اس طرح عُلمائے اہلِ حدیث قولِ رسول کو اللہ کا قول بتا کر تصدیق فرمار ہے ہیں کہ واقعی رسولؐ کا قول اللہ کا قول ہے لیکن خدا اس کافر کے متعلق آگے فرماتا ہے:

سَاُصْلِیْهِ سَقَرَ۔ (۷۴/۲۶) میں ضرور اسے جہنم میں داخل کر کے رہونگا۔

دائرۂ اِختیارات

یہ امر آفتاب عالمتاب کی طرح روشن ہے کہ صحابۂ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیٹے نہیں مانگ سکتے تھے اور نہ یہ سوال کر سکتے تھے کہ ہمارے بیٹوں کو طولِ حیات عطا فرما دیجئے۔ کیونکہ یہ کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقل و اختیار سے باہر تھے حضورؐ تو اپنے بیٹوں اور نواسوں کو بھی نہ بچا سکے۔ حاصل یہ کہ جو کام حضورؐ کے اپنے فہم و اختیار کے نہ تھے ان میں حضورؐ سے سوال نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن جو کام آنجناب کے اپنی عقل و اختیار کے تھے ان کا مانگنا آپ کے گھر سے جائز تھا۔ مثلاً ایک پیاسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پانی مانگ سکتا تھا۔ خواہ حضورؐ اسے اپنے گھر سے پانی پلا دیتے یا کسی نہر یا تالاب سے یا بارش کا پانی منگا دیتے مگر وہ پیاسا حضورؐ سے یہ سوال نہیں کر سکتا تھا کہ آپ بارش برسا کر پانی پلا دیجئے۔

اب یہ بات بالکل ہی واضح ہے کہ اسی طرح وحی الٰہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے عقل و اختیار کا کوئی دخل نہیں، ٹھیک جس طرح بیٹے بخشنے، طول حیات عطا فرمانے اور بارش برسا دینے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ ہاں نازل شدہ

وحی میں تدبر کرنے اور عقل وفہم سے کام لینے کی پوری اجازت تھی ـــــ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے مسائل پوچھتے تھے. وہ بالکل اسی پیاسے کی طرح جو آپ سے آپ کی طاقت واختیار کے مطابق ہی پانی مانگتا تھا۔ اپنے مسائل کا حل مانگتے تھے۔ جیسے وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ پانی پلاؤ جو ہر دفعہ اسی وقت تازہ بتازہ آسمان سے برسا ہو۔ اسی طرح صحابہؓ بھی یہ نہیں کہتے تھے اور نہ کہہ سکتے تھے کہ ہمیں وہ حل بتایئے جو تازہ بتازہ آسمان سے بذریعہ وحی نازل ہوا ہو، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بشری فہم واختیار سے بھی بالضرور باتیں کیا کرتے تھے جو ہرگز ہرگز وحی نہیں قرار پا سکتی تھیں۔

خُدا کا مخصوص فعل کسی بندہ کا اختیاری فعل قرار نہیں پا سکتا

اگر خدا کسی صاحب اختیار شخص کے ساتھ ایسا وعدہ فرمائے کہ تیری تمام اختیاری باتیں بھی وحی ہوں گی تو اس سے لازم آئیگا کہ وہ شخص جب چاہے خدا سے باختیار خود وحی حاصل کر سکتا ہے۔ اس طرح اس بندے کے لئے وحی پانا اور غائبانہ باتیں بتلا دینا اختیاری فعل بن جائے گا۔ لیکن یہ قطعاً محال ہے کہ ایک چیز اللہ تعالیٰ کا مخصوص فعل بھی ہو۔ اور وہی چیز کسی بشر کا اختیاری فعل بھی ہو۔

حاصل یہ کہ اگر رسولوں کے اختیاری فعل بھی تھے تو وہ ہرگز ہرگز وحی الٰہی نہیں ہو سکتے۔ مگر افسوس ہے کہ آج تک ایسی سیدھی سی بات کا صفائی کے ساتھ اقرار نہیں کیا گیا ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر وقت وحی نہیں ہوا کرتی تھی۔ جب آپ کوئی آیت نہ لاتے تو کافر کہا کرتے تھے۔

وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا (٧/٢٠٣)

اور جب آپ ان کے پاس کوئی آیت نہیں لاتے تو وہ کہتے ہیں کہ تو نے خود ہی کیوں نہ اسے بنا لیا۔

یعنی تو اسے خود ہی کیوں نہیں گھڑ لایا؟ تو اس کے جواب میں حکم ہوا۔

قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ (٧/٢٠٣)

آپ کہہ دیجئے کہ میں تو صرف اپنے رب کی وحی کے پیچھے چلتا ہوں۔

یعنی اپنی طرف سے بنا کر کوئی آیت پیش نہیں کرتا اور پیش نہیں کر سکتا۔ میں تو وحی الٰہی کے پیچھے چلتا ہوں۔ یہ نہیں کہ وحی الٰہی میرے فہم و اختیار کے پیچھے چلتی ہو اور جو بات میں کہہ دوں وہی وحی الٰہی بن جائے۔

حدیث معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ کے مطابق اہلِ حدیث حضرات بھی تسلیم فرماتے ہیں کہ کوئی فیصلہ کرنے کے لئے پہلے قرآن مجید سے حکم تلاش کرنے چاہئیں۔ اگر قرآن مجید میں نہ ملیں تو حدیث کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیئے اور اگر حدیث میں بھی اس کے متعلق احکام نہ ہوں تو اجتہاد ورائے کے اصول پر عمل کرنا لازم ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ قرآن و حدیث کے باوجود بھی اہلِ علم کے نزدیک اجتہاد کر کے رائے نکالنے کی سخت ضرورت ہے۔ اسی ضرورت کے سبب سے مجتہدوں کو بھی اجتہاد کرنے پڑے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خود وحی نے ہی بہت کچھ عقل پر چھوڑا ہوا ہے۔ جب وحی الٰہی کا منشاء ہی یہ ہے کہ بہت سے مسائل کو عقل پر چھوڑ دے تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشری عقل ہی اس لائق نہیں تھی کہ اس پر اسی طرح کے مسائل چھوڑے جاتے؟ کیا نعوذ باللہ آپؐ کو اجتہاد کے ناقابل سمجھ کر ہر مسئلے کی خاطر وحی کی جاتی تھی؟ کیا جن مسائل کو خود وحی الٰہی نے اپنے میں شامل نہ کر کے آج تک اجتہاد پر چھوڑ رکھا ہے۔ وہی مسائل زمانۂ رسول میں بھی اسی طرح بشری عقلوں پر نہیں چھوڑے ہوئے تھے۔ اور اگر اس وقت وحی الٰہی نے ہی ان مسائل کو بشری اجتہاد پر چھوڑنا منظور فرمایا تھا تو کیوں اب برخلافِ منشائے وحی ان بشری اجتہادوں کو وحی بنایا جائے؟۔

ابتدائے عہد رسالت میں مسلمان ضرور فوت ہوا کرتے تھے۔ ان کی میراثوں کو بھی تقسیم کرنے کی ضرورت پڑتی تھی لیکن احکام میراث ایک مدت کے بعد مدینہ منورہ میں جا کر نازل ہوئے۔ ان میں یہ بھی فرمایا کہ خدا تمہیں غلطیوں سے بچانے کے لئے یہ بیان کر رہا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرصۂ دراز تک تقسیم میراث باوجود غلطیوں کے

حسب فہم ہی ہوتی رہی تھی۔ اسی طرح وضو بھی ابتداء ہی سے کسی نہ کسی طرح کیا جاتا تھا مگر وضو کا حکم اور طریقہ فتح مکہ کے بعد نازل ہوا۔ اس سے صاف کھل جاتا ہے کہ اس سے پہلے صحابہ رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت عقلی باتوں میں عقلی طور پر ہی کیا کرتے تھے۔ پس عہد نبوت میں رسول اللہ کی عقلی اطاعت بھی بالضرور ہوتی تھی۔ اب اس عقلی اطاعت کے کچھ اور معنے بنا لینے درست نہیں۔

مقام حیرت لوگ حیران ہوں گے کہ جب بات بالکل صاف ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بشری اور عقلی اقوال و افعال ہرگز ہرگز وحی نہیں تھے تو ہمارے علمائے کرام کو اس کے تسلیم فرما لینے میں کونسی دشواری ہو سکتی ہے۔ اس کے جواب میں اس کے سوا کیا کہا جائے کہ اس سچی بات کو تسلیم کر لینے سے ان کا تمام تار و پود ہی درہم برہم ہو جاتا ہے۔ ہمارے علمائے کرام اگر اسے تسلیم فرما لیں تو انہیں یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور اقدامات (اقوال و افعال) دو قسم کے تھے۔ ایک تو محض تصرفِ الٰہی سے علم یقینی کے ساتھ ملتے تھے جو وحی الٰہی تھے۔ دوسرے آپ کے بشری اقوال جو خود وحی نہیں تھے۔ اس صورت میں حق تعالیٰ پر لازم تھا کہ ان دونوں کو خلط ملط نہ رہنے دے۔ کیونکہ

(اوّل) تشریعی وحی کا بدل آئندہ (آنحضرتؐ کے بعد) کبھی نہیں ملنا تھا۔ لیکن عقلی تحقیقات کا بدل ہمیشہ ممکن ہے۔

(دوم) نیز یہ کہ اس اِمتیاز سے تشریعی وحی ایک بے مثل اور سہل الحصول مجموعہ میں محفوظ ہو جائے۔

(سوم) مزید یہ کہ حق تعالیٰ اس ممتاز مجموعہ کی حفاظت کو اپنے ذمہ لے کر اور اپنے فرض کو صحیح طور پر بجا لا کر دکھلا دے کہ جس طرح حفاظت و رحمت سے ہم نے اسے اتارا ہے۔ اسی حفاظت سے اسے پہنچا بھی دیا ہے۔

(چہارم) اگر وحی اور غیر وحی کو مخلوط رہنے دیا جاتا تو غیر محفوظ حصہ جس کی حفاظت

منظور نہ تھی۔ ضرور ہی موضوع، ضعیف، غریب اور ظنی بن جاتا۔ جیسا کہ حدیثوں کا حال ہوا ہے۔ حدیثوں نے موضوع آیتیں بھی بنائی ہیں۔ مگر شکر ہے کہ اس مجموعہ (وحی الٰہی، قرآن کریم) کے ممتاز ہوتے کے سبب وہ اس میں نہیں مل سکیں۔ موضوع آیتیں ان حدیثوں ہی میں رہیں۔ جن میں انہیں رہنا چاہیئے تھا۔ حاصل یہ ہے کہ وحی کو غیر وحی سے ممتاز کرنا خود وحی بھیجنے والے ہی کا کام ہے۔ خدا کا یہ کام صرف قرآن مجید کی صورت میں ہی ملتا ہے۔ (اگر قرآن کے سوا بھی کوئی وحی رسولِ خدا پر نازل ہوئی ہوتی تو اس کو نازل کرنے والا اس کی حفاظت بھی ضرور کر دیتا) خدا نے رسولِ خدا کی ساری وحی کو قرآن مجید میں لا کر وحی کی ضرورتوں کے مطابق اسے مکمل کر دیا ہے۔

خدا فرضِ منصبی سے غافل نہیں

ہمارے علمائے کرام کے خیال میں قرآنِ مجید نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بہت سی وحی کو چھوڑ بھی دیا ہے۔ اور اسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بشری اور عقلی اقوال و افعال کیساتھ گڈمڈ رہنے دیا ہے اب اگر ہمارے علمائے کرام حدیثی بیانات کو وحی اور غیر وحی کا مجموعہ قرار دیں تو اس سے ثابت ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے وحی اور غیرِ وحی کو جدا جدا کر دینے کا فرض خود ادا نہیں کیا۔ بلکہ بہت کچھ ہم پر بھی چھوڑ دیا ہے تاکہ ہم خود ہی وحی اور غیر وحی کو سونگھ سونگھ کر اختیار کرتے رہا کریں کہ کس حدیثی قول کو وحی ٹھہرائیں اور کس کو رسول کی اپنی رائے قرار دیں۔

منصبِ رسالت

ہمارے حضرات علمائے کرام رسول کی بشری اور عقلی باتوں کو بھی وحی بنانا چاہتے ہیں تاکہ وحی اور غیر وحی میں کسی تمیز کی ضرورت ہی نہ رہے۔ ان کے نزدیک عہدۂ رسالت ایک ایسا منصب ہے جہاں غیرِ وحی کو بھی وحی کا ہی امتیاز اور مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی باتوں میں قول بشر اور قولِ خدا کا ایک ہی مفہوم ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک رسولِ خدا کی بشری اطاعت بھی بعینہٖ وحی کی اطاعت کے برابر ہے۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ

بشری و عقلی اقوال میں سے بعض کی تصدیق اور بعض کی تردید | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی طرف جو خدا کی طرف سے وحی (قرآن) نازل ہوئی ہے اس میں حضور اکرم کے بہت سے بشری اور عقلی اقوال وافعال کی تصدیق کر دینا ضروری قرار دیا گیا ہے بلکہ قرآن مجید میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بہت سے حالات وواقعات (بعد از وقوع بھی) درج کر کے انہیں محفوظ کر دینا لازم سمجھا گیا۔ اس مجموعۂ وحی (قرآن کریم) میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بہت سے ارشادات واقدامات کی اصلاح بھی فرمائی گئی ہے اور کئی باتوں کی کھول کر تردید بھی کر دی گئی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جن باتوں کی مجموعۂ وحی (قرآن کریم) میں نہ تصدیق کی گئی ہے نہ تردید فرمائی گئی ہے۔ وہ محض عقل پر ہی چھوڑی گئی ہیں۔ ان کو نہ مصدقہ وحی کہہ سکتے ہیں نہ مکذبۂ وحی۔ حاصل یہ ہے کہ وہ وحی جو ایک حد تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بشری اور عقلی باتوں کی تصدیق و تردید اور اصلاح سب کو اپنے ہاتھ میں لینا ضروری سمجھتی ہے۔ اس کی نری خاموشی کسی بات کی قطعی صحت کی دلیل نہیں بن سکتی مگر بڑا افسوس ہے کہ ہمارے علمائے کرام اس سچی اور سیدھی بات کو نہیں مانتے اور الٹ پلٹ دعووں پر اتر آتے ہیں۔

تضادات ہمارے علمائے کرام کا ذہن چونکہ اس مسئلہ میں صاف نہیں ہے۔ اس لئے عجیب وغریب تضادات آپ کو ان کی تحریروں میں ملیں گے۔ یہاں ہم ان کے چند تضادات جو اس موضوع سے تعلق رکھتے ہیں بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔

اوّل بحوالۂ امام شافعیؒ اور علامہ ابن القیمؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے کل احکام، فہم قرآن پر مبنی تھے یعنی آپ کے تمام اقدامات اور تمام ارشادات قرآن کریم ہی سے ماخوذ اور مستنبط ہوتے تھے۔ اس اخذ و استنباط یعنی اجتہاد میں آپ سے غلطی بھی ہو جاتی تھی لیکن ان اغلاط پر تنبیہ الٰہی وارد ہو جاتی تھی مثلاً

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ۔ (۹/۴۳) اے پیغمبر! اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے مگر آپ نے ان منافقین کو (تبوک کی جنگ سے پیچھے رہ جانے کی) اجازت کیوں دے دی۔ آپ کو معلوم تو ہو جاتا کہ کون لوگ سچ بول

رہے ہیں اور آپ جھوٹوں کو بھی پہچان لیتے۔

اور :۔ يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (۶۶/۱)

اے پیغمبر اسلام! آپ ان چیزوں کو کیوں حرام کئے لیتے ہیں، جنہیں اللہ نے آپ کے لئے حلال کیا ہے۔

لیکن جن امور پر تنبیہ نہیں فرمائی گئی وہ مسلم رہتی تھیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنی بشری عقل سے اجتہاد فرمایا کرتے تھے اور جہاں تک حضورؐ اپنی بشری عقل سے صحیح چلتے تھے خدا خاموش رہتا تھا، مگر جہاں آپ غلطی کھا جاتے تھے خدا تعالیٰ قرآن مجید کے ذریعہ سمجھا دیا کرتا تھا، یعنی "قرآن مجید کے سوائے باقی سب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا اپنا بشری فہم ہی تھا، مگر چونکہ اس فہم کی غلطیاں خدا کی وحی نکال دیتی تھی۔ اس لئے باقی اگرچہ وحی نہ ہوتا تھا مگر مسلم رکھا جاتا تھا۔" اس میں حضرات علمائے کرام نے صاف اقرار کر لیا ہے کہ رسول اللہ کے اقدامات وارشادات آپ کی عقل اختیار پر مبنی اجتہادات ہوتے تھے اور آپ کے فہم واجتہاد میں غلطیاں بھی ہوتی تھیں لیکن وہ بعد میں وحی الٰہی کے ذریعہ نکال دی جاتی تھیں۔

لیکن پھر دوسری طرف ہمارے یہی علمائے کرام اس کے بھی مدعی ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی کے حق تعالیٰ نے تفسیر قرآن کرنے کی قوت عطا فرمائی ہوئی تھی۔ چنانچہ آپ کی تفسیر تفہیم الٰہی سے ہوا کرتی تھی۔ حدیثیں نازل ہوتی تھیں۔ وہ وحی خفی ہوا کرتی تھیں۔ جو قرآن کے علاوہ تھیں۔ وغیرہ وغیرہ ــــــــ

ان دعووں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا فہم پہلے سے ہی تفہیم الٰہی سے ہوا کرتا تھا۔ اب اگر یہ صحیح ہے کہ آپ کا فہم، تفہیم الٰہی سے تھا تو اس میں غلطی نہیں ہو سکتی جس کی بعد میں اصلاح فرمائی جائے۔ اب ان دونوں باتوں میں سے کونسی بات کو مانا جائے۔

دوم :۔ ایک طرف یہ فرمایا جاتا ہے کہ احادیث نبوی بہ تفہیم الٰہی قرآن مجید کی تفسیر ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ جب تک متن موجود نہ ہو تفسیر کیسے ہو سکتی ہے۔ اس

سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر قرآن مجید کی آیات نازل ہونے کے بعد ہی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو سکھائی جاتی تھی۔ اس سے پہلے کے فہم قرآن مجید کی تفسیر نہیں ہوتے تھے۔ اور نہ وہ خدا کے سکھائے ہوئے ہی ہوتے تھے۔

لیکن اس کے برعکس قرآن کریم کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ غزوۂ بدر غزوۂ اُحد، جنگ احزاب اور جنگ حنین وغیرہ کے واقعات کی توثیق یا تردید ان کے واقع ہو چکنے کے بعد قرآن میں نازل ہوئے تھے۔ اور تمام روزمرہ کی ضروریات مثل میراث، نکاح، طلاق، حرام و حلال، غسل و وضو وغیرہ کے احکام قرآن کریم میں مدینہ منورہ میں بہت بعد میں پیچھے لائے گئے۔ حالانکہ ان پر شروع سے ہی کسی نہ کسی طریقہ سے عمل ہوتا آرہا تھا اور اسی طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے ضروری حالات بعد از وقوع قرآن مجید میں لانے ضروری سمجھے گئے۔ تو مذکورہ بالا غزوات میں جو کچھ آپ نے کیا تھا یا فرمایا تھا جن کا بعد میں تذکرہ قرآن کریم نے کیا ہے وہ کن آیات قرآنیہ کی تفسیر تھے؟ کیا وہ انہی آیات کی تفسیر تھے جو غزوات کے بعد نازل ہوئیں۔ تو کیا تفسیر پہلے آگئی تھی اور متن بعد میں نازل ہوا تھا، اسی طرح روزمرہ کی ضروریات، مثلاً میراث، نکاح، طلاق، حرام و حلال غسل اور وضو کے احکام جو مدینہ منورہ میں نازل ہوئے ہیں۔ مکی زندگی میں کسی نہ کسی صورت سے ان کی بجا آوری ہوتی رہی تھی لیکن قرآن کریم میں اس وقت ان کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے ان کی بجا آوری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے ارشادات کے مطابق ہی ہو رہی تھی تو کیا، وہ ارشادات جو آپ نے مکہ میں دیئے تھے ان آیاتِ احکام کی تفسیر تھے جو مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں۔ یہاں بھی وہی مشکل درپیش ہے کہ تفسیر پہلے آرہی ہے اور متن بعد میں۔ اسی طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ضروری حالات بعد از وقوع قرآن کریم میں لانے ضروری سمجھے گئے ہیں، تو کیا آپ کی زندگی کے وہ حالات جب آپ سے سرزد ہوئے تھے ان آیات قرآنیہ کی تفسیر تھے جو بعد از وقوع قرآن کریم میں نازل ہوئیں۔ ان تمام صورتوں میں تفسیریں پہلے آرہی ہیں اور متن یعنی قرآن کریم کی آیات بعد میں آرہی ہیں۔

ہمیں تو اس سے یہ نظر آتا ہے کہ بعد از وقوع جو آیات نازل ہوئی ہیں ان سے

مقصود ہی یہ بتانا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے بشری اور عقلی اجتہاد سے جو کچھ فرمایا تھا یا جو کچھ کیا تھا چونکہ اس کی ابدی دینی حیثیت نہیں تھی۔ اس لئے ان قولی اور فعلی احادیث کی توثیق و تصدیق بعد میں قرآن میں نازل کر کے یہ بتانا مقصود ہے کہ اب وہ دین میں ابدی حجت ہوں گی۔ لہٰذا حدیثوں کا قرآنی اصلاح و تصدیق کی محتاج ہونا اس سے ثابت ہو جاتا ہے۔

سوم:۔ ایک تیسرا تضاد بھی ملاحظہ فرمایئے۔ ایک طرف تو ہمارے حضرات علمائے کرام اس کے مدعی ہیں کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے جملہ احکام قرآن مجید ہی کا فہم تھے۔ اور دوسری طرف اس کے بھی مدعی ہیں کہ قرآن کے عام حکم کو آپ اپنے خصوصی اختیارات سے خاص بھی کر سکتے ہیں۔ یعنی قرآن کا فہم تو حکم کے عموم کو بتا رہا ہے مگر رسول حکم خداوندی میں تخصیص کر لیتا ہے۔ اور یہ تخصیص مفسروں والی تخصیص نہیں ہوتی جو کسی قرآنی حکم یا عقلی سند سے کی جاتی ہے بلکہ یہ خدائی حکم کے مطابق علیحدہ اپنا استقلال رکھتی ہے۔ اور اب یہ بات بالکل ہی واضح ہے کہ تخصیص مفہوم سے الگ چیز ہی ہوتی ہے۔ جس کے لئے الگ سند کی ضرورت لازم ہے۔ پس خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قول کو ہی وہ سند قرار دے لینا، بتلاتا ہے کہ رسولؐ کو قرآن کے خلاف کر لینے کا بھی مستقل حق حاصل ہے۔ اہل حدیث حضرات کی طرف سے اس کی جو مثالیں دی جاتی ہیں ان میں سے صرف دو ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ (۴/۱۱)

خدا تمہیں تمہاری اولاد کے بارہ میں وصیت فرماتا ہے کہ لڑکے کو اتنا حصہ ملے گا جتنا دو لڑکیوں کو ملتا ہے۔

قرآنی فہم کا تقاضا یہ ہے کہ یہ حکم عام ہو اور سب پر اس کا اطلاق کیا جائے۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو غیر انبیاء کے لئے مخصوص کر لیا ہے۔ اور آپ نے فرما دیا ہے

نَحْنُ مَعْشَرَ الْاَنْبِيَاءِ لَا نَرِثُ وَلَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ

ہم انبیاء کا گروہ ہیں نہ ہم کسی کے وارث ہوتے ہیں نہ کوئی ہمارا وارث ہوتا ہے ہم

جو کچھ چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے۔ ؎۱

(۲) قرآن کریم کا ارشاد ہے

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ الآیہ (۲۴/۵۵) اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لے آئے ہیں اور صلاحیت بخش اعمال کر رہے ہیں وعدہ کیا ہے کہ ان کو زمین میں خلافت عطا فرمائے گا جیسا کہ اس نے تم سے پہلوں کو خلافت عطا فرمائی تھی۔

قرآن کا یہ حکم تمام اہل ایمان کے لئے عام ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے اختیار خاص سے اسے خاص فرمالیا اور حکم دیدیا کہ الائمۃ من قریش۔ اور الخلافۃ فی قریش (یعنی خلفاء قریش میں سے ہوں گے۔ یا خلافت قریش میں رہے گی۔ ؎۲

ہم اس فہم قرآنی کو سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں جس میں غور و فکر کرنے والے کو یہ حق بھی حاصل ہوتا ہے کہ قرآن کے عمومی حکم میں سے جسے چاہے مستثنیٰ کرلے اور عمومی حکم کو خاص بنا لے۔

چہارم: ہم نے اس سے پہلے گذارش کی تھی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک بشر تھے۔ اور ہماری طرح ایک مخلوق تھے۔ اور خالق اور مخلوق کی اطاعت میں فرق ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت غیر وحی میں ایسی ہی ہے

؎۱ خواجہ صاحب کا یہ اعتراض اہلحدیث نقطۂ نظر کے بموجب ہے ورنہ فی الحقیقت اس حدیث میں کوئی حکم نہیں ہے بلکہ خبر ہے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام دولت اور روپیہ پیسہ یا زمین و جائداد جمع ہی نہیں کرتے کہ اس میں وراثت کی تقسیم جاری ہو سکے جو کچھ ہوتا ہے وہ مملکت کی ملکیت ہوتا ہے البتہ انبیاء کی تحویل میں ہوتا ہے اور مرنے کے بعد وہ بعد میں آنے والے خلیفہ کی تحویل میں چلا جاتا ہے۔ اس میں وراثت کہاں سے چلے گی؟ (ناشر)

؎۲ یہ اعتراض بھی اہلحدیثوں کے نقطۂ نظر کے بموجب ہے ورنہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہاں بھی آپؐ کا کوئی حکم نہیں ہے کہ عام حکم کو خاص کر لینے کا الزام دیا جا سکے یہ محض خبر ہے اور واقعہ یہی ہے کہ آپ کے بعد آئمہ قریش ہی میں سے ہوئے ہیں۔ (ناشر)

جیسا کہ ہم حکام وقت کی یا ماں باپ اور اُستادوں کی اطاعت کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں علمائے اہلِ حدیث کی طرف سے فرمایا جاتا ہے کہ " رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی حیثیتوں میں فرق ہے ایک حیثیت آپ کی بشریت کی ہے۔ دوسری حیثیت آپ کی رسالت کی ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم بشری حیثیت میں ہماری طرح ایک مخلوق ہیں۔ اس حیثیت میں آپ کی اطاعت نہ فرض ہے نہ واجب لیکن بوصف رسالت اور بحیثیت نبوت ان کی شان یہ ہے کہ ان کی اطاعت بعینہ اللہ کی اطاعت بن جاتی ہے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ۔

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ (جو رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔

اس کی مثال ہائی کورٹ اور پریوی کونسل کے جج کی ہے جو بحیثیت مملکت کا ایک فرد اور رعیت ہونے کے کوئی چیز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس منصب پر مقرر ہونے سے پہلے اس کا فیصلہ کچھ بھی نہیں اور پنشن ہو جانے کے بعد بھی وہ ہیچ ہے لیکن بحیثیت وصف حکومت، چیف جسٹس ہونے کے جو کچھ ہے وہ ظاہر ہے"
اس کے جواب میں جب سوال کیا گیا کہ ہائی کورٹ کا جج قبل از تقرر اور بعد از پنشن تو قانون میں کوئی دخل نہیں رکھتا مگر جب وہ جج کے عہدے پر مامور ہو جاتا ہے تو اس کی حیثیت بدل جاتی ہے۔ اس وقت اس کی رائیں اور فہم بعینہٖ قانون سمجھے جاتے ہیں۔ بعینہٖ اسی طرح آپ کے نزدیک رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم قبل از نبوت تو بشر تھے اور بشری محدود فہم و اختیار رکھتے تھے مگر نبوت کے منصب پر سرفراز ہونے کے بعد کیا آپ کی حیثیت اس معنے میں بدل گئی تھی کہ آپ اب بشر نہیں رہے تھے۔ اس وقت آپ کا وہی محدود بشری فہم بعینہٖ وحی کے مساوی ہو گیا تھا اور وہ عقلی اور اختیاری حیثیت سے نکل گیا تھا؟ تو بجائے اس کا جواب دینے کے وہ ہم پر ناراض ہونے لگتے ہیں ۔
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک رسولِ خدا کی زمانۂ نبوت میں بھی بشری حیثیت نہیں بدلی تھی اور اس وقت بھی آپ کا وہی محدود بشری فہم

بعینہ وحی کے مانند نہیں بن جاتا تھا اور اپنی عقلی حیثیت سے نہیں نکل جاتا تھا۔ صرف بوصف رسالت ہی حضور کی اطاعت بعینہ حق تعالیٰ کی اطاعت ہوتی تھی۔ چنانچہ قرآن کریم کی آیات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ رسول ہونے اور وحی نازل ہونے کی حالت میں بھی بشر ہی ہوتے تھے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ

(۱۸، ۱۱۰، ۴۱/۹) اے پیغمبر! کہدیجئے کہ میں تو تم جیسا انسان ہی ہوں البتہ مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔

اور قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (۱۷/۹۳)

اے پیغمبر! کہدیجئے۔ میرا پروردگار پاک ہے، میں ایک بشر اور ایک رسول ہونے کے سوا اور کیا ہوں۔

اس کے علاوہ قرآن کریم میں اس مفہوم کی اور بھی کئی آیتیں ہیں جن سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ رسول بحالت رسالت بشر ہی ہوا کرتے تھے۔ وہ نبی ہو کر بشری حیثیت سے نکل نہیں جاتے تھے اگر علمائے اہل حدیث بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں تو ہم میں اور ان میں کوئی اختلاف ہی نہیں رہ جاتا۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ زمانۂ نبوت میں بھی، رسول خدا کی بشری اطاعت صرف بشری اطاعت ہی رہتی تھی کچھ بدل نہیں جاتی تھی اور عقلی حیثیت سے خارج نہیں ہو جاتے تھی صرف وہی اطاعت خدا کی اطاعت ہوتی تھی۔ جسے آپ محض بوصف رسالت پہنچاتے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ رسولی حیثیت کا کام صرف (اور صرف) بلاغ ہی ہوتا ہے۔

وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ (۵/۹۹) رسول کے ذمہ تو محض پہنچا دینا ہے۔

اب ہم میں اور اہل حدیث حضرات میں صرف اتنا فرق رہ جاتا ہے کہ ہمارے نزدیک بشری عقل کی اطاعت بھی بسا اوقات فرض ہوتی ہے مگر علمائے اہل حدیث کے نزدیک رسول کی بشری اطاعت اس قدر ناکارہ ہوتی ہے کہ وہ نہ فرض ہوتی ہے نہ واجب۔

حاصل یہ ہے کہ اس نکتہ پر علمائے اہلِ حدیث کے نزدیک زمانۂ نبوت میں بھی جبکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام وصف نبوت رکھتے تھے حضورؐ کی بشری اطاعت بشری اطاعت ہی رہتی تھی۔ اس کی حیثیت کچھ بدل نہیں جاتی تھی۔ لیکن ان حضرات کے دوسرے بیانات اس کے برخلاف ہیں۔ اب ناظرین خود ہی بتائیں کہ ان کے ان دعوؤں میں سے کونسا صحیح ہے آیا زمانۂ نبوت میں رسول کی بشری اور عقلی اطاعت بشری اور عقلی ہی رہتی ہے یا بدل جاتی ہے؟

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت

ہمارے رسولِ مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کوئی نئے انداز کے رسول نہ تھے۔

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝ (۴۶/۹)

اے پیغمبر! کہدیجئے کہ میں کوئی انوکھا رسول تو ہوں نہیں۔ مجھے کیا معلوم کہ (کل کو) میرے ساتھ اور تمہارے ساتھ کیسا معاملہ کیا جائے گا۔ میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں۔ جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ میں تو صرف ایک کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں، اور بس۔

پہلا یا پچھلا یا درمیانی رسول ہونا ایک امرِ اضافی ہے۔ بشری حیثیت سے آپ بھی ویسے ہی رسول تھے جیسے دوسرے انبیاء تھے۔ اس حیثیت سے اوروں کی طرح آپ سے سہو ہو جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے کئی دفعہ حضور کو غلطی کا ارادہ کرنے اور اسکی طرف جھکنے کے ساتھ ہی خبردار فرما دیا جیسے ارشاد ہے

وَلَوْلَا أَن ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدتَّ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ۝ (۱۷/۷۴)

اور اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو آپ ان کی طرف تھوڑا بہت جھکنے لگے تھے۔

اور کئی دفعہ سہو ہو چکنے کے بعد اطلاع دی جاتی جیسے فرمایا

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ ۝ (۶۶/۱)

اے پیغمبر! آپ اُن چیزوں کو اپنے اُوپر کیوں حرام کئے لیتے ہیں جو اللہ نے آپ کے لئے حلال کی ہیں۔ (مزید ملاحظہ ہو ۹/۴۳، ۴۸/۱۹، ۴/۲۹، ۲۴/۵۰ وغیرہ)

نیز زبانِ رسولؐ سے کہلوایا

وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْءُ ۚ (۹/۱۸۸) اگر میں غیب جانتا ہوتا تو بہت سی بھلائی اکٹھی کر لیتا اور مجھے کوئی برائی نہ پہنچتی۔

اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ حضورؐ کو بعض غلطیوں کی اِطلاع دیجاتی تھی۔ مگر بعض ایسی تھیں جن کا بلا تعین و تشخص ہی ذکر ہوا ہے۔ پھر بعض کاموں کی اِطلاع حضورؐ کو بار بار دی جاتی تھی۔ لیکن بشریت بھی عجیب چیز ہے کہ جنابؐ سے باوجود اطلاع کے ان کاموں کا اِرادہ بلکہ عمل بھی وجود میں آ ہی گیا۔ غم کرنے (یعنی کافروں کے نہ ماننے پر غمگین ہونے) سے آپ کو بار بار روکا گیا اور فرمایا

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۞ (۲۶/۳)

شاید آپ تو اپنے آپ کو ہلاک ہی کر ڈالیں گے کہ وہ مؤمن کیوں نہیں بن جاتے

اور فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۞ (۱۸/۶) تو اے پیغمبر! شاید آپ تو افسوس کے مارے ان کے پیچھے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے اگر وہ اس کلام (قرآن) پر ایمان نہ لے آئے۔

اور فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ۔ (۳۵/۸)۔ ان پر حسرتیں کرتے کرتے آپ کی جان ہی جاتی نہ رہے۔

مگر چونکہ آپ بشر تھے اس لئے بشری تقاضوں سے آپ رُکے نہ رہ سکتے تھے۔ حضورؐ کو ایک مرتبہ قرآن مجید کے ساتھ جلدی کرنے سے روکا گیا۔

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ۞ (۲۰/۱۱۴) اور قرآن کے ساتھ اس سے پہلے کہ آپ کی طرف اس کی وحی پوری ہو چکے پڑھنے میں جلدی نہ کیا کیجئے اور دُعاء کیا کیجئے کہ اے پروردگار میرے علم میں اضافہ فرما دے۔

اس کے بعد پھر دوبارہ منع فرمایا گیا۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ۝ (۷۵ / ۱۶-۱۷) قرآن کے ساتھ (اے پیغمبر!) اپنی زبان کو جلد جلد حرکت نہ دیجئے۔ قرآن کا جمع کرنا اور اسے پڑھوا دینا ہماری ذمہ داری ہے۔

ان دونوں امتناعی حکموں میں سے جس کو بھی پہلے قرار دیدو، دوسرے حکم کا دوبارہ آنا صاف آپؐ کی بشری کیفیت کو واضح کر دیتا ہے۔

کفار عذاب الٰہی کو جلدی مانگتے اور دیر پڑنے کے سبب قرآنی وعیدوں کو جھوٹا کہتے اور مذاق اڑاتے تھے۔ جوں جوں دیر ہوتی تھی۔ حضورؐ کا دل بھی گھبراتا تھا۔ اس لئے آپ کو کئی مرتبہ تنبیہ کی گئی۔ فرمایا کہ

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ (۶۸ / ۴۸)

اپنے رب کے فیصلہ کے لئے صبر سے کام لیجئے (جلدی نہ کیجئے) اور مچھلی والے پیغمبر (حضرت یونسؑ) کی طرح نہ بنئے۔

اور فرمایا کہ مجھے اور مکذبین کو چھوڑ دیجئے اور حکم فرمایا کہ ان پر جلدی نہ کیجئے اور انہیں کچھ مہلت لے لینے دیجئے۔

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ۝ وَ ذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَ مَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ۝

(۷۳ / ۱۰-۱۱) اور جو کچھ وہ کہتے ہیں اس پر صبر کیجئے اور انہیں اچھی طرح چھوڑ رکھیئے۔ اور مجھے اور ان خوش حال جھٹلانے والوں کو نمٹنے دیجئے اور انہیں تھوڑی سی مہلت تو دیدیجئے۔

اور سخت تاکید اور زور کے ساتھ جتلایا کہ

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ ۝ (۳ / ۱۲۸)۔ ہمارے امر میں آپ کا کوئی دخل نہیں ہے۔

یہ بھی سمجھایا کہ آپ کا اس میں کیا دخل ہے۔ آپ کا کام تو پہنچانا ہے اور ہمارا کام حساب لینا ہے۔

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝ (۱۳/۱۴) اگر کچھ ایسے عذاب جن کا ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں آپ کو بھی آپ کی زندگی میں دکھا دیں یا آپ کو وفات دیدیں (اور آپ انہیں نہ دیکھ سکیں تو ہماری مرضی) آپ کے ذمہ تو محض پہنچا دینا ہے۔ اور حساب لینا ہمارا کام ہے۔ وغیرہ وغیرہ

اور رسولِ خدا کی بشری کمزوری کو واضح کر دینے کے لئے فرمایا کہ

قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِىْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِىَ الْاَمْرُ بَيْنِىْ وَ بَيْنَكُمْ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝ (۶/۵۸) اے پیغمبر! کہدیجئے کہ اگر میرے ہاتھ میں وہ چیز (عذاب الٰہی) ہوتی جس کی تم جلدی مچا رہے ہو (تو میں تو اب تک کبھی کا عذاب نازل کر چکا ہوتا۔ اور) میرے اور تمہارے درمیان (کبھی کا) فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جلد بازی بشریت کا تقاضا ہے اگرچہ نبی اور رسول ہی کیوں نہ ہو۔

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (۲۱/۳) انسان کی پیدائش ہی جلد بازی سے ہوئی ہے۔

پھر حق تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑے زور کے ساتھ روکا کہ خدا پرست غریبوں کو اپنے پاس سے نکال کر ظالم نہ بن جانا۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِىِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَىْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَىْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (۶/۵۲) اور ان لوگوں کو نہ دھتکاریئے جو اپنے پروردگار کو صبح شام پکارتے رہتے ہیں وہ محض خدا کی خوشنودی ہی چاہتے ہیں۔ آپ کے ذمہ ان کا کچھ حساب نہیں اور آپ کے حساب

میں سے کچھ ان کے ذمہ نہیں ہے کہ آپ انہیں دھتکار دیں اور یوں آپ ظالموں میں سے ہو جائیں۔

اور دوسرے موقعہ پر پھر تاکید فرمائی کہ حیاتِ دینوی کی زینتوں کا ارادہ کرتے ہُوئے آپ غریبوں سے مُنہ نہ موڑلیں۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۝ (۱۸/۲۸)

اور اپنے نفس کو ان لوگوں کے ساتھ ثابت قدم رکھئے جو اپنے پروردگار کو صبح و شام پکارتے اور اسی کی رضا کی خواہش رکھتے ہیں۔ اور ان سے اپنی آنکھیں نہ پھیرئے کہ آپ دینوی زیب و زینت کی خواہش کرنے لگ جائیں اور جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہشات کا پیرو ہو گیا ہے آپ اس کی اطاعت نہ کیجئے اور اس کا معاملہ تو کھلی زیادتی کا ہے۔

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر زیادہ تر کمزور اور غریب لوگ ایمان لائے تھے۔ اور قریش کے اکابر آپ کی مجلس میں ان غریبوں کی موجودگی سے کبیدہ خاطر ہوتے تھے اور اسلام کی ہدایات سُننے سے ان کی وجہ سے محروم رہ جاتے تھے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو اس سے ملال ہوتا تھا۔ آپ چاہتے تھے کہ قریش کے اکابر اسلام کی باتیں سُنیں اور اسلام لائیں اس بناء پر بشری کمزوری کی بناء پر آپ سے غرباء اور کمزوروں کے ساتھ بے توجہی اور غفلت کا صدور ہو جاتا تھا۔ اور حق تعالے کو اس پر بار بار تنبیہ فرمانی پڑتی تھی۔ یہ بشریت کا تقاضا تھا۔ اور آپ بشریت سے مُبرّا نہیں تھے۔

اللہ تعالیٰ رسولِ اکرمؐ اور مؤمنوں کا ولی ہے

اللہ تعالیٰ اپنے رسول کا ولی تھا اور جس طرح اللہ تعالیٰ رسول کا ولی تھا، وہ تمام صالح بندوں کا بھی ولی ہے۔ وہ اپنے رسول کی زبان سے کہلواتا ہے:

اِنَّ وَلِیّیَ اللّٰہُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْکِتٰبَ وَھُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیْنَ ۝ (۹/۱۹۶) بیشک اللہ میرا ولی ہے جس نے اس کتاب (یعنی قرآن مجید) کو اتارا اور وہی صالحین کا بھی ولی بنتا ہے۔

مؤمنوں کو بھی حق تعالیٰ اندھیروں سے نکال کر نور اور روشنی کی طرف لاتا ہے اور ان سے ان کی سیئات کو دُور کر دیتا ہے اور انہیں سیدھے راستہ پر چلا جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَاِنَّ اللّٰہَ لَھَادِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ (۲۲/۵۴)

بالتحقیق اللہ مؤمنوں کو سیدھے راستہ کی طرف ہدایت کرنے والا ہے۔

نیز ارشاد فرمایا

وَمَنْ یَّعْتَصِمْ بِاللّٰہِ فَقَدْ ھُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ (۳/۱۰۱)

جو شخص (اللہ کے احکام) کو مضبوط پکڑے سو وہ تحقیق سیدھے راستہ کیطرف چلا۔

ایسی بہت سی آیات قرآن مجید میں موجود ہیں۔ ایسی آیات سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ تمام مؤمن اور رسول منزہ عن الخطا ہوجاتے ہیں۔ اور ان کی بشری عقل وحی الٰہی کا کام دیتی ہے، سرتاپا باطل ہے۔

وحی کی حفاظت کا ذِمّہ لیا گیا ہے عقل کا نہیں

حق تعالیٰ نے جس چیز کی حفاظت کا ذمّہ لیا ہے وہ صرف کتابِ عزیز (یعنی وحی) ہے۔ باقی رہا وہ حصّہ جو عقل پر چھوڑ گیا ہے اور جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سہو بھی ہوجاتا تھا اور جو دوسروں کے تدبر و تفکر و تعقل پر بھی ڈالا گیا ہے جس کے متعلق آنحضورؐ کو صحابۂ کرام سے مشورے لینے کا بھی حکم دیا گیا ہے۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (۳/۱۵۹)۔ تو آپ (اے پیغمبر!) انہیں معاف فرمائیں، ان کے لئے استغفار کریں اور معاملات میں ان سے مشورہ فرمایا کریں۔ تو جب آپ پختہ رائے قائم کرلیں تو اللہ پر بھروسہ کیجئے۔

اس کی حفاظت کا کوئی ذمہ نہیں لیا گیا اور نہ اس کی وہ حفاظت وقوع میں آئی ہے جو اس وحی کے لائق ہونی چاہیئے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مقصود ہو۔ جو وحی ہمیشہ کے لئے مقصود ہوگی اس میں کوئی ادنیٰ تغیر بھی راہ نہیں پا سکتا۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝ (۱۵/۹)۔ بلاشبہ ہم نے اس ذکر (قرآن) کو نازل کیا ہے۔ اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

اور لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ۝ (۴۱/۴۲) باطل نہ اس کے سامنے سے آسکتا ہے نہ اس کے پیچھے سے یہ صاحب حکمت اور لائقِ حمد و ثنا ہستی کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

لھذا قرآنِ کریم کی حفاظت اور روایات کی عدم حفاظت کا مشاہدہ بھی اس امر کی بیّن دلیل ہے کہ قرآن کریم تو حجت ہے لیکن روایات ہرگز ہرگز حجت نہیں۔ نیز خود رسولِ کریمؐ کا انہیں محفوظ نہ کرنا بھی خود ان کی عدم حجت ہونے کی ٹھوس اور ناقابل تردید دلیل ہے کیونکہ حجت کو محفوظ نہ کرنے سے خود آپ کے فریضۂ رسالت پر زد آتی ہے۔

بدلتے ہوئے حالات اور انسانی عقل یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ حیاتِ انسانی جامد نہیں ہے بلکہ متحرک ہے اس کے حالات و واقعات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ ایک وقت وہ تھا کہ لڑائیوں میں اکیلے اکیلے بہادر نکلتے تھے اور دادِ شجاعت دیتے تھے۔ اب اس طرزِ عمل کو (اگرچہ یہ سنتِ صحابہؓ اور سنتِ رسولؐ ہی ہے) دشمن کے مقابلہ کے وقت محض فضول سمجھا گیا ہے۔ کبھی تیراندازی کو بڑی طاقت سمجھا جاتا تھا۔ اب توپ

اور بندوق تو علیحدہ رہیں۔ زنگار رنگ) مہلک گیسیں تیار ہو رہی ہیں جو ہوائی جہازوں کے ذریعہ جہاں چاہیں پھیلائی جا سکتی ہیں۔ اس وقت تو شکار کے لئے پرانی تیر اندازی کی کوئی وقعت باقی نہیں رہی پھر جنگوں میں اس سنت صحابہؓ اور سنتِ رسولؐ کو قوت سمجھنا قطعاً مہلک ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان بدلتے ہوئے حالات و واقعات میں جو روز نئے نئے پیدا ہوتے رہتے ہیں بلکہ بسا اوقات نہایت مشکل اور پیچیدہ صورتیں بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ کیا ان کے (حل کے) لئے ہر وقت نئی نئی وحی نازل ہونی چاہیئے۔ جبکہ انبیاء کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ اور ان کے حل کے لئے نئی وحی کے آنے کے امکانات مطلقاً ختم ہو چکے ہیں۔ تو اگر اب ایسے ایسے معاملات وحی پر نہیں بلکہ ہماری کمزور عقل پر چھوڑے گئے ہیں تو کیا اسی طرح کے وقتی معاملات عہدِ رسالت میں بھی رسول کی عقل پر نہیں چھوڑے جا سکتے تھے۔ رسولؐ کو وحی تو ہماری ہدایت کے لئے ہی ہوتی تھی پھر جس چیز کو ہماری اپنی ہی کمزور عقل پر چھوڑنا منظور رکھا گیا ہے کیا وہ رسولؐ کی اپنی عقل پر نہیں چھوڑی جا سکتی تھی؟

دیکھئے! جس طرح آج کل اپنی حفاظت کی خاطر گیسوں (دُور مار توپوں ٹینکوں، بمبار طیاروں، سب میرینوں اور بموں) کی خاص تاکید کرنے کے لئے کسی نئی وحی کی ضرورت نہیں۔ تو کیا اسی طرح تیر اندازی کے زمانہ میں تیر اندازی کی تاکید کرنے کے لئے وحی کی ضرورت تھی؟ یا یہ وقتی تقاضا صرف عقل پر چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ آیت کریمہ

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ (۸) اور ان (کفار) کے لئے جسقدر طاقت تم تیار رکھ سکو تیار رکھو مثلاً سرحدوں پر گھوڑوں کے رسالے باندھو تاکہ اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں پر اپنا رعب ڈال کر خوف زدہ رکھ سکو اور ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی۔

کے مطابق، جس میں ہر زمانہ کے مناسب فوجی قوت تیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ وقتی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے، جس دور میں صرف تیرو تفنگ کی ضرورت تھی۔ اس وقت تیرو تفنگ کی فوجی طاقت مہیا کر لی جاتی تھی اور آج مہلک گیسوں، توپوں، ٹینکوں اور طیاروں کی ضرورت ہے۔ آج ہم یہ سب سامان بغیر کسی نئی وحی کی تاکید کے مہیا کرتے چلے جائیں۔

صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

"جو تیر اندازی جانتا ہو، پھر اُسے ترک کر دے، وہ ہم میں سے نہیں"

دیکھئے کیسی سخت وعید ہے۔ اب اگر یہ حدیث صحیح ہے تو یہ صرف اس زمانے کے لئے ایک عقلی حکم تھا۔ حدیثوں کے مطابق، رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم تیر اندازی کا حکم دیا کرتے تھے اور اس میں لوگوں کے مقابلے بھی کرایا کرتے تھے۔ لیکن اب آج کے دور میں اور تو اور خود نبی اسماعیلؑ بھی جن کا باپ نبی اور مانا ہوا تیر انداز تھا۔ اس حکم پر بوقت جنگ (ہرگز ہرگز) عمل نہیں کرتے۔ ایسے حکموں کو وحی خفی کے نام سے خواہ مخواہ وحی الٰہی قرار دینا۔ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۷/۲۸)۔ کیا خدا کے

ذمے [redacted] باتیں لگاتے ہو جن کا تمہیں علم نہیں۔

کی وعید کے تحت آجاتا ہے۔ فتدبّروا

وحی اور عقل کا بیّن فرق

قرآن مجید میں آیا ہے کہ دشمنوں کو ڈرانے کے لئے جو بھی قوت تم سے ہو سکتی ہے تیار کرو (۸/۶۰) (آیت اوپر گزر چکی ہے) اب اس حکم کے مطابق اسلامی حکومتوں کو آج کے دور میں (توپ، ٹینک، طیارے، ایٹم بم اور) گیس وغیرہ تیار کرنے لازم ہیں۔

لہٰذا اس آیت وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا [redacted] سْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ (۸/۶۰) میں قوت سے مُراد ہرگز ہرگز تیر اندازی نہیں ہو سکتی۔ قرآن کریم نے قُوَّةٌ کا لفظ استعمال فرمایا ہے جو ہر دور کے رائج الوقت ہتھیاروں پر صادق آتا ہے۔ ایٹم بم اور گیس پر ہی محدود نہیں۔ آئندہ جنگی اختراعات اسلحہ سازی کے

سلسلہ میں ہوسکیں گی۔ وہ سب اس کا مصداق ہوں گی۔ یہ وحی کے الفاظ ہیں لیکن صحیح مسلم میں اسی آیت کی تفسیر میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ اس آیت میں لفظ قوۃ کے متعلق آپ نے فرمایا۔ "سن رکھو، تحقیق یہ قوت تیر اندازی ہے" ۔۔۔ "سن رکھو، تحقیق یہ قوت تیر اندازی ہے" ۔۔۔ "سن رکھو، تحقیق یہ قوت تیر اندازی ہے" اگر یہ حدیث صحیح ہے۔ جس میں فوجی قوت کو تین مرتبہ کے تکرار کے ساتھ تیر اندازی پر موقوف کیا گیا ہے) تو یہ تفسیر خدائے عالم الغیب کی طرف سے نہیں ہوسکتی جو یقیناً جانتا ہے کہ فوجی طاقت کو تیر اندازی پر موقوف کر دینا سراسر غلط ہے۔ کیونکہ اسلحہ کی دوڑ ایک دن ایٹم بموں اور میزائلوں تک کو پیچھے چھوڑ جائیگی۔ لہذا یہ کچھ رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم نے صرف اپنے گرد و پیش کے حالات کے مطابق اپنی محدود عقل و اختیار سے ہی ایسا فرمایا ہوگا۔ اسے عقل کی حدود ہی میں محدود کہا جا سکتا ہے۔ وحی تو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس سے وحی اور عقل کا فرق صاف واضح ہوجاتا ہے کہ وحی اپنے مفہوم کے لئے پیرایۂ بیان کیا اختیار کرتی ہیں اور بشری عقل کیا اختیار کرتی ہے۔

وحی صرف تصرف الٰہی میں ہے قرآن مجید، حق تعالیٰ کی وحی ہے۔ اسے حق تعالیٰ نے (بغیر کسی کے مشورہ یا خواہش کے دخل کے) خاص اپنے تصرف اور دخل سے نازل فرمایا ہے۔ نیچر اور نیچر میں دخل جسے کوئی ٹال نہ سکے، دو چیزیں ہیں۔ ان کا فرق پہلے بیان ہوچکا ہے۔ عقل اور وحی میں بھی بالکل یہی فرق ہے۔ تعظیم اور عبادت کا امتیاز بھی اسی سے ہوسکتا ہے۔ نیچرل (مادی) ولایت اور مدد دوسروں سے طلب کی جا سکتی ہے۔ مگر تصرفاتی ولایت اور مدد صرف حق تعالیٰ ہی کا خاصہ ہے۔

هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ (۱۸) وہاں تو ولایت اللہ ہی کے لئے ہے جو حق ہے۔

اسی طرح عقلی مدد اور مشورہ دوسروں سے بھی مانگ سکتے ہیں۔ لیکن وحی

مانگ کر یا خواہش کر کے یا دُعاء کر کے نہیں لی جا سکتی۔ کیونکہ وحی کرنا بِلا دخلِ غیرے حق تعالیٰ ہی کا اپنا کام ہے۔

عابدانہ اِطاعت اور عاقلانہ و منتظمانہ اِطاعت

قرآن مجید صرف عقلاً ثابت شدہ حق ہی نہیں بلکہ ایسا حق ہے، جو خود حق تعالیٰ نے بتلایا بھی ہے اس (قرآن) کی اطاعت محض عقلی اطاعت ہی نہیں بلکہ حق تعالیٰ کی عابدانہ اطاعت ہے۔ اب اگر وحی الٰہی یعنی خدا کی اطاعت کے ساتھ کوئی اور اطاعت بھی لازم قرار دیدی جائے اور اسے بھی عابدانہ اطاعت سمجھا جائے تو اس سے صراحتہً دو معبودوں کا ماننا لازم آئے گا۔ حق تعالیٰ اس بلا سے اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔ اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ خدا کے ساتھ رسولؐ کی الگ اطاعت ہرگز ہرگز عابدانہ اطاعت نہیں بلکہ محض عاقلانہ و منتظمانہ اطاعت ہو سکتی ہے۔

بلا شبہ اطاعت دو قسم کی ہے، ایک عابدانہ اور دوسری عاقلانہ و منتظمانہ۔ عابدانہ اطاعت صرف وحی الٰہی کی ہے اور اس کے برعکس اُستاد، ماں باپ حکیم ڈاکٹر اور حکام و سربراہ کی اِطاعت عاقلانہ اور منتظمانہ ہے ـــ حاصل یہ ہے کہ جس اطاعت میں کسی کی ذات کو ہی اصل دلیل بنایا جائے اور اس کے ساتھ کسی دوسری دلیل کے ہونے نہ ہونے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی جائے وہ اطاعت اس مطاع کی عبادت ہوتی ہے۔ یہ اطاعت عابدانہ ہے اور یہ سوائے حق تعالیٰ کے کسی اور کے لائق ہرگز نہیں ہے اور حق تعالےٰ کسی کو بھی اپنے ساتھ ایسی اطاعت کا حقدار نہیں بناتا۔

وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا ■ (۱۸/۲۶) اور وہ اپنی حکومت یا حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

نصاریٰ اپنے احبار و رہبان (علماء اور درویشوں) کی اور مسیحؑ بن مریم کی عابدانہ اطاعت کرتے تھے۔ اُن میں پوپوں کی ایسی اطاعت اب تک چلی آتی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ انہوں نے اپنے احبار و رہبان کو اللہ کے سوائے

رب بنا لیا۔ اور چونکہ یہ عابدانہ اطاعت حضرت مسیح ابن مریم علیہما السلام کی بھی قطعاً حرام ہے اس لئے آیت میں ان کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ (۹/۱۱) انہوں نے اپنے علماء اور پادریوں کو اللہ کے علاوہ اپنا رب بنا لیا ہے اور مسیح ابن مریم کو بھی۔

(یاد رہے کہ) انبیاء و رسل لوگوں کو اپنے عابد اور عبد بنانے کے لئے نہیں آئے تھے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۙ (۳/۷۹) کسی انسان کو یہ بات زیبا نہیں کہ اللہ اسے کتاب، حکومت اور نبوت عطا فرمائیں پھر وہ لوگوں سے کہنے لگے کہ تم سب خدا کے بجائے میرے بندے (مطیع و فرمانبردار) بن جاؤ۔ لیکن (وہ تو یہی کہے گا کہ) اللہ والے بن جاؤ۔ کیونکہ تم کتابِ الٰہی کی تعلیم دیتے رہے ہو اور اسی کو پڑھتے پڑھاتے رہے ہو۔

قرآن کہتا ہے کہ کیا یہ لوگ پہلے موحد ہوتے ہیں اور رسول انہیں مشرک بنانے کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔

وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ۗ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ (۳/۸۰) اور وہ تمہیں یہ حکم بھی نہیں دے گا کہ تم فرشتوں اور انبیاء کو اپنا رب بنا لو۔ کیا وہ اس کے بعد کہ تم اسلام لا چکے ہو تمہیں کفر کرنے کا حکم دے گا؟ (ہرگز نہیں) معاذ اللہ

یہی عابدانہ اطاعت ہے جس کے لئے بار بار فرمایا ہے کہ حکم خدا کے سوا کسی کا نہیں ہے۔ سن رکھو کہ حکم صرف اسی کا ہے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۶/۵۷، ۱۲/۴۰، ۱۸/۲۶) خبردار پیدا کرنا اور حکم کرنا صرف اسی کے لئے ہے اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (۷/۵۴)، نیز فرمایا کہ میں خدا کے سوا کوئی اور حکم بنا لوں؟ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا (۶/۱۱۴) جبکہ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ ۝ (۲۱/۲۳)

جو کچھ بھی وہ کرتا ہے اس سے کوئی نہیں پوچھ سکتا، البتہ ان سب سے پوچھا جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ

برعکس اس کے دوسری آیتوں میں حق تعالیٰ کے سوا بھی حکم بتلائے گئے ہیں مثلاً جائز باتوں میں ماں باپ کی اطاعت

وَ اِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَ هُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝ وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّ فِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝ وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۝ (۳۱/۱۳-۱۵)

اور یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا اور وہ اسے نصیحت کر رہے تھے کہ بیٹا! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا۔ یقیناً شرک بڑا ہی ظلم ہے اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے متعلق وصیت کی ہے۔ اس کی ماں نے اسے ضعف پر ضعف کے باوجود (پیٹ میں) اٹھائے رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑایا کہ میرا اور اپنے والدین کا شکر ادا کرتے رہنا تم کو میری طرف ہی لوٹنا ہے ہاں اگر والدین تمہیں میرے ساتھ کسی کو شریک ماننے پر مجبور کریں جسے تم شریک نہیں جانتے تو ان کی ہرگز اطاعت نہ کرنا۔

مومن حاکم کی اطاعت

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ (۴/۵۹) اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اربابِ حکومت کی بھی۔

اور چونکہ قرآن مجید میں مطلقاً اختلاف نہیں ہے۔ اس لئے لازم آتا ہے کہ دونوں قسم کے حکم مختلف کیفیت کے ہوں۔ اس سے صاف کھل جاتا ہے کہ حق تعالیٰ کی اطاعت عابدانہ اطاعت ہے اور دیگر حکموں کی اطاعت، خواہ رسول ہوں یا غیر رسول حکام ہوں یا ماں باپ صرف عقلی و انتظامی

اِطاعت ہے۔ حق تعالیٰ کی عابدانہ اِطاعت میں کسی نبی اور رسول کو بھی شامل کرنے سے لامحالہ شرک ہو جائے گا۔ اور مؤمن کے لئے اس سے پرہیز لازم ہے۔

حدیث کی کوئی کتاب بھی کتابٌ مِن عِندِاللہ نہیں ہے

اب جبکہ قرآن کریم سچ مچ حق تعالیٰ کی کتاب ہے اور جملہ انسانوں کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ضابطۂ حیات ہے۔ تو ہمارا اس کی اطاعت کرنا ہماری عابدانہ اِطاعت ہے۔ اس اطاعت سے ہم اپنے آپ کو سیدھے تصرف الٰہی کے تحت میں ڈال دیتے ہیں۔ اس اطاعت میں ہم بندے بن کر بندوں کی طرح اپنی طرف سے کوشش کرتے ہیں اور ہم شُرُورِ اَنفُسِنَا اور سَیِّئَاتِ اَعمَالِنَا سے اسی کی پناہ میں آجاتے ہیں۔ حق تعالیٰ چونکہ مؤمنین صالحین کا ولی ہے۔

اِنَّ وَلِیِّیَ اللّٰہُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْکِتٰبَ وَھُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیْنَ ۝ (۷/۱۹۶)

بے شک میرا حمایتی تو اللہ ہی ہے جس نے یہ کتاب (قرآن) نازل کی ہے اور وہی نیکوں کا کارساز ہوا کرتا ہے۔

چنانچہ وہ ان کی مدد کرتا ہے غرض کہ تصرفاتی یعنی غائبانہ امداد کا تعلق ہمیشہ عابدانہ اِطاعت کے ساتھ ہی خاص رہا ہے۔

حق تعالیٰ کی اس تصرفاتی مدد کا نقشہ مدین کے پنگھٹ پر دیکھنے کے قابل تھا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک قبطی (فرعونی) کو سہواً قتل کر کے وہاں پہنچے دو لڑکیوں کے ریوڑ کو پانی پلانے کے لئے ظالم و جابر چرواہوں سے باری حاصل کی۔ پانی پلا کر سایہ میں بیٹھے تو اپنا پس منظر اور پیش منظر نگاہوں کے سامنے پھر گیا۔ فرعون جیسی سلطنت کے مفرور قاتل کو اپنے ہاں کون پناہ دیگا؟ روزی روزگار کے بغیر پیٹ بھرنا ناممکن ہے۔ لیکن کاروبار کی تلاش میں جس کے پاس جائینگے وہ ضرور آپ کا اتہ پتہ پوچھے گا۔ جھوٹ آپ کو کہنا نہیں۔ سچ کہوں گا تو ہو سکتا ہے کہ سننے والا فوراً حکومت کو خبر کر کے جیل بھجوا دے کہ یہ ہمسایہ حکومت کا مفرور قاتل ہے۔ اس کے حوالے کر دیا جائے۔ ان حالات میں آپ نے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں اِلتجاء فرمائی۔

رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ۝ (۲۸/۲۴)

اے میرے پروردگار! اس وقت تو جو بھلائی بھی میری طرف نازل فرمائے میں اس کا محتاج ہوں۔

فوراً مخصوص غائبانہ تصرفاتی مدد آئی جو عابدانہ اطاعت ہی کے ساتھ وابستہ ہے۔ جن نوجوان لڑکیوں کے ریوڑ کو پانی پلایا تھا۔ ان میں سے ایک آپ کو لینے کیلئے آئی۔ آپ گئے۔ صاحب خانہ نے آپ کی ساری داستان سُنی اور کہا

نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ (۲۸/۲۵) (اللہ کا شکر کرو کہ) تم نے ظالموں کی قوم سے نجات حاصل کرلی۔

صاحبِ خانہ (حضرت شعیب علیہ السّلام) نے باعزّت کاروبار بھی دیا۔ اور گھر سے ایک بیٹی دیکر آپ کا گھر بھی بسایا اور آٹھ دس سال کے لئے اپنے پاس رکھا تاکہ جب آپ واپس مصر جائیں تو مفرور کی گرفتاری کی مدت بھی گذر چکی ہو۔ اور مصر کا قانون آپکا بال تک بیکا نہ کر سکے۔

قرآنِ کریم تصرف الٰہی کی تشریح اور توحید کی توضیح میں ہی ہمیشہ بے مثل نہیں رہا بلکہ اپنی ہدایت کے نتائج میں بھی اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ قرآنی ہدایت کے بے مثل و بے نظیر ہونے کی ادنٰی سی مثال یہ ہے کہ اس پر عمل کر کے صحابۂ رسولؐ جو محض شتربان تھے جہاں بان ہو گئے۔

بلاشبہ قرآن مجید اپنی فصاحت و بلاغت میں بھی بے مثال ہے۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ اپنی ہدایت میں بے نظیر نہیں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قُلْ فَاْتُوْا بِکِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ ھُوَ اَھْدٰی مِنْھُمَآ اَتَّبِعْہُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۲۸/۴۹) اے پیغمبر! آپ کہدیجئے کہ اگر تم سچے ہو تو اللہ کے پاس سے کوئی اور کتاب لے آؤ جو ان دونوں (یعنی قرآن اور تورات) سے زیادہ ہدایت والی ہو، میں اس کی پیروی کرلوں گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم اور اصلی تورات دونوں کتابیں ایک

ہی سطح کی معمورۂ ہدایت ہیں، لیکن چونکہ تورات کی حفاظت کا ذمہ نہیں لیا گیا۔
اور قرآن کریم اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ٥ (۱۵/۹)

ہم نے اس ذکر (قرآن) کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

کے مطابق حفاظت خداوندی میں ہے۔ اس لئے تورات جیسی الٰہی کتاب (كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ) میں بھی تحریف ہو گئی اور ناقابلِ اعتبار ہو گئی۔ لہٰذا قرآن مجید جب کامل طور پر نازل ہو گیا اور تمام کتب سابقہ پر مھیمن بن گیا، تو قرآن رکھنے والے شخص کے لئے اس کا یعنی تورات کا اِستقلال بطور وحی کے جاتا رہا اور جب قابل اتباع آسمانی کتاب اور بہترین ہدایت والی تورات کا یہ حال ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ غیر محفوظ حدیثیں قرآن کریم کے ساتھ بطور وحی کے بالاستقلال شریک اور مثلہ معہ بن جائیں۔ معاذ اللہ

قرآن کریم کے ساتھ توراۃ و انجیل کا اِستقلال باقی نہیں رہا

عیسائیوں میں انجیلوں کے ساتھ توراۃ بھی آج تک لکھی چلی آتی ہے۔ انجیلیں عہد نامۂ جدید ہیں تو تورات عہد نامۂ عتیق۔ یہ اِسلئے کہ انجیلوں کے ساتھ توراۃ کا اِستقلال قائم تھا۔ اگر قرآن مجید کے ساتھ بھی توراۃ و انجیل کا استقلال باقی رہتا تو ضرور وہ بھی آنحضور کی طرف سے ساتھ ہی پیش کی جاتیں۔ اب جبکہ الٰہی کتابوں کا یہ حال ہے کہ وہ مثل قرآن نہیں ہو سکتیں تو حدیثیں کیا ہیں کہ وہ قرآن کی برابری کا دم ماریں؟

تورات و انجیل میں حدیثیں شامل ہو گئی تھیں

پہلی کتابوں میں بہت بڑا نقص یہ تھا کہ حدیثیں ان کے ساتھ شامل تھیں اُن میں وحی اور غیر وحی کا امتیاز مشکل ہو گیا۔
قرآن مجید کو حق تعالیٰ نے اس بَلا سے بچا لیا۔ اگر قرآن مجید حدیثوں سے جدا نہ ہوتا تو پھر کسی اور نئی کتاب کی ضرورت باقی رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ٥ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ٥ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ٥ وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ٥ (۲۶/۱۹۲-۱۹۶)۔ یہ قرآن تمام

جہانوں کے پروردگار کا نازل کردہ ہے۔ اسے روح الامین (جبریلؑ) لے کر
نازل ہوئے ہیں۔ آپ کے قلب پر تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہو جائیں
عربی مبین کی زبان میں۔ اور وہ بلاشبہ پہلے انبیاء کی کتابوں میں بھی مذکور ہو
چکا ہے۔

کے مطابق تمام کتابوں کے مضامین کو اپنے متن کے دامن میں لے کر ان کا اپنا جداگانہ استقلال قائم نہیں رہنے دیا۔ چنانچہ قرآن کریم کے نازل ہونے کے بعد وہ منسوخ ہوگئیں۔ فلہٰذا جب قرآن کی موجودگی میں سابقہ آلہی کتابیں حجت نہیں رہیں تو کتب روایات کس طرح حجت ہو سکتی ہیں؟

قرآن کے مثل لانے کا چیلنج

قرآن کریم میں بار بار دشمنان اسلام کو چیلنج دیا گیا کہ اگر تم اسے خدا کا کلام نہیں سمجھتے بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کلام سمجھتے ہو تو اس کے مثل تم بھی بنا کر لے آؤ۔ قرآن کریم کی یہ تحدی اور چیلنج صرف اس میں نہیں ہے کہ قرآن کریم بڑا فصیح و بلیغ کلام ہے۔ تم فصاحت و بلاغت میں اس جیسا کلام بنا کر لے آؤ بلکہ یہ تحدی کلام کی ہدایت میں بھی ہے۔ قرآن کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ہدایت میں بھی ایسا کلام بنا کر تم لوگ نہیں لا سکتے۔ لیکن احادیث نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق ایسی کوئی تحدی نہیں فرمائی گئی۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ احادیث نبویؐ کلامِ الٰہی اور وحی خفی یا وحی غیر متلو نہیں تھیں۔ جیسا کہ محدثین کا دعویٰ ہے، بلکہ وہ کلامِ نبوی تھیں۔ لیکن ہمارے علمائے کرام فرماتے ہیں کہ ہدایت میں قرآن کریم اور احادیث نبوی یکساں حیثیت کے مالک ہیں، جیساکہ قرآنِ کریم ہدایت ہے۔ احادیث بھی ہدایت ہیں۔ اور یہ کہ قرآنِ کریم کے سلسلہ میں ہدایت کے بارے میں کوئی تحدی نہیں فرمائی گئی تھی کہ احادیث کے لئے بھی تحدی کی جاتی بلکہ قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت اور امورِ غیبیہ کے بیان کے سلسلہ میں تحدی فرمائی گئی تھی۔ فصاحت و بلاغت اور امورِ غیبیہ کا بیان جیساکہ قرآن مجید میں ہے احادیث نبویہ

ہیں دیا نہیں ہے اس لئے احادیث کے سلسلہ میں کوئی تحدی نہیں فرمائی گئی۔ البتہ ہدایت میں قرآن وحدیث دونوں برابر ہیں لیکن یہ بات غلط ہے قرآن کریم نے اپنے متعلق ہدایت کے سلسلہ میں بھی اپنے دشمنوں کو تحدی (چیلنج) کی ہے۔ چنانچہ سورۂ القصص میں ارشادِ الٰہی ہے۔

قُلْ فَأْتُوا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَا اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝ (۲۸/۴۹)۔ اے پیغمبر آپ کہدیجئے کہ اگر تم سچے ہو تو تورات و قرآن سے زیادہ بہتر ہدایت کرنے والی کوئی کتاب (خود بنا کر تو کیا لاؤ گے) خدا کے پاس سے ہی لے آؤ۔ میں اس کا اتباع کر لوں گا۔

یہاں ہدایت ہی میں تحدی فرمائی جارہی ہے۔ لیکن اپنی کتب روایات کو تحدی اور چیلنج کی زد سے بچانے کے لئے ہمارے علماء کرام نے یہ قید لگائی ہے کہ تحدی فصاحت و بلاغت میں ہے اور چونکہ احادیث نبوی میں فصاحت و بلاغت قرآن جیسی نہیں ہے اس لئے ان کے لئے تحدی بھی نہیں فرمائی گئی۔ کوئی بھی منصف مزاج آدمی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ کہ نری فصاحت و بلاغت کلام کی ایک زینت تو ہے مگر ہدایت کی طرح ضروری چیز نہیں ہے۔ پس اگر قرآنِ کریم نے اپنے متعلق ہدایت میں کوئی تحدی نہیں فرمائی تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کا مثل ہدایت کے اعتبار سے لے آنا کیا لوگوں کے لئے ممکن ہے؟ اس طرح معاذ اللہ معاذ اللہ بلحاظ ہدایت قرآن کریم کی کوئی خصوصیت باقی نہیں رہے گی۔ حالانکہ قرآنِ کریم تو ہدایت میں بھی تحدی فرمارہا ہے جیسا کہ سورۂ القصص کی آیت میں قرآن نے تحدی کی ہے مگر یہ تحدی احادیث نبوی کے سلسلہ میں حق تعالیٰ نے ہرگز ہرگز نہیں فرمائی۔

احادیث کے الفاظ و عبارات حضراتِ علمائے کرام کے نزدیک احادیث نبویہ کے الفاظ اور عبارات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے بشری طاقت

کی ہیں۔ وحی الٰہی سے نہیں ہیں۔ شکر ہے کہ عہدِ نبوت میں کچھ نہ کچھ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی بشری عقل کا کام تسلیم تو کیا گیا ہے جو مطلقاً وحی الٰہی سے نہیں تھا ـــــ یہ امر روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ وحی کی اطاعت محض عاقلانہ اور منتظمانہ ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ جس اطاعت کا ہم سے مطالبہ کیا گیا ہے۔ وہ قطعاً عابدانہ اطاعت ہے اس کے لئے لازم ہے کہ وحی کو ممتاز کر کے اور علیحدہ لکھ کر کتاب کی صورت میں ہمیں پہنچایا جائے۔ جس کتاب میں ایسا امتیاز نہیں رہے گا وہ ہمیشہ کے لئے مقصود نہیں ہوگی ـــــ اور یہ بھی لازم ہے کہ جو وحی الٰہی ہمارے واسطے ہمیشہ کے لئے مقصود ہو، حق تعالیٰ خود ہی ضرور بالضرور اس کی حفاظت و صیانت کی ذمہ داری بھی قبول فرمائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَقَالُوْا يٰاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ۔ لَوْمَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ۔ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ۔ (۱۵/۶-۸) ـ

اور انہوں نے (یعنی کفار قریش نے رسولِ مقبول کو مخاطب کر کے) کہا، اے وہ شخص جس پر یہ ذکر (یعنی قرآن مجید) اتارا گیا ہے تو تو یقیناً نرا دیوانہ ہے۔ اگر تو سچوں میں سے ہے (کہ قرآن کے ساتھ سچ مچ تجھ پر فرشتے اُترتے ہیں) تو کیوں فرشتوں کو سامنے نہیں لاتا۔ (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ) ہم فرشتوں کو نہیں اتارا کرتے مگر ٹھیک طور پر (اور اگر ٹھیک طور پر قانون کے مطابق ہم نے فرشتوں کو اتار دیا) تو انہیں پھر تو (ایک منٹ کی بھی) مہلت نہیں مل سکے گی۔ (اور سب یکلخت تباہ و برباد کر دیئے جائیں گے۔

پھر قرآن کریم کی صداقت کی کیا یہ کم دلیل ہے کہ مسلمانوں کی کمال کمزوری اور کفر کی بڑی شوکت و قوت اور ان کی انتہائی مخالفت کے وقت میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ o۔ (پ ۱۴ ع ۱) یقیناً ہم (جو خدائے قادر مطلق ہیں) ہی نے اس ذکر (قرآن مجید) کو نازل فرمایا ہے اور یقیناً ہم ہی اس کے ضرور ضرور محافظ ہیں۔

دیکھئے! کس قدر تاکید اور زور کے ساتھ یہاں قرآن پاک کی حفاظت کا ذمہ لیا گیا ہے۔ پھر حق تعالےٰ فرماتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِالذِّکْرِ لَمَّا جَآءَھُمْ ج وَ اِنَّهٗ لَکِتٰبٌ عَزِیْزٌ o لَّا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ط تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَکِیْمٍ حَمِیْدٍ o (۴۱ / ۴۱-۴۲)۔

یقیناً وہ لوگ جنہوں نے اس ذکر (قرآن) کے ساتھ کفر کیا جبکہ یہ ان کے پاس آیا ہے (تو یہ لوگ اس ذکر کو دبا نہیں سکیں گے) اور یقیناً یہ ضرور نہ دبنے والی کتاب ہے (جسے ہر حال میں غالب ہو کر رہنا ہے) باطل نہ اس کے آگے سے آسکتا ہے (یعنی بوقت نزول اس میں کوئی شیطانی دخل نہیں ہو سکتا) اور نہ اس کے پیچھے سے (یعنی بعد کو بھی کوئی اس میں دخل نہیں دے سکے گا) اس کا اتارنا حکمت والے حمد والے خدا کی طرف سے ہے۔

یہ ہے حکمت والے خدا کا خدائی ذمہ جس کو خود قرآن مجید میں ہی پیش کیا گیا ہے۔ اب اگر حدیثیں بھی اس ذمہ میں داخل ہیں یا اگر قرآن مجید کی طرح بحفاظت تمام ہم تک سب کی سب پہنچائی گئی ہیں تو ہماری طرف سے بحث کا خاتمہ ہے اس کے بعد ہمیں کچھ عرض کرنے کی گنجائش ہی نہیں۔
——— لیکن

کیا حدیثوں کا کوئی مجموعہ نوشتۂ رسول وصحابہؓ ہے؟

اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام ارشادات بعینہٖ ہم تک نہیں پہنچے اور جو پہنچے ان میں خود رسول اللہ کا یا آپ کے صحابہؓ کا کوئی نوشتہ موجود نہیں جو اہلِ اسلام کے ہاتھوں میں آنحضرتؐ کے زمانہ سے آج تک متداول چلا آرہا ہو، بلکہ وہ سب شہادت در شہادت در شہادت

(کہاں تک کہا جائے) بلکہ روایت در روایت کے طور پر (یعنی عن فلان عن فلاں عن فلاں کے طریقہ سے) آئی ہیں۔ اور اس طرح وہ ظنی ہو گئی ہیں، غریب وضعیف ہو گئی ہیں، بلکہ ان میں ترغیب و تحریص کیلئے جھوٹ کی آمیزش بھی خاص اہتمام سے کی گئی ہے اور مختلف فرقوں نے اپنی اپنی اغراض کے لئے مختلف حدیثیں گھڑ بھی لی ہیں۔ اور ان میں موضوع اور مخترع حدیثیں ہی نہیں بلکہ موضوع اور بناوٹی آیتیں بھی بنا کر شامل کی گئی ہیں۔ جب یہ ساری باتیں ان احادیث کے بارہ میں صحیح ہیں تو اس سے صاف کھل جاتا ہے کہ حق تعالےٰ نے احادیث کو اپنی اس حفاظت سے باہر رکھا ہے جو اس وحی کے لئے ضروری ہے جو ہمیشہ کے لئے مقصود ہو۔ پس حدیثوں کو قرآن مجید کی طرح ہمیشہ کیلئے مقصود وحی کہنا بالکل ہی باطل ہے۔

متن حدیث، یعنی وحی خفی کی صحت کا مدار عقل کے ماتحت کیوں ہے؟

یہ ظاہر ہے کہ اس وقت متن حدیث کی صحت و عدم صحت کا فیصلہ درایت اور عقل کے ماتحت کیا جاتا ہے۔ چنانچہ متن حدیث کو ہر شخص عقل و درایت کے خلاف ثابت کر کے حدیثِ رسولؐ ہونے سے انکار کر سکتا ہے۔ اور بڑے بڑے محدثین نے اصول روایت و درایت کے ماتحت بہت سی حدیثوں پر کلام کیا ہے اور ان کے حدیث نبوی ہونے سے انکار کیا ہے۔ لیکن قرآن مجید کی آیات کے متعلق کسی آیت کے بارہ میں بھی کسی بڑے سے بڑے محدث حتیٰ کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس طریق سے اس پر کلام کر کے اس کے آیتِ قرآنی ہونے کا انکار کر سکے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ روایات و احادیث یا تو شروع سے ہی مقصود وحی نہیں تھیں یا مطلقاً وحی نہیں تھیں۔ اگر وہ وحی تھیں تو انہیں عقل اور درایت کے ماتحت کیوں رکھا گیا!

محدثین کی تحقیقات اور انتخابات پر انہیں کیوں چھوڑا؟

احادیث میں راویوں کے اپنے شبہات

حدیثوں میں خود راویوں کے اپنے شبہات بھی موجود ہیں کہ حضورؐ نے یوں فرمایا تھا یا دوں فرمایا تھا بلکہ خود راوی ایک حدیث کو بڑے زور و شور کے ساتھ بیان کر کے آگے پہلی حدیث کے خلاف دوسری حدیث بیان کرتے ہیں حدیث کی ہر کتاب میں ایسی متضاد اور متخالف روایات ایک ہی باب میں مل سکتی ہیں لیکن قرآن کی کسی آیت کے متعلق راوی کے کسی ایسے شبہ یا انکار کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی نہ آیات میں ایسا تضاد پیش کیا جا سکتا ہے۔

حدیثوں کے متعلق لوگوں کو ایسے سوالوں کا بھی حق تھا کہ حضورؐ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ اپنی رائے سے فرما رہے ہیں یا وحی الٰہی سے استنباط فرما رہے ہیں۔ ایسے سوالات پر آپ نے بعض مرتبہ فرما بھی دیا کہ نہیں بلکہ یہ محض میری اپنی رائے ہے اور پھر لوگ اس پر عمل بھی نہیں کیا کرتے تھے۔ احادیث کے متعلق لوگوں کو ان کے خلاف رائے دینے کا بھی حق تھا کہ آپ ایسا نہ کیجئے اس سے نقصان ہوگا۔ لوگ اس پر بھروسہ کر لیں گے اور عمل چھوڑ دیں گے۔ اور آپ مان بھی لیتے تھے جیسا کہ مشکوٰۃ کی حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا آپ نے ایک صحابیؓ کو حکم دیا کہ اس کا اعلان کر دیں۔ وہ اعلان کرنے چل دیئے۔ حضرت عمرؓ نے جب یہ حدیث (اعلان) سنی۔ تو بیان کرنے والے کو ایک تھپیڑ رسید کیا اور پکڑ کر دربار رسالت میں لے آئے اور تصدیق کے بعد عرض کیا کہ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں اس طرح تو لوگ کلمہ پڑھنے پر بھروسہ کر کے عمل کرنا چھوڑ دیں گے۔ تو آپ نے فرمایا۔ کہ اچھا لوگوں کو عمل کرنے دو۔ کیا معاذ اللہ معاذ اللہ حدیثیں وحی (وحی خفی یا وحی غیر متلو) ہوا کرتی تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمرؓ یا کسی کے کہنے سے وحی کی تبلیغ سے رک بھی جایا کرتے تھے؟ ——— احادیث ہی میں ہے کہ عبد اللہ ابن ابی منافق کے جنازہ کی نماز پڑھنے پر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر قرآنی آیت

پیش کر کے اعتراض کیا گیا۔ آنجنابؐ نے اس کی تفسیر اپنے خیال کے مطابق فرمائی۔ لیکن حضرت عمرؓ نے بحث کی اور آیت کی دوسری تفسیر فرمائی۔ آخر وحیِ الٰہی نے حضرت عمرؓ کے فہم کی تصدیق فرما دی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تفسیر غلط نکلی۔ یہ سب باتیں مولوی صاحبان کی مسلّمہ صحیح حدیثیں ہی بتلاتی ہیں (اللہ بچائے حضرات علمائے کرام کی ان صحیح حدیثوں سے) ہم تو ان احادیث کو الزامی طور پر پیش کر رہے ہیں۔ اگر یہ تمام حدیثیں سچّی اور صحیح ہیں تو ہمارا مدعا ثابت ہے کہ حدیثیں نہ وحی ہوتی تھیں اور نہ وہ دین میں حجت ہوتی تھیں۔ وہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا بشری اور عقلی اجتہاد ہوا کرتی تھیں جو بعض اوقات غلط بھی ہو جاتا تھا جیسا کہ ہر مجتہد کے اجتہاد میں غلطی کا احتمال ہوا ہی کرتا ہے اور اگر یہ سب حدیثیں جھوٹی اور غیر محفوظ ہیں تب بھی ہمارا مدعا ثابت ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کی حفاظت کا کوئی ذمہ نہیں لیا۔ لوگوں نے گھڑ گھڑ کر آپؐ کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کر ڈالیں۔ لہٰذا ایسی باتوں کو دین میں حجت قرار دینا مشکل ہے۔

حدیث قرطاس | رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الموت میں جبکہ وصیت کرنے کا ضروری وقت ہوتا ہے۔ بڑی تاکید کے ساتھ فرمایا کہ میرے پاس کوئی کتاب (کاغذ) اور قلم دوات لاؤ۔ میں تمہیں ایسی تحریر لکھوا دوں کہ تم اس کے بعد کبھی گمراہ نہ ہو۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا حسبنا کتاب اللہ یعنی ہمارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے اور وہ ہمارے لئے کافی ہے (بخاری) اس کے بعد حضورؐ پانچ روز تک زندہ رہے مگر حضرت عمرؓ کا بیان سُننے کے بعد آپؐ نے قطعاً اُس وصیت کو لکھوانے کا ارادہ نہیں فرمایا، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کا منشاء اسی وصیت کو لکھوانے کا تھا جو حضرت عمرؓ نے کہدی تھی۔ چنانچہ حضور اکرمؐ نے بغیر لکھوانے کے بھی جو وصیت فرمائی وہ قرآن ہی کے متعلق تھی، چنانچہ بخاری میں ہے اَوْصٰی بِکِتٰبِ اللّٰہِ۔ یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب اللہ کی وصیت فرمائی۔ لیکن اگر کتاب اللہ کے علاوہ آپ کچھ اور

لکھوانا چاہتے تھے۔ اور حضورؐ کا یہ تاکیدی حکم وحی الٰہی سے تھا تو ضرور لکھوایا جاتا اور وہ آج ہمارے پاس موجود بھی ہوتا۔ حضرت عمرؓ منشائے الٰہی کو ہرگز ہرگز نہیں روک سکتے تھے۔ وحی الٰہی کو لکھوانے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک حضرت عمرؓ تو کیا ہزار عمرؓ نہیں روک سکتے تھے۔

اگر قرطاس والا واقعہ صحیح ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اس آخری وصیت کو حضرت عمرؓ کے مشورہ کے بعد لکھوانے سے یقیناً اسلئے باز رہے کہ امت کے پاس آپ کا کوئی نوشتہ قرآن کریم کے علاوہ اگر پایا جاتا تو بعد میں آنیوالی اُمت نہ جانے اسے کیا سے کیا بنا لیتی۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پوری طرح فرمانبردار تھے۔ اگر اس وصیت نامہ کا لکھوانا وحی کے ماتحت ہوتا اور حضور اسے لکھوانا چاہتے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وصیت کے لکھوانے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ اگر معاذ اللہ معاذ اللہ صحابہ کی کثرت بے ایمان بھی ہو گئی ہوتی تب بھی وحی کے مطابق کسی وصیت کو لکھوانے سے روکنا ممکن نہیں تھا۔ جس وقت حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اپنے آپ کو انتہائی کمزور اور بے سروسامان محسوس فرماتے تھے یعنی ابتداء اسلام میں اس وقت بھی جب کفار و مشرکین آپ کو وحی کے لکھوانے سے نہ روک سکے بلکہ خود دشمن اس بات کی گواہی دیتے تھے کہ آپ قرآن کو لکھواتے ہیں

وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ○ (۲۵/۵) اور کفار و مشرکین کہتے ہیں کہ کچھ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جو محمد (صلعم) نے لکھ لی ہیں۔ چنانچہ وہی صبح و شام اسکے پاس لکھوائی جاتی ہیں۔

یہ خود دشمنوں کی شہادت ہے اور ظاہر ہے کہ دشمن اگر کسی بات کی شہادت دے تو وہ انتہائی وزنی ہوتی ہے تو جب کمزوری اور بے سروسامانی کے زمانہ میں کوئی آپ کو وحی کے لکھوانے سے نہ روک سکا تو اس وقت جبکہ اسلام کافی ترقی کر چکا تھا اور رَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا کا منظر پیدا ہو چکا تھا وحی کو لکھوانے سے روکنا کیسے ممکن ہو سکتا تھا۔

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں قرآن مجید کے ساتھ ضرورتاً اور باتیں بھی لکھی جاتی تھیں۔ چنانچہ حضور نے اِرد گِرد کے چند بادشاہوں کے نام تبلیغی خطوط روانہ کئے اور ان میں صرف قرآن مجید کی آیت ہی سے تبلیغ کی گئی ـــــ دوسری قوموں کے ساتھ جو معاہدے ہوتے تھے وہ بھی لکھے جاتے تھے۔ لیکن حضور یہ نہیں چاہتے تھے کہ آپ کے بعد قرآن مجید کے ساتھ آپ کی کوئی اور تحریر مسلمانوں کے پاس موجود رہے آپ کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر کوئی ایسی تحریر لوگوں کے پاس موجود ہو گی تو اسے لوگ متبرک خیال کرتے کرتے کہیں دوسری الٰہی کتاب (اور حضورؐ کو اللہ کے ساتھ دوسرا قاضی) قرار نہ دے لیں۔ یہ احتیاط بالکل حق بجانب تھی کیونکہ لوگوں نے تو روایتی اور ظنی حدیثوں کو قرآن مجید کے ساتھ مثلۂ معہ قرار دے لینے میں دریغ نہیں کیا۔ اور ان پر امت کو چلانے کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید کے ساتھ ایک ہی کیفیت کا دوسرا قاضی بنا لیا ہے تو اگر رسول اللہ کی اصل تحریریں موجود ہوتیں تو ان کے ساتھ کیا کچھ نہ کرنے کا حق یہ لوگ پیدا کر لیتے۔ ایسا قاضی سوائے خدا کے کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا اللہ تعالیٰ سورۂ مؤمن میں ارشاد فرماتا ہے۔

وَاللّٰهُ يَقْضِىْ بِالْحَقِّ ۭ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (۴۰:۲۰)

اللہ حق کے ساتھ قضا (یعنی فیصلے) کرتا ہے اور جن کو یہ لوگ اللہ کے سوائے پکارتے ہیں (مسیحؑ ہوں یا عزیرؑ، ملائکہ ہوں یا کوئی اور) وہ کسی چیز کے ساتھ بھی قضا (یعنی فیصلے) نہیں کرتے۔ یقیناً اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

اس میں علمی، عملی ہر طرح کی قضا شامل ہے۔ پس (جب) وحی الٰہی اور اللہ کے دیگر فعلی تصرفات قضائے الٰہی سے ہیں اور ان میں خدا کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہو سکتا تو خدا اور رسول، دونوں کے کسی بات میں بھی ایک ہی

طرح کے دو قاضی ہونے کا اعتقاد رکھنا سرتاپا باطل ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں (نہ ذات میں نہ صفات میں اور نہ حکم میں) خدا کے شریک خدا کے بنائے ہوئے اور ٹھہرائے ہوئے بھی نہیں ہوتے (یعنی خود حق تعالیٰ کسی نبی اور رسول تک کو بھی اپنا شریک نہیں ٹھہراتا جیسے کہ سورۂ زخرف میں ارشاد ہوا ہے۔

اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً یُّعْبَدُوْنَ ۝ (۴۳/۴۵)

کیا ہم نے خود رحمان کے ساتھ اور الٰہ مقرر کر رکھے ہیں کہ لوگ ان کی عبادت (بے چون وچرا اطاعت) کریں۔ (ہرگز نہیں)

قرآن کے سوا کچھ مت لکھو

خود احادیث اس بات کی شاہد ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی تھی کہ مجھ سے قرآن مجید کے سوا کچھ نہ لکھو۔ اور جس نے کچھ لکھ لیا ہو تو لازم ہے کہ اسے مٹا ڈالے (مسلم) صحابہؓ نے اس پر پورا پورا عمل کیا اگر کسی نے کچھ لکھا تھا تو آخر جلا دیا۔ حضرت معاویہؓ نے کسی دوسرے صحابیؓ سے کوئی حدیث پوچھی اور اپنے آدمی کو لکھنے کا اشارہ کیا لیکن جب اس صحابیؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سوائے قرآن مجید کے حضورؐ کی طرف سے کچھ لکھنے سے منع فرمایا ہے تو آپ نے اس لکھے ہوئے کو مٹا دیا (ابوداؤد تیسیر الوصول) اب ظاہر ہے کہ

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتابتِ حدیث کو ضروری سمجھتے تو ضرور اسے لکھوا کر ہم تک پہنچاتے۔ اگر صحابہؓ کتابت حدیث کو جائز جانتے تو ضرور لکھوا کر چھوڑ جاتے پھر ممکن نہیں تھا کہ مسلمان رسول خدا یا صحابہؓ کے نوشتوں کے مٹانے کو جائز سمجھتے۔ ضرور ان نوشتوں کی قدر بخاری اور مسلم سے بدرجہا بڑھ کر ہوتی۔ لوگوں کو ان نوشتوں کی حدیثیں روایت در روایت (یعنی عن فلاں عن فلاں) کے طور پر نہ لینی پڑتیں۔ پس صحابہؓ کے کسی نوشتے کا موجود نہ ہونا صاف بتلاتا ہے کہ انہوں نے حدیث کی تبلیغ کو (صرف) غیر ضروری ہی نہیں

بلکہ جو کچھ کبھی ضرورۃً لکھا گیا تھا۔ اس کو بھی مٹا دیا۔ نیز یاد رہے کہ صحابہؓ کو اپنی فتوحات کے زمانہ میں رسولِ خُدا کا کوئی والا نامہ یا عہد نامہ ملا ہوگا تو انہوں نے اس کو بھی باقی نہیں رکھا۔ مسلمانوں کے پاس رسولِ خُدا کی انگوٹھی کا نوشتہ تک بھی قائم نہیں رہا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرد گِرد کے سلاطین کے نام خطوط تحریر فرمائے تھے۔ ان میں سے ایک خط کسی پادری کے پاس سے تھوڑا عرصہ ہوا ملا ہے۔ اس کا فوٹو لے کر دُنیا میں پھیلایا گیا لیکن یہ امر قابلِ غور ہے کہ مسلمان جن کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریروں کا پایا جانا قرین قیاس تھا وہ تو مطلقاً ان تحریروں سے خالی ہیں۔ اگر کوئی تحریر مل بھی جاتی ہے وہ غیروں کے پاس سے ملتی ہے۔ اس سے حدیث کے ساتھ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی پوری بے اعتنائی کا ثبوت ملتا ہے ــــ خود احادیث کے بیان کے مطابق صحابہؓ کے زمانہ میں ایک دوسرے سے حدیث سُن کر اس کی تغلیط بھی کی جاتی تھی۔ قرآن کے خلاف پاکر اسے رد بھی کیا جاتا تھا۔ بعض صحابہؓ نے دوسروں سے حدیث کا سُننا ترک کر دیا تھا۔ اس لئے کہ لوگ نرم و سخت ہر راہ پر چلنے لگے تھے۔ بعض نے خود روایت کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ تاکہ بے ضرورت غلطی کرکے جہنم مول نہ لیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حسبِ روایت حضرت ابوبکرؓ سے حدیث سُن کر غضبناک ہوئیں اور ان سے کلام کرنا ترک کر دیا۔ یہاں تک کہ احکم الحاکمین کے پاس جا پہنچیں آپ کے جنازہ پر حضرت ابوبکرؓ کو نہیں بلایا گیا۔ بلکہ رات کو چپکے سے دفن کر دیا گیا۔ یہ باتیں بخاری اور مسلم میں پائی جاتی ہیں۔ جن کی صداقت کے وہ خود ذمہ دار ہیں۔

عذرِ فعل بدتر از فعل

بعض حضرات بے نیازانہ طور پر فرما دیتے ہیں کہ حدیثیں لکھنے کی ممانعت اس لئے کی گئی تھی کہ کہیں حدیثیں قرآن مجید کے ساتھ مخلوط نہ ہو جائیں۔ یہ ایک بہانہ ہے۔ کیا

ضرورۃً اور باتیں نہیں لکھی جاتی تھیں؟ پھر کیا وہ قرآن مجید میں مل گئیں؟ اگر حدیثوں کو بھی لکھنے کی ضرورت ہوتی تو کیا وہ بھی ضرورۃً نہیں لکھی جا سکتی تھیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے علمائے کرام کے خیال میں قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ حق تعالیٰ نے مشروط طور پر لیا تھا کہ اگر حدیثیں لکھی گئیں تو پھر حق تعالیٰ قرآن عزیز کی حفاظت کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔ معاذاللہ! استغفراللہ! ایسے بہانے بنانے پر عذرِ فعل بدتر از فعل کی مثال صادق آتی ہے۔

اگر کتابت حدیث ضروری ہوتی تو اس کیلئے موزوں ترین زمانہ آنحضورؐ اور صحابہؓ کا تھا

صاحبان! اگر احادیث کو لکھنا ضروری ہوتا تو ان کو لکھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے وقت میں ہی زیادہ مناسب تھا۔ مروجہ تاریخ اسلام کے مطابق حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ کی جنگ میں (جمل کی جنگ میں) دس ہزار صحابہؓ کا خون بہنے کی نسبت یہ کام نہایت ضروری تھا پھر حدیثوں کو اس وقت لکھے جانے سے۔ حدیثوں کے ظنی، ضعف اور موضوع بننے کا بھی کوئی موقعہ نہ رہتا ـــــ برعکس اس کے حدیثوں کا زمانۂ رسالت وصحابہؓ کے بہت بعد لکھا جانا بہت کچھ مضر، نقصان دہ اور نااتفاقی کا موجب ہوا ہے۔ لوگوں نے اپنی اپنی حدیثوں کے مجموعے الگ الگ بنالئے ہیں۔ اور جب تک یہ مجموعے بطور وحی کے سمجھے جائیں گے۔ ان کو ماننے والے مسلمانوں کے فسادات اور اختلافات نہیں مٹ سکتے۔ ایک کتاب کے تحت میں جو اتحاد ہو سکتا ہے، مختلف کتابوں کے ماتحت ہرگز نہیں ہو سکتا ـــــ حدیثوں کے زمانۂ رسالت وصحابہ کے بہت بعد لکھے جانے کے سبب لوگوں نے ان کی آڑ میں قرآن مجید کو فائدہ پہنچانے کے بجائے سخت نقصان پہنچانے کی بھی کوششیں کی ہیں۔ نئی نئی آیتیں بلکہ نئی نئی سورتیں بھی گھڑی گئی ہیں۔ مگر شکر ہے کہ وہ متن قرآن پر اثر انداز نہیں ہو سکیں۔ وہ صرف بخاری اور مسلم اور شیعوں کی کافی اور طبری وغیرہما

ہی میں بند پڑی ہیں (خود بخاری شریف میں آیت رجم کا قرآنی آیت ہونا مذکور ہے لیکن حفاظت خداوندی (۱۵/۹) کے مطابق اسے قرآن کریم میں آج تک جگہ نہیں مل سکی)، ان کے لائق بھی وہی جگہ ہو سکتی تھی نہ کہ سچا قرآن (حفاظت خداوندی کی ذمہ داری (۱۵/۹) کے بموجب قرآن کریم میں تو جھوٹ شامل نہیں ہو سکتا)۔ حدیثیں یقیناً ایسی چیز ہیں۔ جن میں جھوٹ مل سکتا ہے اور یقیناً ان میں جھوٹ ملا ہوا بھی ہے۔ پس وہ ہرگز ایسی نہیں ہو سکتیں جو (وقتی ضرورتوں کے علاوہ) ہمیشہ کے لئے مقصود ہوں۔ قیامت تک کے لئے مقصود تو صرف قرآن کریم ہی ہے۔

کیا تقلید شخصی کا دروازہ خود رسول اکرمؐ کھول سکتے تھے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل وخرد اگرچہ بڑی قابل قدر چیز تھی لیکن آخر بشری محدود عقل تھی۔ لہٰذا آپ اس بات کو ہرگز ہرگز پسند نہیں فرما سکتے تھے۔ کہ حق تعالےٰ کے سوا کسی بشر ہی کو بطور شخصیت کے ہمیشہ کے لئے اصولی طور پر کوئی مزیت اور عظمت و برتری یا خصوصیت دے دیں۔ اور یوں انسانی تقلید کا دروازہ خود اپنے ہاتھ سے کھول جائیں۔ اگر حضورؐ کی کوئی تحریر موجود ہوتی تو ضرور ہی اس کی تقلید کی جاتی بلکہ اسے دوسری وحی قرار دیا جاتا اور آنحضورؐ کی حسب زمانہ اور وقتی اصلاحوں کو دائمی اصول بنا لیا جاتا اور یوں دوسری عقلوں سے حسب زمانہ کام لینے کی قدر اور ضرورت کالعدم ہو جاتی جیسا کہ آنحضورؐ کی طرف منسوب محض، حدیثوں کو وحی قرار دے لیا گیا ذاتی رجحانات اور وقتی اصلاحات کو دائمی اصول بنایا جا چکا ہے۔ لیکن چونکہ ذاتی رجحانات اور اس دور کی وقتی اصلاحات ہمیشہ کے لئے زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکیں۔ تو مسلمانوں نے اس طرح قرآن اور اسلام ہی کو بدنام کر کے رکھ چھوڑا ہے کہ یہ آنے والے وقتوں کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ العیاذ باللہ!

لہٰذا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے کوئی ایسا اقدام کر کے یعنی وقتی اصلاحات کو ان کے صحیح مقام کے خلاف۔ اُنہیں دوام دے کر (یعنی احادیث مبارکہ

کو محفوظ کر کے) اپنے عمل سے یہ سکھانا نہیں چاہا تھا کہ کسی بشری عقل کو بلحاظ اس کی شخصیت کے ہمیشہ کے لئے اصولی رنگ میں مزیت اور دینی تقدس دے لیا کرو۔ امت نے جتنے نقصان اُٹھائے ہیں اپنے ہی خیالات و اختراعات سے اُٹھائے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامان سے بالکل بری ہے۔ حضورؐ نے ان احادیث کو صرف زبانی ہی رہنے دیا اور واضح کر دیا کہ یہ قرآن مجید کی طرح ہمیشہ کے لئے مقصود نہیں۔ رسول اکرمؐ نے قرآن مجید کو لکھ کر اور لکھوا کر دائمی اصول کی طرح ہمیں دیا۔ ہم نے

مَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۔ (۵۹/۷)

رسول تمہیں جو کچھ دیں اسے لے لو

کے حکم کے مطابق اسے پکڑ لیا۔ لیکن اہلِ حدیث حضرات نے لَا تَكْتُبُوْا عَنِّيْ سِوَى الْقُرْاٰنِ (مجھ سے قرآن کے سوا کچھ نہ لکھو) کی ممانعت کے باوجود مَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (۵۹/۷) جس سے آپ روک دیں اس سے رُک جاؤ۔

کے خلاف حدیثوں کو لکھوایا اور دائمی اصول بنا لیا۔

دائمی کتاب کی زبان زندہ اور مُبین ہونی چاہیئے

صاحبان! اگر یہ ضروری ہے کہ حق تعالیٰ لوگوں کی ہدایت کے لئے وحی بھیجیں اور اس وحی کو لوگوں تک حق تعالیٰ اس کی اصلی صورت میں خود ہی پہنچائیں۔ تو اس کا لازمی تقاضا یہی ہے کہ دنیا میں ضرور کوئی نہ کوئی کتاب اپنی اصل شکل میں موجود رہے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کتاب اپنی خصوصیات کو خود ہی پیش کر کے اپنی شناخت کرائے اور مقدم شناخت یہ کہ وہ اپنی زبان کا مُبین ہونا دکھلائے اور اپنی تعلیمات کے بے مثل و بے نظیر ہونے اور اپنی حفاظت کی تحدی کرے۔ الہامی کتاب کی زبان کے لئے اپنے مدعا کے اظہار میں مُبین ہونے کی صفت صرف قرآن مجید کے ساتھ ہی خاص ہے دوسری الہامی کتابوں کی زبانیں مُردہ ہو چکی ہیں اور بعض کتابیں استعارہ در استعارہ کے

لباس میں چھپ گئی ہیں۔ ان میں ایک ایک لفظ کی بیسیوں تاویلیں کی جاسکتی ہیں۔ جن سے اصل مدعا کھل ہی نہیں سکتا۔ صورت وسیرت (دونوں انداز سے) بے مثلیت کا دعویٰ بھی صرف قرآن مجید نے ہی کیا ہے۔ ایک اُمی کے ہاتھوں، ایسے زمانہ میں جبکہ چاروں طرف ظلمت ہی ظلمت چھائی ہوئی تھی حق تعالیٰ نے ایسے ایسے بھید کھولے ہیں کہ علم وعقل، ارتقائی مدارج طے کرتے ہوئے جوں جوں آگے قدم بڑھاتے ہیں وہ قرآن کریم کے بیان کردہ اسرار کے قریب ہی آتے جاتے ہیں۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (۵۳/۴۱) ہم انہیں آفاق میں اور خود ان کے نفسوں میں اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے حتیٰ کہ ان پر واضح ہوجائے گا کہ قرآن ہی حق ہے۔

قرآنی چیلنج آج بھی موجود ہے

ہدایت کا مقابلہ تو علیحدہ رہا۔ آج بھی کوئی شخص ایسی کتاب نہیں بنا سکتا جس میں ذیل کی چند باتیں ہی پائی جاتی ہوں۔ مثلاً:-

(۱) وہ کسی زبان میں کوئی چھوٹی سی کتاب بھی لکھ دے اور اس میں اپنی بے مثلیت کی تحدی کرکے کل دُنیا کو اپنے مقابلہ پر بلالے۔

(۲) اور اس میں ایسے مضامین بیان کرے جس سے تمام لوگ اس کے دشمن ہوجائیں اور اس کو مٹانے کی پوری کوشش کریں۔ لیکن بعد کو اس زبان والے (وہی مخالفین اس پر ایمان لے آئیں اور) اُس کتاب کی بے مثلیت کے قائل ہوجائیں۔

(۳) اور (وہی اہلِ زبان مخالفین) اپنے الفاظ کی صحت کے لئے اپنی لغات میں اسی کتاب سے سند پکڑا کریں۔ اور

(۴) اپنی صرف ونحو کی کتب میں ہر صرفی نحوی کلیہ کی صحت کی دلیل میں اسی کتاب کا حوالہ دیں اور

(۵) فصاحت و بلاغت اور علمِ معانی و بیان میں اسی کتاب کو امام بنا لیں ـــــ اگر کوئی صرف اتنی صفات والی کتاب بھی بنا سکتا ہے تو قرآن مجید کا اب بھی ویسا ہی دعویٰ اور تحدی موجود ہے۔ جو چاہے کوشش کر کے دیکھ لے اور صرف اتنی ہی خوبیاں حاصل کر کے دکھلا دے۔

اہلِ حدیث کا مثلہٗ معہ قرآن کی مثل ہرگز نہیں

محفوظیت کی تحدی بھی صرف اور صرف قرآن مجید میں ہی موجود ہے اور دُنیا میں صرف یہ ایک ہی الہامی کتاب ہے جو خود (زمانۂ رسالت میں) سُننے اور دیکھنے والوں کی لکھی ہوئی آج تک دنیا میں موجود ہے۔ ہم صرف ایک الہامی کتاب کا دُنیا کے لئے کافی وحی ہونا دکھلا رہے ہیں۔ مگر اہلِ حدیث حضرات مثلہٗ معہ بھی اس کے ساتھ کھڑا کر رہے ہیں۔ لیکن وہ مذکورہ بالا صفات اس اپنے ٹھہرائے ہوئے مثلہٗ معہ میں ہرگز ہرگز نہیں دکھلا سکتے۔

کیا تفسیر بھی تفسیر طلب ہوتی ہے؟

حدیثیں اگرچہ عربی زبان میں ہیں مگر عربی مبین میں نہیں ہیں۔ ان میں مغلق، مبہم اور غیر واضح الفاظ کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ پھر ان میں ایک ایک باب میں اس قدر اختلاف کثیر کھلے طور پر پایا جاتا ہے کہ اصل منشا تک پہنچنا نہایت ہی مشکل ہو گیا ہے۔ پھر لطف یہ کہ انہیں قرآنِ کریم کی تفسیر بتایا جاتا ہے اور ساتھ ہی پھر خود ایک ایک جلد کی کئی کئی جلدیں شرح اور تفسیر کی لکھی گئی ہیں۔ قرآن مجید کی یہ عجیب تفسیر ہے کہ قرآن مجید سے بڑھ کر خود محتاج تفسیر ہے، قرآن کریم کی جو آیتیں اپنے مدعا پر صاف دلالت کرتی ہیں وہ بالکل واضح اور معقول ہوتی ہیں مگر حدیثوں کو ساتھ ملا لینے سے پیچیدہ بلکہ قابلِ اعتراض بن جاتی ہیں۔ شاید تفسیر کا یہی منصب ہوتا ہے کہ سُلجھے ہوئے مطالب و مفاہیم میں الجھاؤ پیدا کر دے؟ (یا للعجب)

یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ قرآن مجید پر مخالفوں کے اس قدر

اعتراض نہیں ہیں جس قدر حدیثوں پر ہیں اور بیشمار آیتیں ایسی ہیں جن کو حدیثوں کے اثر سے قابل اعتراض بنایا جاتا ہے۔ ان اعتراضوں کے جواب میں اگر کہہ دیا جائے کہ ہم ان حدیثوں کو نہیں مانتے تو قرآن مجید پر سے اعتراض بالکل جاتا رہتا ہے۔ خود اہل حدیث بھی آریوں کے مقابلہ پر ایسا ہی کرتے ہیں اور صاف کہہ دیتے ہیں کہ ہم مشکوٰۃ وِ شکوٰۃ کو نہیں جانتے۔ بحث صرف الہامی کتاب پر ہے۔ تو کیا بالکلیہ بھروسہ کے لائق اور مبرا عن الخطا تفسیر سے یوں ہی پیچھا چھڑایا جاتا ہے۔ اور تماشہ یہ ہے کہ ان کا یہ گریز مفید بھی ہوتا ہے۔ تفسیر کا کام اعتراضوں سے بچانا ہوتا ہے نہ کہ خواہ مخواہ اعتراضوں کے نیچے دبا دینا؟

واقعہ یہ ہے کہ اسلام میں جس قدر گمراہ فرقے پیدا ہوئے ہیں یا ہوتے ہیں ان سب کا مدار انہی روایات پر ہے۔ ان کے اپنے وجود کے لئے دلیل مثلۂ معہ کی بارگاہ ہی سے ملتی ہے۔ قرآن کی بارگاہ سے کسی کو کوئی دلیل نہیں ملتی۔

رسولِ مقبولؐ اور صحابہؓ پر ایک عجیب و غریب بہتان

بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ حدیثیں لکھنے کی ممانعت شروع میں تھی لیکن بعد میں صحابہؓ کو احادیث لکھنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اگر بات یہی ہے تو سوال یہ ہے کہ ایسی ضروری قرار دی ہوئی حدیثیں جن کے اقرار و انکار پر کفر و اسلام کا مدار سمجھا جاتا ہے، کیوں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نہیں لکھیں یا نہیں لکھوائیں۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کا ان کے متعلق یہ ارادہ تھا کہ وہ پہلے خوب اچھی طرح بگڑ لیں۔ بہت کچھ گم ہو جائیں اور ضعیف و موضوع بن لیں اور راویوں کی کثرت گھٹتے گھٹتے ایک ایک حدیث کا راوی ایک ایک ہی رہ جائے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کو فوت ہوئے دو سو سال کا عرصہ گذر جائے اور تب امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ وغیرہ پیدا ہوں اور خود تنقید روایات کے اصول و قواعد گھڑ کر لمبے لمبے سفروں کی صعوبت اٹھا کر، در بدر کی ٹھوکریں کھائیں اور کہیں کے کہیں جا کر تلاش کر کر کے

احادیث کو قلم بند کریں ـــــ کہا جاتا ہے کہ احادیث کی تلاش و تحقیق میں جو تکلیفیں اٹھانی پڑی تھیں، وہ صبر و ضبط پیدا کرنے، لوگوں کے مرتبوں کو بڑھانے اور علم کا شوق پیدا کرنے کے لئے تھیں۔ لیکن اس پر سوال یہ ہے کہ کیا انسانوں کیلئے یہ بھی کوئی اصول ہے کہ اوّل تو ایک کام کو جو (اپنے وقت پر) سہولت اور صحت کے ساتھ ہو سکتا ہے نہ کیا جائے یا اسے مشکل اور مشتبہ بنایا جائے اور مناسب وقت نہ رہے تو بعد کے آنے والوں پر تحقیق و تفتیش کا بار ڈال دیا جائے تاکہ وہ صبر و ضبط سے کام لے کر ثواب حاصل کریں اور خدا کے ہاں درجے پائیں۔ اس طرح اگر امام بخاریؒ اور مسلمؒ کو تکلیفیں اٹھانے پر اجر و ثواب ملتا ہے تو آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہؓ کو اپنے وقت پر تغافل برتنے کے لئے کیا ملنا چاہیئے؟ جبکہ ان کے وقت میں حدیث نویسی کا کام پوری پوری صحت کے ساتھ اور لمبے لمبے سفروں کی تکلیفیں اٹھائے بغیر اور اکثر راویوں پر عیب لگانے۔ کسی کو رافضی، کسی کو خارجی، کسی کو فاسق و فاجر، کسی کو کاذب اور غیر ثقہ اور مجروح بنائے بغیر ہی ہو سکتا تھا۔

فن اسماء الرجال اور متوفی بزرگوں پر کذب و فسق کا جواز

کہا جاتا ہے کہ دین کی حفاظت کے لئے کسی کو فاسق و فاجر اور کذّاب کہنا کوئی گناہ نہیں بلکہ یہ تو ایک جہاد ہے۔ لیکن اگر حدیثوں کا اپنے مناسب وقت پر لکھا جانا ضروری تھا تو ان بزرگوں کے متعلق کیا کہا جائے گا۔ جنہوں نے دین کی اس حفاظت سے تغافل برت کر حدیثوں کو غریب و ضعیف بننے دیا۔ اور ایسے بڑے جہاد کی مصیبت میں ڈال دیا کہ اخلاف کو اپنے متوفی بزرگوں پر جرح و تنقید کر کے کسی کو فاسق و فاجر اور کسی کو کاذب اور کذّاب ثابت کرنا پڑا۔

ہر معاملے کو بروقت لکھنے کی قرآنی تاکید

ادھار لین دین کا وقتی معاملہ کرنے میں تو لکھنے کی ایسی تاکید ہو کہ خود حق تعالےٰ فرمائیں کہ معاملہ تھوڑا ہو یا بہت اس کو ضبط تحریر میں لے آنے میں

سستی نہ کرو اور حکم فرمائیں کہ لکھانا اس فریق کی ذمہ داری ہے جسے دینا ہے اور ارشاد فرمائیں کہ اپنے مردوں میں سے دو گواہ ایسے مقرر کرو جو تمہاری پسند اور اعتماد کے ہوں اگر دو مرد ایسے نہ مل سکیں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنا لو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ۚ وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ۚ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَن يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ ۚ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا ۚ فَإِن كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَن يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ ۚ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ ۖ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ ۚ وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا ۚ وَلَا تَسْأَمُوا أَن تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلِهِ ۚ (۲/۲۸۲)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جب تم آپس میں ایک مدت مقررہ تک اُدھار کا کوئی معاملہ کرو۔ تو اسے لکھ لیا کرو۔ اور تمہارے درمیان لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے اور کوئی لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے۔ جیسا خدا نے اسے سکھایا ہے اسے لکھ دینا چاہیئے اور جس پر حق واجب ہو وہی لکھوائے اور وہ اللہ سے ڈرے جو اس کا (اور سب کا) پروردگار ہے۔ اور اس میں سے (لکھوانے میں) کچھ کمی نہ کرے۔ تو اگر وہ شخص جس پر حق واجب ہوگا۔ بیوقوف (سیدھا) یا کمزور ہو یا وہ لکھوانے کی استطاعت ہی نہ رکھتا ہو تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھوا دے اور اپنے مردوں میں سے دو مردوں کو اس پر گواہ بنا لو اگر دو مرد نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنا لو۔ یہ گواہ ان لوگوں میں سے ہوں جو تمہیں پسند ہوں (اور جنہیں تم معتبر سمجھتے ہو) دو عورتیں اس لئے کہ ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ اور گواہوں

کو جب بلایا جائے تو (گواہی دینے کے لئے) وہ آنے سے انکار نہ کریں اور معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو تم اسے مدت معینہ تک لکھنے میں قطعاً سستی نہ کرو۔

مطلب یہ کہ اپنے وقت کے معاملہ میں بھی ضبط تحریر میں لانے کے ساتھ ایسے گواہ ہونے لازم ہیں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے بارہ میں جن کو اصولی طور پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دین میں شامل کیا جاتا ہے اور انہیں قطعاً دین اور وحی قرار دیا جاتا ہے۔ ایسا تغافل برتا گیا کہ بسا اوقات روایت در روایت کے طور پر بھی صرف ایک مرد یا صرف ایک عورت کی روایت پر ہی بنیاد رکھنی پڑتی ہے۔ اس سے حدیثوں کی حقیقت اور اصلیت کا پورا پتہ چل جاتا ہے۔

قرآنِ کریم کے کروڑوں حافظ مرد اور عورتیں اس کے گواہ ہیں

اس کے برعکس قرآنِ کریم کی تحریر تو شروع سے ہوتی آئی ہے اور جسقدر مرد اور عورتیں اس کے حافظ ہیں وہ سب اس کے گواہ ہیں اور الٰہی حفاظت کا ذمہ جو اس وحی کے لئے ہونا لازم ہے جو ہمیشہ کے لئے مقصود ہے ایک الگ اور مستقل نعمت ہے۔ اس سے لازم آتا ہے کہ ہمیشہ کے لئے مقصود وحی، جو اپنی اصلی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے وہ صرف ایک کتاب ہے اور وہ صرف قرآن مجید ہے اس کی صورت مبارکہ ہی اس کا خدائی پیغام ہونا پہلی نظر میں دکھلا دیتی ہے خط کے دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ کون لکھنے والا ہے اور کس کی طرف لکھا گیا ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ حدیثوں کی وحی قرآن مجید کے پایہ کی نہیں ہے اور نہ ویسی ضروری ہے اس لئے ویسی حفاظت کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کے گم ہو جانے اور گڑبڑ میں پڑ جانے کی کوئی فکر نہیں کی گئی۔ اگر بات یہ ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسی وحی کے خدا کی طرف سے آنے میں بھی کسی حفاظت کی ضرورت نہیں تھی۔ پس ایسی وحی جس کی حفاظت ضروری نہیں ہمیشہ کیلئے مقصود بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ جو تعلیم ہمیشہ کے لئے مقصود ہو اس کی ہمیشہ

یعنی قیامت تک کے لئے حفاظت بھی ضروری ہے جو صرف قرآن کریم کی بروقت تحریر اور کروڑوں حافظوں کی صورت میں موجود ہے اور بس۔

احادیث اور ترتیب قرآن

اس خیال کو کہ "حدیث کی حفاظت کو ضروری نہیں سمجھا گیا" ماننے والے اصحاب بھی حدیثوں کا نام وحی خفی اور وحی غیر متلو ہی رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن مجید کی آیات اور سورتوں کی ترتیب بھی اس وحی خفی اور غیر متلو کے ذریعہ سے دی گئی ہے۔ حالانکہ یہ امر ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے مطالب کا بہت کچھ انحصار قرآن مجید کی ترتیب پر بھی ہے پس ایسی (نام نہاد) وحی کے ذریعہ جس کی حفاظت قرآن عزیز کی طرح حق تعالیٰ کے ذمہ نہیں۔ قرآن کریم کی ترتیب تسلیم کرنا خود قرآن کو ظنی بنا دیتا ہے۔ اس سے ان لوگوں کو اس بات کا ماننا لازم ہوگا کہ قرآن کریم کی ترتیب کے لئے حق تعالیٰ کا ذمہ نہیں ہے کیونکہ خود اس وحی خفی کی حفاظت کے لئے (بقول اہل حدیث) خدا تعالیٰ کا ذمہ نہیں ہے۔ جس کے ماتحت یہ ترتیب واقع ہوئی ہے (بالفاظ دیگر جب ترتیب کا حکم غیر محفوظ اور ظنی ہے تو ترتیب بھی غیر محفوظ اور ظنی ہوئی)

قرآن کریم اور ترتیب قرآن

ناظرین کرام! حق تعالیٰ کے ذمہ قرآن مجید کا صرف نازل کر دینا ہی نہیں تھا بلکہ پہلے نازل شدہ کو آئندہ نازل ہونے والے قرآن کے ساتھ ملا کر اور جمع کر کے ایک تسلسل میں پڑھ دینا بھی تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ (۷۵/۱۷) بلاشبہ ہمارے ذمہ قرآن کا جمع کرنا اور پڑھ دینا ہے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے نازل شدہ قرآن مجید کو جمع کر کے ایک تسلسل میں حق تعالیٰ پڑھ بھی دیا کرتے تھے اور اس طرح اس کی ترتیب کو واضح طور پر دکھلا دیتے تھے۔

ہر سورت بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کی مستقل آیت سے

سے شروع ہوتی تھی۔ بسم اللہ کے ساتھ والی آیتیں بھی ساتھ ہی نازل ہوجاتی تھیں پھر جب دوسری دفعہ کسی سُورت کی اگلی آیتیں وحی ہوتی تھیں تو (قرآنی خبر کے مطابق) ضروری ہوتا تھا کہ اس سے پہلی آیتیں سامنے لاکر انہی کے تسلسل میں اُن کے ساتھ والی (پہلے نازل شدہ) آیتیں بھی پڑھ دی جائیں۔ اس طرح سے تمام سُورتوں کی آیتیں ترتیب وار نازل ہوتی جاتی تھیں۔ اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتے ہیں

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۸-۱۵﴾

اور البتہ تحقیق ہم اپنے اس قول (یعنی قرآن مجید) کو ان کے لئے ملا ملا کر (مربوط کرکے) لائے ہیں تاکہ یہ دھیان کریں۔

وَصَّلْنَا کے مبارک لفظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ پہلے نازل شدہ قرآن کو بعد میں آنے والی آیتوں کے ساتھ خود ہی ملا کر پڑھ دیتے تھے۔ پس اسی توصیل اور جمع سے سورتوں کی ترتیب بھی سامنے لائی جاتی تھی اور یوں تمام سُورتوں کو مسلسل کرکے اخیر میں قرآن جیسی نعمت سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے دُعائے ختم القرآن کے طور پر معوذتین نازل فرمائیں۔ لوگوں کو ہدایت کا طالب بننا سکھا کر قرآن کو شروع کیا اور حق تعالیٰ کی پناہ میں آنا سکھا کر ختم کیا جو بائے بسم اللہ سے لے کر سینِ والناس تک ہمارے لئے "بس" ہے۔

قرآن مجید وحی کی ضرورتوں کو پُورا کرنے کیلئے کافی اور کامل ہے

قرآن مجید اپنے آپ کو کافی اور کامل کہتا ہے۔ اور فرماتا ہے کہ میرے سوا کسی اور کو حَکَم نہ بنایا جائے یہ ارشاد صرف اسی تعلیم کے متعلق ہوسکتا ہے جس کا بیان کرنا قرآن مجید نے اپنے ذمے لیا ہے۔ لیکن جن باتوں کو دوسرے انسانوں کے حوالے کیا ہے اور جن کا فیصلہ مشوروں اور منصفوں پر چھوڑا ہے ان میں قرآن کریم نے مناسب ہدایات تو دیدی ہیں مگر خود ان کے فیصلوں کے بیان کو اپنے ہاتھ میں نہیں لیا۔ ایسے معاملات میں انسانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی عقل وخرد سے پورا پورا کام

لیں اور غور و فکر کے ذریعہ نتائج حاصل کریں۔ ان میں انسانی عقول پر کسی قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔ اس سے صاف کھل جاتا ہے کہ قرآن مجید صرف وحی کی ضرورتوں کے لئے کافی و کامل ہے۔ اور اسی لحاظ سے اس کے سوائے ہمارے لئے کسی اور اطاعت کا استقلال باقی نہیں رکھا گیا۔ ہاں جو کچھ ہماری عقلی کوششوں پر چھوڑا گیا ہے اس کے لحاظ سے ہمیں ہر جگہ سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ خاص حدیثوں کے ساتھ ہی دشمنی کرنا ظلم صریح ہے۔ احسن واہدیٰ بات کو ہر جگہ سے لے لینا چاہئے (البتہ ان کی پرکھ کے لئے کسوٹی قرآن کریم ہی ہوگی) حدیث کی ضروری باتوں کو وحی سمجھ کر نہیں بلکہ بطور احسن واہدیٰ اور اجتہاد نبوی ہونے کے اوروں کے مقابلے میں ترجیح کے ساتھ لے سکتے ہیں بلکہ لینا چاہیئے اور بے ضرر باتوں کے کرنے میں مختار ہیں۔ اس لئے حدیث کی خواہ مخواہ کی بے ضرورت مخالفتیں کرنا بہت ہی برا ہے۔

اِستقلال صرف قرآنِ کریم کو ہے

مختصر یہ کہ جب قرآنِ مجید نے ہدایت کے متعلق تمام ضروری وصیتوں کو اپنے اندر لے لیا ہے اور اس طرح دوسری الہامی کتابوں تک کا استقلال قائم نہیں رہنے دیا۔ تو کیا ضروری وصیتوں کو غیر محفوظ حدیثوں میں ہی الگ چھوڑ دیا ہے حالانکہ قرآن کے فعل سے اس کا منصب بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ضروری حدیثوں کو قُل کے حکم کے ساتھ بھی اپنے اندر محفوظ کر لیتا ہے اور اندازِ حکایت کی صورت میں بھی بعد از وقوع اپنے اندر لے آتا ہے۔ اور اس طرح رسول کے ضروری اقوال و افعال کو خود ہی روایت کر دیتا ہے۔

جب قرآن کریم نے اپنے اس فعل سے دوسری الہامی کتابوں کا استقلال ہمارے لئے قائم نہیں رہنے دیا تو کیا قرآن کریم کا وہی فعل حدیثوں کے اِستقلال کو قائم رکھ کر الٹا اثر دکھلا رہا ہے؟

اتباعِ ملّتِ ابراہیم ؑ کا حکم

حق تعالےٰ کا حکم ہے۔
فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ

حَنِيفًا (۳/۹۵) یعنی تم ابراہیم حنیف کی ملت کی پیروی کرو۔

(اس حکم قرآنی کے مطابق) اس پیروی کے لئے ہمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں اور حدیثوں کو تلاش کرتے پھرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ پیروی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے انہی اقوال و افعال کے ماننے اور ان کے مطابق عمل کرنے سے پوری ہو جاتی ہے جن کا ذکر قرآن کریم نے خود کر دیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور دیگر انبیاء و رسل اور نیک لوگوں کی پیروی کے لئے ہمیں قرآن مجید سے باہر جانے اور تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن تعجب ہے تو یہ کہ خود قرآن کریم کو لانے والے کی پیروی کے لئے اُمت کو قرآن سے باہر لے جایا جاتا ہے حالانکہ قرآن عزیز کو لانے والے کے حالات زندگی اور اقوال و افعال دوسرے رسولوں سے بڑھ کر قرآن میں لانے ضروری سمجھے گئے ہیں۔ اور قرآن مجید میں باقی تمام انبیاء کے حالات سے زیادہ حضور اکرمؐ کے حالات دیئے گئے ہیں جن سے مکمل سیرت مرتب ہو سکتی ہے۔

اتباع رسول صرف اتباع قرآن ہے

حاصل یہ ہے کہ قرآن کو لانیوالے کی وہ اطاعت جو ان اقوال و افعال میں کرنی لازم تھی جو مصدقۂ وحی ہوں۔ وہ صرف قرآن مجید میں ہی آجاتی ہے عقلی و انتظامی اطاعت بھی ضروری ہے اور وہ اس کے علاوہ ہے۔ قرآن مجید میں وحی کی ضرورتوں کو کامل و کافی طور پر پورا کر دیا گیا ہے۔ آیاتِ ذیل اس کیلئے شاہد عادل ہیں:۔

(۱) الٓمّٓصٓ ۝ کِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَیْکَ فَلَا یَکُنْ فِیْ صَدْرِکَ
حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِکْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ ۝
اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ
دُوْنِهٖٓ اَوْلِیَآءَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَذَکَّرُوْنَ ۝ (۷/۱-۳)

الٓمّٓصٓ یہ (قرآن ایک) کتاب ہے جو اے پیغمبر! آپ کی طرف اتاری گئی ہے۔ سو آپ کے سینہ میں اس کی وجہ سے کوئی تنگی نہیں ہونی چاہیئے۔ تاکہ آپ

اس کے ذریعہ سے لوگوں کو ڈرائیں۔اور (یہ کتاب) ایمانداروں کے لئے ایک نصیحت ہے۔ (اے ایمان والو!) تم اس کی پیروی کرو۔ جو تمہارے پروردگار کی طرف سے اتارا گیا ہے (جس کے اتارنے کا بیان اوپر آچکا ہے) اور اس کے علاوہ (دوسرے) اولیاء اور مددگاروں کی پیروی نہ کرنا۔ (مشکل یہ ہے کہ) تم بہت کم نصیحت قبول کرتے ہو۔

(۲) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے کہلوایا گیا ہے۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِىْ حَكَمًا وَّ هُوَالَّذِىْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ (پ ۶ - ۱۱۴-۱۱۵)

پھر کیا میں خدا کے سوا کوئی اور حَکَم (فیصلہ کرنے والا) تلاش کروں حالانکہ وہی حَکَم (فیصلہ کرنے والا) تو ہے۔ جس نے تمہاری طرف مفصل (نکھاری ہوئی) کتاب نازل فرمائی ہے۔ اور (وہ فرماتا ہے کہ) جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ قرآن آپ کے پروردگار کی طرف سے حق کے ساتھ اتارا ہوا ہے۔ لہٰذا آپ قطعاً شک کرنے والوں میں سے نہ ہوجیئے۔ اور آپ کے پروردگار کا کلام صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو چکا ہے۔ حق تعالیٰ کے کلمات کو بدلنے والا کوئی نہیں وہ سننے والا اور جاننے والا ہے اور اگر (اے پیغمبر!) آپ زمین والوں میں سے ان کی اکثریت کی پیروی فرمائیں گے تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں گے۔ وہ تو صرف ظن و تخمین (یعنی غیر یقینی باتوں) کی پیروی کرتے اور محض اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔

(۳) فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ۝ (پ ۹ - ۱۸۵)

اس (قرآن) کے بعد وہ کس حدیث (بات) کو مانیں گے؟

علم فرض ہے خدا اور عملاً اس کی کتاب ہے۔

(۴) اَوَلَمْ یَکْفِہِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ یُتْلٰی عَلَیْہِمْ ط
اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَرَحْمَۃً وَّذِکْرٰی لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ہ
(۲۹/۵۱) اور کیا ان کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے ان پر یہ کتاب اتاردی ہے جنکی ان پہ تلاوت کی جاتی ہے۔ بلاشبہ اس کتاب میں ان لوگوں کے لئے جو ایمان کی دولت سے مالامال ہیں۔ بڑی رحمت اور بڑی نصیحت ہے۔

(۵) وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ وَّھُدًی وَّ
رَحْمَۃً وَّ بُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ ہ (۱۶/۸۹) اور اے پیغمبر! ہم نے آپ پر یہ کتاب اتاری ہے جو ہر چیز کا تفصیلی بیان (تبیان) ہے اور فرمانبرداروں کے لئے ہدایت، رحمت اور بشارت ہے۔

(۶) وَمَا کَانَ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ یُّفْتَرٰی مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ
وَلٰکِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْہِ وَ تَفْصِیْلَ الْکِتٰبِ
لَا رَیْبَ فِیْہِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىہُ
قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّثْلِہٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ
دُوْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ہ (۱۰/۳۷-۳۸) اور ممکن نہیں کہ یہ قرآن اللہ کے سوا کوئی اور افتراء کرکے بناسکے۔ اور لیکن یہ تو اس وحی کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے آچکی ہے۔ نیز اس کتاب (صحیفۂ فطرت) کی تفصیل ہے۔ جس میں کوئی شک ہی نہیں ہے۔ (دونوں کتابیں قرآن اور صحیفۂ فطرت) اللہ کی طرف سے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ کیا یہ (کفار) یہ کہتے ہیں کہ قرآن کو محمد نے خود ہی گھڑ لیا (افتراء کرکے بنالیا) ہے (اگر ایسی بات ہے تو اے پیغمبر!) کہدیجئے کہ پھر تم اس جیسی ایک سورت ہی بناکر لے آؤ اور اللہ کے سوا جسے بھی تم (اپنی مدد کیلئے) بلاسکو بلالو اگر سچے ہو۔

صحیفۂ فطرت

(۷) وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ کُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّھُمْ
یَتَذَکَّرُوْنَ ہ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ لَّعَلَّھُمْ یَتَّقُوْنَ ہ
(۳۹/۲۷-۲۸) اور بلاشبہ ہم نے تمام لوگوں کے لئے اس قرآن میں ہر ایک طرح مثال

بیان کر دی کہ ہو سکتا ہے وہ کچھ نصیحت پکڑ لیں۔ اسے ہم نے عربی قرآن بنایا
ہے۔ جس میں کسی قسم کی کوئی کجی نہیں۔ شاید وہ (اس کے ذریعہ سے دینوی
اور اُخروی خطرات سے) بچ جائیں۔

مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن عزیز سیرت اور صورت دونوں میں کامل ہے۔

(۸) وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۙ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا
مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (۴۱/۴۱-۴۲)

یہ ایک زبردست کتاب ہے۔ باطل کی آمیزش اس میں نہ آج ہو سکتی ہے
نہ آئندہ قیامت تک کبھی ہو سکے گی کیونکہ اس کا نازل کرنے والا نہایت
حکمت والا صاحب حمد و ثنا ہے۔

(۹) اَمْ لَهُمْ شُرَكٰۗؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ
بِهِ اللّٰهُ ۭ (۴۲/۲۱) کیا ان کے لئے ایسے (خدا کے) شریک ہیں جنہوں
نے ان کے لئے ایسی دینی راہیں نکالی ہیں جن کا اللہ نے کوئی حکم نہیں دیا۔

(۱۰) وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۱۸/۲۶) اور وہ (یعنی اللہ) اپنے
حکم میں کسی کو شریک نہیں کیا کرتا۔

(۱۱) اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ (۶/۵۷، ۱۲/۴۰) اللہ کے سوا کسی کا حکم
نہیں ہے۔

(۱۲) وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ڰ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ (۴۲/۱۰)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوایا کہ "اور جو تمہارا آپس میں کسی
بات میں بھی اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف ہے۔ یہ (ہر ایک
امر میں فیصلہ دینے والا) اللہ میرا رب ہے۔ میرا بھروسہ اسی پر ہے اور
اسی کی طرف میں رجوع ہوتا ہوں۔

(۱۳) فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَاۗىِٕقٌۢ بِهٖ
صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَاۗءَ

مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ؕ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۰ (۱۱-۱۲/۱۳) اے پیغمبر اسلام! جو کچھ آپ کی طرف وحی کیا گیا ہے شاید اس کے بعض حصے کو چھوڑ دینا چاہیں اور اس کی وجہ سے آپ کے سینہ (دل) میں کوئی تنگی پیدا ہو۔ کیونکہ یہ لوگ کہیں گے کہ اس رسول کے اوپر (آسمان سے) کوئی خزانہ کیوں نہیں اترا یا اس کے ساتھ (تائید کیلئے) کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا۔ (اے پیغمبر! آپ ان کی باتوں سے قطعاً دل تنگ نہ ہوں) آپ تو محض ایک ڈرانے والے ہیں اور اللہ ہی ہر چیز پر کارساز ہے کیا وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے یہ قرآن خود ہی گھڑ لیا ہے؟ آپ کہدیجئے کہ (اگر یہ قرآن میں نے بنا لیا ہے تو) اس جیسی تم دس گھڑی ہوئی سورتیں بنا لاؤ۔ اور اللہ کے سوا جن کو تم اپنی مدد کے لئے بلا سکو بلا لو۔ اگر تم سچے ہو۔

مَایُوحیٰ سے مُراد

اس آیت مذکورہ بالا (۱۱/۱۲) میں قرآن کریم کے لفظ مَا یُوحیٰ سے مُراد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اور پوری مکمل وحی ہے کیونکہ اسی کل کے بعض حصے کو چھوڑ دینے یا اس سے دل تنگی محسوس کرنے کا اندیشہ بتایا جا رہا ہے۔ چنانچہ آیت محولہ سے ثابت ہے کہ کفار کہتے تھے کہ چونکہ اس رسول کے ساتھ کوئی فرشتہ ہمیں ڈرانے کے لئے نہیں آیا۔ اور اس پر آسمان سے کوئی خزانہ نہیں اترا اس لئے اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ وحی حق تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اسی کے جواب میں حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر بات یہ ہے (جو تم کہتے ہو کہ یہ قرآن ہمارے رسول نے خود ہی بنا لیا ہے) تو تم اس رسول کی وحی کی مانند دس سورتیں بنا کر لے آؤ۔ یہ دعویٰ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی تمام (پوری) وحی کے متعلق کیا گیا ہے کہ اس وحی یعنی قرآن کے مانند دس سورتیں بنا کر لے آؤ۔ اگر حدیثیں بھی وحی میں شامل ہوتیں تو کہا جاتا کہ دس سورتیں اور یا دس حدیثیں بنا کر لے آؤ۔ مگر یہاں تحدی صرف دس سورتوں کیلئے فرمائی گئی ہے۔

اور قرآن کریم سے یہ بھی واضح اور ثابت ہے کہ کفار سے مثل، صرف قرآن مجید ہی کی مانگی گئی ہے۔ اس سے بالکل سورج کی طرح روشن ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کوئی وحی قرآن مجید سے باہر نہیں رہنے دی گئی لہٰذا مَا یُوْحیٰ اِلَی الرَّسُوْل صرف وہی ہے جو وحی والے کامل دستور العمل قرآن مجید میں لایا گیا ہے۔

(۱۴) وَالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِیْرٌۢ بَصِیْرٌ ۝ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَیْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِکَ هُوَ الْفَضْلُ الْکَبِیْرُ ۝ ($\frac{۳۵}{۳۲-۳۱}$)۔ اور اے پیغمبر اسلام! وہ جو ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے اس کتاب (قرآن) سے وہی حق ہے۔ اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے۔ بے شک اللہ اپنے بندوں کے حالات سے واقف اور ان کے اعمال کو دیکھنے والا ہے۔ پھر ہم نے اس کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے منتخب کر لیا تھا۔ سو بعض ان میں سے ایسے ہیں جو اپنی جان پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض ان میں سے میانہ رو ہیں اور بعض ان میں سے اللہ کے اذن کے مطابق نیکیوں میں سبقت کرنے والے ہیں۔ یہ تو بڑا ہی فضل ہے۔

اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ سے بھی مراد قرآن ہی ہے

اس آیت کریمہ میں اَلَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ سے بھی مراد وہ تمام وحی ہے جو آپ پر نازل کی گئی ہے جس کا بیان مِنَ الْکِتٰبِ سے کر دیا گیا ہے۔ (کیونکہ یہاں "مِنَ الْکِتٰبِ" میں مِنْ بیانیہ ہے تبعیضیہ ہو ہی نہیں سکتا) جس سے ثابت ہوتا ہے کہ (وحی) صرف وہی ہے جو الکتٰب یعنی قرآن مجید میں لائی گئی ہے پھر بتا دیا گیا ہے کہ مسلمان صرف قرآن کریم ہی کے وارث بنائے گئے ہیں۔ احادیث کے نہیں۔ چنانچہ آگے حق تعالیٰ نے خود ہی

واضح فرما دیا ہے ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡكِتٰبَ (۳۵/۳۲) کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے مسلمان جس چیز کے وارث بنائے گئے ہیں وہ (صرف الکتٰب) قرآن مجید ہے۔ حدیثوں کی وراثت کا کوئی ذکر نہیں بلکہ مِنَ الۡكِتٰبِ فرما کر احادیث کو ورثہ سے خارج کر دیا گیا ہے اور

مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡهُ وَمَا نَهٰىكُمۡ عَنۡهُ فَانۡتَهُوۡا‌ۚ

(۵۹/۷) رسول نے تمہیں جو کچھ دیا ہے اسے لے لو اور جس سے روک دیا ہے اس سے رک جاؤ۔ (ظاہر ہے حضور نے ہمیں کتاب اللہ کی وراثت عطا کی اور حدیثوں کی کتاب لکھنے سے منع فرمایا) کے تحت صرف قرآن کو لینے اور غیر از قرآن کو چھوڑ دینے کا کہا گیا ہے۔

کفّار کی عداوت صرف قرآن کے ساتھ تھی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے سامنے صرف قرآن ہی پیش کیا کرتے تھے۔ چنانچہ کفار کی تمام عداوت اور دشمنی اسی قرآن کے ساتھ تھی احدیثیں تو وہ آنحضورؐ سے قبل نبوت ہی سے سنتے چلے آئے تھے۔ ان کے تمام اعتراضات بھی اسی قرآنِ کریم کے متعلق ہوا کرتے تھے۔ اگر قرآن مجید کے سوا کوئی اور مثلہٗ معہٗ بھی حضور کی طرف سے ان کو پیش کی جاتی تھی تو کفار کو اس سے بھی عداوت اور نفرت کیوں نہیں تھی؟ (اور کیوں کفار کو قرآن کے بغیر کسی مثلہ معہ کی مثل بنا لانے کی تحدی نہیں فرمائی گئی؟ جواب بالکل واضح ہے کہ حق تعالےٰ کیطرف سے تحدی تو ہے صرف وحی کے مثل بنا کر لانے کی۔ کیونکہ وحی انسان کا خاصہ نہیں خدا کا خاصہ ہے۔ احادیث جبکہ وحی تھیں ہی نہیں تو ان کے متعلق تحدی کس طرح ہو سکتی تھی؟ مشاہدہ اور تجربہ بھی یہی ہے کہ احادیث نبوی کے مثل تو بنانے والوں نے بنا بنا کر ڈھیر لگا دئیے ہیں۔ اس طرح موضوع اور وضعی حدیثوں نے صاف ظاہر کر دیا ہے کہ حق تعالےٰ کے اس دعوے

فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا (۲/۲۴) پھر تم یقیناً

اس وحی یعنی قرآن کی مثل نہ ماضی میں بنا کر لا سکے ہو اور نہ آئندہ بنا کر لا سکو گے۔

کے مطابق اگر احادیث نبوی بھی وحی ہوتیں تو دنیا بھر کے جن و انس مل کر بھی حدیثوں

کے انبار بنانا تو ایک طرف رہا۔ ایک حدیث بھی نہیں بنا سکتے تھے۔ آیات قرآنی سے ثابت ہے کہ کفار کو صرف وحی آلٰہی یعنی قرآن کے ساتھ ہی عداوت اور ضد تھی اور اسی کا وہ انکار کرتے تھے اس کے ثبوت میں چند ایک آیات قرآنی ہم ذیل میں درج کر رہے ہیں۔

اول:۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ (۳۴/۳۱) اور کافروں نے کہا کہ ہم ہرگز ہرگز اس قرآن پر ایمان نہیں لائیں گے اور نہ ان کتابوں پر جو اس سے پہلے آچکی ہیں۔

اس جگہ کفار نے قرآن کریم کے ساتھ پہلی کتابوں کے انکار کا ذکر تو کیا ہے مگر کسی مِثْلَهٗ مَعَهٗ کا انہیں خواب بھی نہیں آیا۔ ظاہر ہے کہ نہ اس کو ماننے کا کوئی سوال تھا اور نہ کفار کو اس کے انکار کی کوئی غرض پڑی تھی۔

دوم:۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝ (۴۱/۲۶) اور کافروں نے کہا کہ اس قرآن کو مت سنو اور اس میں شور وغوغا کرو تاکہ تم غالب آجاؤ۔

اس آیتِ کریمہ میں بھی کفار کے قرآن کریم ہی کو نہ سننے اور اس میں شور وغوغا مچانے اور بک بک کرنے کے منصوبے کی خبر دی گئی ہے ورنہ قرآن کے سوا جو احادیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا کرتے تھے انہیں تو کفار زمانۂ قبل نبوت ہی سے سنتے چلے آرہے تھے۔ اور ان کے سننے سے انہوں نے کبھی انکار نہیں کیا تھا۔ اور نہ اس میں شور وغوغا مچانے کا کبھی کوئی منصوبہ بنایا تھا۔

سوم:۔ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ (۱۰/۱۵) اور جب ان کے سامنے ہماری روشن آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے تو جو لوگ ہمارے سامنے پیش ہونے کی توقع نہیں رکھتے (حیات بعد الموت

پر ایمان نہیں رکھتے) کہتے ہیں کہ اے پیغمبر اس قرآن کے علاوہ کوئی دوسری کتاب لے آؤ، یا اس میں کچھ تبدیلیاں کر دو (کہ ہم اسے مان سکیں) آپ کہہ دیجئے کہ میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کر دوں۔ میں اسی کا تابعدار ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے پروردگار کی ذرا بھی نافرمانی کروں تو مجھے بہت بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں کفار کے اس مطالبہ کی خبر دی گئی ہے کہ انہوں نے کہا کہ آپ اس قرآن کی جگہ کوئی دوسرا قرآن لے آئیں یعنی اس قرآن کو اپنی احادیث کے ساتھ بدل دیں۔ لیکن آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے اعلان کرا دیا گیا کہ آپ کہہ دیں کہ میرے لئے یہ ممکن ہی نہیں اب اگر احادیث مبارکہ بھی وحی ہی تھیں تو وحی کو وحی کے ساتھ بدلنے کے مطالبہ پر انکار کے کیا معنے؟ لہٰذا اس آیتِ کریمہ سے بھی ثابت ہوا کہ احادیث مبارکہ وحی نہیں تھیں اور کفار کو انکار صرف اور صرف وحی الٰہی یعنی قرآنِ کریم ہی سے تھا۔

چہارم:۔ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ہ (۱۷/۴۱) اور بلاشبہ ہم نے اس قرآن میں مضامین پھیر پھیر کر بیان کر دیئے ہیں تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں اور یہ قرآن سوائے بدکنے اور بھاگنے کے انہیں اور کسی بات میں اضافہ نہیں کرتا۔

اس آیتِ کریمہ میں کفار کے بدکنے اور بھاگنے کی خبر قرآنِ کریم ہی کے متعلق دی گئی ہے۔

پنجم:۔ وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ہ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ہ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى

اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ○ (۱۷/۴۵-۴۶) اور اے پیغمبر! جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپ کے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے ایک پوشیدہ پردہ تان دیتے ہیں اور ہم ان کے دلوں پر بھی پردے ڈال دیتے ہیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ قرآن کو سمجھ سکیں۔ اور جب آپ قرآن میں اپنے یکتا پروردگار کا تذکرہ فرماتے ہیں تو وہ بدک کر اپنی پیٹھوں کے بل مڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔

وغیر ذلک من الآیات ـــــ قرآن کریم میں مؤمنوں پر آیات کے پڑھنے سے ہی کفار کی دست درازی کرنے کا ذکر ہے۔ قیامت میں بھی اہل جہنم سے قرآنی آیات ہی کے سوال کا ذکر ہے۔ احادیث اور روایات کا نہیں۔ وغیرہ وغیرہ

بات میں سے بات پیدا ہوتی چلی گئی۔ اس باب کا اصل موضوع یہ تھا کہ حق تعالیٰ نے انسان کو علم کے دو بڑے ذریعے عطا فرمائے ہیں اور انسان ان ہی دونوں ذریعوں سے آج تک کام لیتا چلا آیا ہے پہلا ذریعہ وحی ہے جو محض تصرف الٰہی سے بغیر انسانی کوشش اور ارادے کے محض موہبت الٰہی سے خاص خاص منتخب بندوں کے ذریعے عام انسانوں تک پہنچایا جاتا ہے اور دوسرا عقل ہے جو انسان اپنی کوشش، جدوجہد اور عزم و ارادہ سے حاصل کرتا ہے ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ پہلا ذریعہ قطعی اور یقینی ہوتا ہے اس میں غلطی کا امکان نہیں ہوتا اور دوسرا ذریعہ یعنی عقل کے ذریعہ سے جو معلومات حاصل ہوتی ہے وہ قطعی اور یقینی نہیں ہوتیں ان میں غلطی اور سہو و نسیان کا احتمال ہو سکتا ہے۔ پہلے ذریعہ سے حق تعالیٰ نے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن دیا ہے اور چونکہ احادیث وحی نہیں ہیں بلکہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے اپنے عقل و اختیار کے ذریعہ سے کئے گئے مختلف فیصلوں کا نام ہے جو روایت در روایت ہم تک نقل ہوتے پہنچے ہیں۔ اس لئے اگرچہ ان کی بھی اپنی اہمیت ہے لیکن وہ دین نہیں ہیں۔

وحی کے ساتھ عقل کی بھی ضرورت ہے سمند عقل کو وحی کی لگام دو۔ | حق تعالےٰ نے انسانوں کو صحیفۂ فطرت (کائناتی قوانین) اور عقل و ضمیر عطا فرمایا

ہے۔ ان کے ساتھ وحی الہٰی کی امداد کی جس قدر ضرورت تھی وہ بھی مکمل طور پر دے دی گئی ہے وحی کی ضرورتوں کے لحاظ سے قرآن مجید کافی ہے۔ جیسا کہ پہلے ثابت کیا جا چکا ہے وحی الٰہی نے ہمیں صحیح لائن یعنی صراطِ مستقیم پر چلنا سکھا دیا ہے اور اس کے اصول بیان فرما دیئے ہیں۔ اور ضروری نمونے بھی پیش کر دیئے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں بنا دیا کہ اب ہمارے لئے صحیفۂ فطرت (کائناتی قوانین) اور عقل و ضمیر سے کام لینے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔

دیکھئے مفقود الخبر کی نوجوان بیوی کو مجبور کر کے نکاح سے روکے رکھنا صریح ظلم ہے اس کا حل ضرور ہونا چاہیئے مگر وحی الہٰی میں یہ ذمہ نہیں لیا ہوا ہے کہ ہر ایک مفقود الخبر کے وقت پر وحی کر کے بتلا دیا جائے کہ وہ زندہ ہے یا مُردہ۔ شرارت سے کہیں چھپا ہوا ہے یا کسی ظالم و جابر کے پنجہ میں گرفتار ہے ایسا مقدمہ (وحی الٰہی قرآن مجید کی لگام کے ساتھ) حکام کی عقل و تحقیق پر ہی چھوڑا جا سکتا ہے۔ حکام کو لازم ہے کہ گمشدہ کی پوری تلاش کریں۔ حُلیہ بتلا کر اشتہار دیں اور پوری تحقیق کے بعد خوفِ خدا کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عقل و انصاف سے کام لیں اور اس کی نوجوان بیوی کو ضرر دینے کے لئے نہ روک رکھیں۔

مفقود الخبر کے لئے (اس کے متوفی والدین و اقارب کے ترکہ سے) ورثہ نکالنا یا اس کی جائداد کا کسی اور کو مالک ٹھہرانا اور اس میں اسے خرید و فروخت کا حق دینا بالکل حکام کی عقل و تحقیق پر چھوڑا گیا ہے ——— اگر قرآن مجید میں (اور بقول اہل حدیث، حدیث میں بھی) تمام عقلی ضرورتوں کا حل کر دینا لازم ہوتا تو جسمانی علاج کی ضرورتوں کے لئے طب کی ضخیم کتابیں لکھنے کی، سخت سخت بیماریوں کے علاج کی تحقیق کرنے کی، زراعتی ضرورتوں کے لئے علم فلاحت کی، اسی طرح ملکی و مالی و جنگی ضرورتوں کے حل کرنے کی، اور فقہ کے طویل و عریض دفاتر کے لکھنے کی کوئی ضرورت باقی نہ رہتی۔ پیچیدہ سے پیچیدہ بیماریوں کے علاج، خطرناک سے خطرناک جنگی اوزاروں کی تیاری کے لئے حدیث نکال کر رہنمائی لے لی جایا کرتی۔ لیکن حق تعالیٰ نے عقل کے استعمال کی ضرورت کو

خود باقی رکھتے ہوئے، جنگی تیاری، جسمانی علاج اور زراعت سے متعلق تاکیدی احکام تو قرآن کریم میں دیدیئے ہیں۔ مگر نہ توپ، ٹینک، طیاروں اور میزائیلوں کے بنانے کے گُر اور نسخے بیان کئے ہیں، نہ ٹی بی، سرطان، ٹائیفائیڈ اور نمونیہ کے علاج بتائے ہیں اور نہ زراعتی کھادوں اور فصلوں کے کیڑے مارنے کی دواؤں کے نسخے بیان فرمائے ہیں، بلکہ یہ سب کچھ انسانی عقل کی تحقیق و تجسّس پر ہی چھوڑ دیا گیا ہے۔

کیا دین میں عقل کی ضرورت نہیں؟

اگر دین میں عقل کی ضرورت نہیں تو عقل کو مدارِ تکلیف شرع کیوں بنایا گیا ہے۔ کیوں ایک نابالغ بچہ یا ایک پاگل قیود شرعی سے آزاد ہے؟ اگر قرآن مجید میں بلکہ حدیث میں بھی تمام عقلی ضرورتوں کو پورا کر دیا گیا ہے، تو منصفوں کے تقرر کا حکم کیوں دیا گیا۔ شوریٰ اور تفکر و تعقل اور استنباط کی کیوں تاکید کی گئی ہے۔ عقل و حکمت کی کیوں اس قدر تعریف کی گئی ہے اگر اس کے استعمال کی ضرورت نہیں تھی۔ ان عقلی امور کی ضرورت وحی کی ماتحتی میں زمانۂ رسولؐ میں بھی رہی ہے۔ اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بلاشبہ جو وحی ہوتی تھی۔ وہ قرآن کے مجموعہ میں محفوظ کر دی جاتی تھی۔ حضورؐ بلاشبہ عقل بھی رکھتے تھے اور اس سے اسی طرح کام لیتے تھے جیسے اب بھی کام لینا ضروری ہے اور آپ کے عقلی و انتظامی فیصلوں پر عوام کو اسی طرح چلنے کی ضرورت تھی جیسے کہ اب بھی اعلیٰ حکام کے فیصلوں کو ماننے کی ضرورت ہے جن کے فیصلوں کی آگے اپیل نہیں کی جا سکتی۔ اعلیٰ حکام کو ایسا اختیار مل جانے سے ان کی باتیں یا فیصلے (حدیثیں) وحی نہیں بن جاتیں۔ وحی وہی رہتی ہے جو وحی ہے۔ غیر وحی، وحی نہیں بن جاتی

شوریٰ کے قوانین

حاصل یہ ہے کہ اولوالامر والی آیت

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَ

أُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ۖ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۔ (۴/۵۹) اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اور اپنے میں سے عمالِ حکومت کی اطاعت کرو۔ پھر اگر کسی چیز میں باہم جھگڑا ہو جائے تو اگر تم اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھتے ہو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو یہی تمہارے لئے بہتر اور انجام کے اعتبار سے احسن ہے۔

یہیں اولوالامر کی اطاعت کا جو حکم دیا گیا ہے وہ صرف عقلی اور انتظامی ضرورتوں کے لئے ہی ہو سکتا ہے۔ اور رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی ایک الگ اطیعوا کا لفظ لا کر اور رسول اور اولوالامر کے درمیان واؤ عاطفہ لاتے ہوئے اسی اطاعت کے تحت لا کر اور اولوالامر کے ساتھ ہی شامل فرما کر یہ دکھلا دیا ہے کہ حضورؐ کی خاص اطاعت بھی ایسی ہی عقلی و انتظامی ہے جیسا کہ عمالِ حکومت (اولوالامر) کی اطاعت۔ فرق صرف اسقدر کیا گیا ہے کہ حضورؐ کو آخری اپیل کے لئے اعلیٰ جج (آخری اتھاریٹی) بتایا گیا ہے۔ اور دوسرے حکام (اولی الامر منکم) کو ماتحت حکام قرار دیا ہے۔ لیکن اللہ تعالےٰ کی خاص اطاعت جو ہے وہ وحی الٰہی ہی کی اطاعت ہے (جس میں کوئی بھی شریک نہیں ہو سکتا) یہ اعلیٰ و ادنیٰ حکام، مومنوں میں ان کے باہمی تنازعات میں وحی الٰہی کے احکام ہی کا اجراء کرائیں گے۔ اور ان کا یہ کام بھی ہوگا کہ وحی الٰہی کی ہدایتوں کے ماتحت شوریٰ کر کے عقل و انصاف کے ساتھ عقلی و انتظامی قوانین بھی تیار کریں۔

شوریٰ کے قوانین میں تبدیلی کی جا سکتی ہے یہ قانون نئے شوریٰ کے ماتحت (وحی کی حدود میں رہتے ہوئے) وقتاً فوقتاً عقلی ضرورتوں کے مطابق بضرورت بدلے بھی جا سکتے ہیں ان میں ترمیم بھی ہو سکتی ہے اس کام کے سرانجام دینے کے لئے بھی ہمیشہ زندہ حکام اور اہلِ شوریٰ کی ضرورت ہوگی اس میں بھی جو جھگڑے پڑیں گے ان کو بھی وحی الٰہی

آخری فیصلہ اعلیٰ اتھارٹی کی عقل و فہم پر چھوڑنا ہوگا۔

اگر اس زمانہ میں اہل حدیث صاحبان اپنا کوئی مقدمہ کسی اعلیٰ حاکم، خلیفہ یا قاضی القضاۃ کے پاس آخری فیصلے کے لئے لے جائیں اور اس سے کہیں کہ قرآن وحدیث کے مطابق ہم میں فیصلہ کر دو۔ لیکن فرض کیجئے کہ اس اعلیٰ حاکم نے مثلاً امام اعظمؒ کی تحقیقات کے مطابق ایسا فیصلہ دیا جسے فریق مقدمہ (اہل حدیث حضرات) قرآن وحدیث کے برخلاف سمجھتے ہیں تو کیا وہ اس صورت میں اس آخری فیصلہ کو نہیں مانیں گے؟ صاف ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں اہل حدیث صاحبان، اس مقدمہ کے فیصلہ کی خاطر قرآن وحدیث کو صرف اس اعلیٰ حاکم کے ایمان اور اس کے عقل وفہم پر ہی چھوڑ دیں گے؎ اور اس کے فیصلہ کو وحی الٰہی کی ہدایت کے ماتحت ہی باوجود غلط سمجھنے کے بھی مان لیں گے۔ آخر قاضی ابو یوسفؒ وغیرہ کے دور میں اہلحدیث حضرات ان کے فیصلوں کو (باوجود اپنے نزدیک اسے قرآن وحدیث کے خلاف سمجھتے ہوئے) تسلیم کرتے تھے یا بغاوت کرتے پھرتے تھے؟ جب بات یہ ہے تو کیا اسی طرح آخری فیصلے کی خاطر وحی الٰہی کو رسول کے ایمان اور فہم پر چھوڑ دینا لازم نہیں تھا؟ (تھا اور ضرور تھا)

؎ اس کی مثال میں وفاقی شرعی عدالت کے اس فیصلہ کو پیش کیا جا سکتا ہے جس میں وفاقی عدالت نے اپنی اکثریت سے یہ فیصلہ صادر کر دیا ہے کہ حدود آرڈیننس کے تحت زنا کی سزا میں رجم یعنی سنگسار کر دینا شرعی سزا نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس فیصلہ کو اہلِ حدیث صاحبان قرآن وحدیث کے مطابق نہیں سمجھیں گے۔ لیکن چونکہ فیصلہ وفاقی شرعی عدالت کا ہے، اسلئے وہ اسے ماننے پر مجبور ہیں۔ اتوار مؤرخہ ۱۵ جمادی الاول ۱۴۰۱ھ مطابق ۲۲ مارچ ۱۹۸۱ء کے روزنامہ جنگ کراچی کے صفحہ اول پر یہ خبر شائع ہوئی ہے ــــ رجم اسلامی اصولوں کے منافی ہے

اسلام آباد۔ ۲۱ مارچ (نمائندہ جنگ) وفاقی شرعی عدالت نے لاہور کے حضور بخش۔ ایم۔ آئی چوہدری اور ایک اور شخص کے زنا کے ارتکاب کرنے کے خلاف حدود آرڈیننس ۱۹۷۹ء کے ماتحت دی گئی سزا سنگسار کرنے یعنی رجم کے خلاف درخواستیں سماعت کے لئے منظور کر لی ہیں عدالت کے پانچ میں سے چار ججوں نے درخواستوں کے حق میں اور ایک نے خلاف فیصلہ دیا۔ اکثریتی فیصلے میں کہا گیا ہے کہ "رجم" چونکہ "حد" نہیں ہے اس لئے اسلامی اصولوں کے منافی ہے۔ فیصلہ میں واضح

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کی ہدایتوں کے ماتحت پنٹانے کا اختیار زندہ اعلیٰ حکام کو ہی ہوگا (متوفی بزرگوں کی قبریں یہاں بھی کام نہیں دے سکیں گی) حاصل یہ کہ ہمیں وحی الٰہی کے ساتھ اور اس کی ہدایتوں کے ماتحت اپنے باہمی تنازعات و مشاجرات کو سلجھانے کی اشد ضرورت ہے اور وحی کی ہدایتوں کے ماتحت قانون سازی اور عقلی تحقیقات اور انتظام بھی درکار ہے ان کے سرانجام دینے کے لئے حکام کا تقرر لازمی ہے پس وحی کی ہدایتوں کے ماتحت فیصلہ حاصل کرنے کے لئے ہمیں حاکموں کی طرف جانا پڑتا ہے۔ اگر ماتحت حکام سے تسلی نہ ہو تو پھر وحی کی ہدایتوں کے مطابق لازم ہے کہ اعلیٰ حکام کی طرف (جو رسولؐ کے بعد ان کا خلیفہ ہوگا) رجوع کیا جائے۔ اعلیٰ حاکم بھی اپنی طرف سے نہیں بلکہ وحی کے مطابق ہی فیصلہ کرے۔ ضرورۃً شوریٰ بھی کرے۔ چونکہ وہ آخری فیصلہ ہے اس لئے فریقین کو لازم ہے کہ اگر وہ فیصلہ کسی فریق کے نزدیک وحی الٰہی یا واقع کے خلاف ہے تو اس کے لئے اگرچہ وہ فیصلہ اس اعتقاد کے لائق نہیں ہے کہ اسے صحیح سمجھے۔ لیکن اسے عملاً تسلیم کر لینا اس پر فرض ہے۔ یہ ہے زمانۂ رسالت اور زمانۂ مابعد میں اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم کی صحیح شکل۔

آخری حَکَمْ کی ضرورت

رسول یا کسی اور اعلیٰ حاکم کی طرف مقدمہ صرف اس صورت میں لے جایا جا سکتا ہے جبکہ آخری حَکَمْ کی ضرورت سمجھی جائے۔ اگر ماتحت حکام کے فیصلہ پر فریقین کی تسلی ہو جائے تو رسول یا اعلیٰ حاکم کی طرف مقدمہ پہنچانے کی ضرورت نہیں رہتی یاد رہے کہ وحی کی ضرورت ہمیشہ ہے۔ رسول کے آخری فیصلے کی ضرورت ہمیشہ نہیں بلکہ صرف ماتحت حکام کے ساتھ تنازعہ کی صورت میں ہے ... "اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم" کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مقدمہ رسول اور اولی الامر سب کی طرف ضرور لے جایا کرو۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ متعلقہ مقدمہ ان میں سے جس کی طرف بھی لے جاؤ۔ اس کی اطاعت کرو۔ ہاں ماتحت حکام سے تنازعہ کی صورت میں، وحی الٰہی کی ماتحتی میں آخری فیصلہ کا حق رسول یا آپ کی وفات کے بعد آپ کے جانشین و خلیفہ یعنی اعلیٰ حاکم کے لئے ہوگا۔

پس بصورت تنازع کسی مقدمہ کو اللہ اور رسولؐ کی طرف موڑنے کے صرف یہی معنے ہو سکتے ہیں کہ تم اپنی طرف سے دلائل پیش کر کے اعلیٰ حاکم سے وحی الٰہی کی ہدایات کے ماتحت مقدمہ فیصل کرانے کی کوشش کرو اور وحی کے ماتحت اس کے ایمان و فہم سے فیصلہ کراؤ۔ یہ نہیں کہ اس کے فیصلہ دیدینے کے بعد اپنے فہم کا اختیار باقی رکھو۔ اور معاشرہ میں فساد برپا کرنے کے لئے یہ کہو کہ ہم نہیں مانتے، کیونکہ ہمارے نزدیک یہ فیصلہ وحی کی ہدایات کے برخلاف ہے۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں اسی چیز کی تاکید (۳۳/۳۶) میں کی گئی ہے کہ

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا (۳۳/۳۶) یہ بات نہایت ہی ضروری ہے کہ جب کوئی اعلیٰ حاکم اپنی کوشش کے مطابق اللہ تعالےٰ کے احکام کے ماتحت قضا یعنی فیصلہ کر دے تو کسی مؤمن مرد اور مومن عورت کو یہ زیبا نہیں کہ اس مقدمہ میں ان کا اپنا کوئی اختیار باقی رہ جائے۔ اور جو کوئی وحی کی ہدایت کے ماتحت بھی اعلیٰ حاکم کی نافرمانی کرے تو بلاشبہ وہ صریح گمراہی پڑ گیا۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) کیا گیا ہے کہ فیصلے کا اطلاق ۳۱ جولائی ۱۹۸۱ء سے ہوگا جبکہ حکومت وفاقی شرعی عدالت کے اعلان کے تحت آئین کے مطابق قانون میں ضروری ترمیم کرے گی جناب جسٹس شیخ آفتاب حسن نے باقی تین ججوں کے فیصلہ سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے فیصلے میں اس امر کی حمایت کی ہے کہ یہ سزا تعزیری کی صورت میں برقرار رکھی جائے جناب جسٹس کریم اللہ درانی نے اکثریتی فیصلے سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ "رجم" حد کے دائرہ میں آتا ہے شرعی عدالت جناب جسٹس (ریٹائرڈ) صلاح الدین (چیئرمین) جناب جسٹس آغا علی حیدر۔ جناب جسٹس شیخ آفتاب حسین۔ جناب جسٹس ذکاؤ اللہ لودھی اور جناب جسٹس کریم اللہ درانی پر مشتمل تھی۔

عدالتی فیصلے حق تعالیٰ خود اگر نہیں کرتے بلکہ اعلیٰ ماتحت حکام پر ہی چھوڑے گئے ہیں

حق تعالیٰ نے اپنی وحی میں بطور نمونہ کے بہت سے فیصلے کر بھی دیئے ہیں اور باقی فیصلوں کیلئے واضح ہدایات فرما دی ہیں کہ انہیں عدل وانصاف کے ساتھ اپنی عقل اور باہمی شوریٰ سے حل کر لیا کرو۔ لیکن عوام کے باہمی تنازعات اور مشاجرات کے وقت ان فیصلوں کو اس دنیا کے ججوں کی طرح عملاً نافذ کر دینا بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں نہیں رکھا بلکہ یہ کام صرف حکموں اور حاکموں پر ہی چھوڑا ہوا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق اپنی عقل او فہم سے اس کا فیصلہ کریں۔

بلاشبہ حق تعالیٰ بجلی گرا کر، زلزلہ لا کر، آتش فشاں پہاڑوں کو پھاڑ کر یا کوئی اور نقصان پہنچا کر سزائیں دیدیا کرتا ہے، یا اصل حقیقت سے پردے اٹھا کر شریروں کی شرارتیں کھلم کھلا دکھا دیتا ہے لیکن اُولِی الْاَمْرِ والی مذکورہ بالا آیت (۵۹/۴) میں مقدمات کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف موڑنے سے مراد اس قسم کے فیصلے مانگنا نہیں۔ ایسے فیصلے تو صرف خدائے واحد کی طرف ہی موڑے جا سکتے ہیں اس آیت (۵۹/۴) میں فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ یعنی اللہ اور رسول کی طرف موڑنے سے اُن فیصلوں کو عملاً کرا لینا ہی مراد ہو سکتا ہے تاکہ تنازعہ ختم ہو جائے ——— اور یہ ظاہر ہے کہ مقدمہ کو حکومت کے ذریعہ عملی طور پر فیصل کرا لینے کے لئے صرف رسول داور آپکے بعد آپ کے جانشین خلیفہ یا سربراہ حکومت کی طرف ہی لے جانے کی ضرورت ہو سکتی ہے کیونکہ یہ کام اس دنیا کے ججوں کی طرح اللہ تعالیٰ کے ذمہ پر نہیں ہے پس اگر اس آیت میں صرف یہی کہا جاتا کہ فَرُدُّوْهُ اِلَی الرَّسُوْلِ یعنی ماتحت حکام کے ساتھ تنازع کی صورت میں اس مقدمہ کو رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف پھیرو تو پھر اہل حدیث کا اخذ کردہ مفہوم، بالکل صحیح ہوتا لیکن یہاں تو فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ

رسولِ اکرمؐ اور اعلیٰ حاکم فیصلہ دینے میں مطلق العنان نہیں ہیں

کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ حاکم، جج، خلیفہ اور خود رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالےٰ انہیں فیصلہ دینے میں مطلق العنان چھوڑ دیں۔ اس لئے (۴/۵۹ میں) رسول کے ساتھ بھی اللہ کے نام پاک کا لانا لازم ہوا۔ تاکہ یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے اور رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ بات سکھا دی جائے کہ

— آخری فیصلہ تو اے رسول آپ ہی کریں گے مگر اس فیصلہ دینے میں آپ مطلق العنان نہیں ہیں — کہ میری ہدایات سے نکل کر آپ جس طرح چاہیں۔ اپنی مرضی سے فیصلہ دے دیں۔ بلکہ وہ فیصلہ جو آپ کی طرف موڑا گیا ہے میری ہدایات کے ماتحت ہی آپ کی طرف موڑا گیا ہے۔ اور لوگوں کو یہ حق ہے کہ وہ میری ہدایات کے مطابق ہی آپ سے فیصلہ کرائیں۔ پس کسی ایک مقدمہ کو اللہ اور رسول کی طرف موڑنے کے صرف یہی معنے ہو سکتے ہیں کہ اللہ کے احکام و ہدایات کے ماتحت آخری فیصلہ حاصل کرنے کے لئے رسول اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء اور اعلیٰ حکام کی عقل و فہم سے کام لیکر مقدمہ کو ختم کر دو۔ حاصل یہ ہے کہ :—

رسول کے ساتھ اللہ کا نام پاک لانے سے یہ سکھانا مقصود ہے کہ حکم صرف اللہ کا ہے۔ رسول تو صرف اللہ تعالےٰ کی ہدایات کے ماتحت آخری فیصلہ کر دینے والا ہے۔ مطلق العنان نہیں ہے۔ وہ اللہ کے حکم کے مطابق ہی مطاع ہے۔ جیسے کہ فرمایا

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (۴/۶۴)

اور ہم نے ہر رسول کو اسی لئے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔

یعنی ہم نے کسی رسول کو بھی مطلق العنان بنا کر نہیں بھیجا مگر صرف اس لئے بھیجا ہے تاکہ حکم الٰہی کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے۔

رسولِ مقبول اور مؤمنین کیساتھ اللہ تعالیٰ کا نام پاک

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین کیساتھ قرآن کریم میں اور بھی کئی مقامات پر حق تعالےٰ کا پاک نام متصلاً لایا گیا ہے۔ اس کی مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) مدینہ منورہ کی حیاتِ مبارکہ میں منافق لوگ مؤمنین کو دھوکے دیا کرتے تھے۔ اللہ تعالےٰ کو دھوکہ دینا نہ ان کے بس میں تھا اور نہ وہ دے سکتے تھے۔ مگر چونکہ مسلمانوں کے ساتھ ان کی شرارت اللہ وحدہ لاشریک لہٗ کے ماننے اور وحی الٰہی کی ماتحتی کے سبب سے تھی۔ اس لئے اس ماتحتی کے باعث ہی فرمایا کہ وہ اللہ اور مؤمنوں کو دونوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۲/۹)

(۲) کفار عموماً رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو طرح طرح سے ایذائیں دیا کرتے تھے وہ اللہ کو ایذا نہیں دیتے تھے (بلکہ نہیں دے سکتے تھے) وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کرتے تھے۔ اللہ سے جنگ نہیں کرتے تھے اور نہیں کر سکتے تھے۔ مگر ان لوگوں کا رسول اللہ کو ایذا دینا اور رسول اللہ سے جنگ کرنا چونکہ اس وجہ سے تھا کہ آپ حق تعالےٰ کی ماتحتی میں منشائے الٰہی کے مطابق ہی کام کر رہے تھے اس لئے حق تعالےٰ نے فرمایا کہ یہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کو ایذاء دیتے اور اللہ اور اسکے رسول سے جنگ کرتے ہیں یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (۳۳/۵۸) اور یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (۵/۳۳)

(۳) مؤمن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مدد کرتے تھے اللہ کی مدد نہیں کرتے تھے اللہ کو کسی کی مدد کی کیا ضرورت اور کوئی کیا اللہ کی مدد کر سکتا ہے۔ مگر چونکہ انکا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مدد کرنا محض حق تعالےٰ کی خوشنودی کی خاطر تھا اس لئے فرمایا گیا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں۔ یَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (۵۹/۸) (وغیر ذلک من الآیات)

اسی طرح چونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کوئی آخری فیصلہ تسلیم کر لینا حق تعالیٰ

ہی کے حکم سے ہے۔ لہٰذا اِس فیصلہ کو ماننا اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ کو ماننا ہے۔
لہٰذا رسول کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا مبارک نام اللہ کا استقلال اور رسول کی اپنی حق تعالیٰ کی ماتحتی کو دکھلانے کے لئے لایا گیا ہے ۔
یہ نہیں کہ اللہ کے ساتھ رسول اللہ کو ایک دوسرا مستقل حاکم، قاضی اور اتھارٹی بنا دیا جائے۔

سوچنے کی بات ہے کہ کیا ایک فیصلہ، ایک امر اور ایک وعدہ میں اللہ اور رسول باہم مشورہ کر کے کام کرتے ہیں؟ معاذ اللہ۔

جب فیصلہ ایک ہے اور امر ایک ہے اور وعدہ ایک ہے تو اس میں اللہ رسول دونوں ایک ہی قسم کے حاکم اور قاضی کیسے ہو سکتے ہیں یہی حال انتظامی معاملات میں تمام آخری فیصلہ دینے والوں کا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ کام پہلے کرا کے دکھلا دیا ہے۔ رسول اللہ کے بعد یہی حق آنحضرت کے خلفاء راشدین کی طرف منتقل ہوتا جاتا ہے۔ رسول کی خاص اپنی اطاعت کے یہی معنے ہیں۔

رسولی فیصلوں کے ساتھ وعدۂ خلافت

چونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ زندہ رہنا نہیں تھا۔ اسلئے آپ کے فیصلوں کے ساتھ ساتھ خلافت کا وعدہ بھی فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ نور میں پہلے زانیوں اور تہمت لگانے والوں کی سزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَّلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ الزَّانِي لَا يَنكِحُ إِلَّا زَانِيَةً أَوْ مُشْرِكَةً وَالزَّانِيَةُ لَا يَنكِحُهَا إِلَّا زَانٍ أَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذَٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ۝ وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ

تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(۲۴/۲ تا ۵) زنا کار عورت اور زنا کار مرد، ان میں سے ہر ایک کے سو کوڑے مارو، اور تمہیں اللہ کے دین میں ان پر ذرا ترس نہ آنا چاہیئے۔ اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو، اور ان کی سزا دیئے جانے کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت موجود ہونی چاہیئے۔ زنا کار مرد بجز زنا کار یا مشرک عورت کے کسی (نیک اور پارسا عورت) سے نکاح نہ کرے اور زنا کار عورت سے سوائے زنا کار مرد یا مشرک مرد کے کوئی نکاح نہ کرے مسلمانوں پر یہ نکاح حرام کر دیئے گئے ہیں۔ اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر (زنا کی) تہمت دھرتے ہیں پھر چار گواہ پیش نہیں کر پاتے تو انہیں اسی کوڑے مارو۔ اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو۔ یہ لوگ فاسق ہیں۔ بجز ان لوگوں کے جو اس کے بعد توبہ کر لیں اور اعمال صالح کریں تو یقیناً حق تعالے بخشنے والے رحم فرمانے والے ہیں۔

اس کے بعد آیات نمبر ۲۴/۲۷ تا ۳۳ میں ایک دوسرے کے گھر آنے جانے کے قواعد اور لونڈی غلاموں کے متعلق قوانین بیان فرمائے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا ۚ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَاۤ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ۝ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۚ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ

مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ وَلَا يُبْدِينَ
زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ آبَاءِ بُعُولَتِهِنَّ
أَوْ أَبْنَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي
إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي أَخَوَاتِهِنَّ أَوْ نِسَائِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ
أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التَّابِعِينَ غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ
أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا عَلَىٰ عَوْرَاتِ النِّسَاءِ ۖ وَلَا
يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ ۚ وَ
تُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝
وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ
إِمَائِكُمْ ۚ إِنْ يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ۗ
وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ
نِكَاحًا حَتَّىٰ يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ۗ وَالَّذِينَ يَبْتَغُونَ
الْكِتَابَ مِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ
فِيهِمْ خَيْرًا ۖ وَآتُوهُمْ مِنْ مَالِ اللَّهِ الَّذِي آتَاكُمْ ۚ
وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا
لِتَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَنْ يُكْرِهْهُنَّ
فَإِنَّ اللَّهَ مِنْ بَعْدِ إِكْرَاهِهِنَّ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

(۲۴ / ۲۷-۳۳) اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں نہ چلے جایا کرو جب تک (باقاعدہ) اجازت نہ لے لو۔ اور طریقہ یہ ہے کہ (گھر والوں کو (بلند آواز سے) سلام (کر کے اجازت طلب) کرو۔ یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ اُمید ہے کہ تم نصیحت حاصل کرو گے تو اگر تم ان (گھروں) میں کسی مرد کو نہ پاؤ تو اندر نہ چلے جاؤ۔ جب تک تمہیں اجازت نہ دے دی جائے۔ تو اگر تم سے کہا جائے کہ (اس وقت) لوٹ جاؤ تو تم لوٹ آؤ، یہی طریقہ تمہارے لئے پاکیزہ تر ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو۔ اللہ اسے خوب جانتا ہے۔

غیر رہائشی مکانات میں جہاں تمہارا سامان اور اسباب رکھا ہوا ہے چلے جانے میں
تم پر کوئی مضائقہ نہیں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جسے چھپاتے ہو خدا اسے
خوب جانتا ہے۔ اے پیغمبر! آپ مومن مردوں سے فرما دیجئے کہ وہ اپنی
نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں یہ ان کے لئے پاکیزہ
تر ہے اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں اے پیغمبر! آپ مومن
عورتوں سے بھی فرما دیجئے کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں
کی حفاظت کریں اور اپنے زینت کے مقامات کو ظاہر نہ کریں بجز اُن اعضاء
کے جو خود ہی ظاہر ہو جاتے ہوں (مثلاً چہرہ، ہاتھ اور پاؤں) اور اپنے گریبانوں
پر دوپٹے ڈالے رکھیں اور اپنے مقامات زینت کو بجز اپنے شوہروں اپنے
والدوں اور خسروں، بیٹوں، شوہر کے بیٹوں، بھائیوں، بھتیجوں،
بھانجوں کے نوکر چاکر عورتوں اور ان خادموں کے جنہیں عورتوں کی کوئی
خواہش نہیں ہوتی ان بچوں کے جو عورتوں کے مستور اعضاء سے ابھی
واقف ہی نہیں کسی اور پر ظاہر نہ کریں اور اپنے پاؤں زمین پر زور سے
نہ ماریں کہ ان کی زینت کی چیزیں جنہیں چھپانا ہوتا ہے ظاہر ہو جائے
اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! سب کے سب اللہ کی طرف رجوع رہو۔ امید
ہے کہ تم فلاح پا جاؤ گے اور اپنی رانڈ عورتوں کا نکاح کرا دیا کرو نیز
اپنے نیک اور صالح مردوں کا بھی اور اپنی باندیوں کا بھی اگر وہ فقیر و
نادار ہوں تو اللہ اپنے فضل سے انہیں غنی فرما دے گا اللہ بڑی وسعت
والا اور علم والا ہے اور جو لوگ نکاح کی استطاعت نہ رکھتے ہوں وہ
عفت کی زندگی گزاریں حتیٰ کہ اللہ انہیں اپنے فضل سے غنی فرما دے
اور جو تمہارے ملک یمین میں سے ہوں اور رقم ادا کر کے آزادی کے طلبگار
ہوں تو ان سے رقم لے کر آزاد کرنے کا معاہدہ کر لو اگر تم ان میں بھلائی کی
علامات دیکھتے ہو اور جو اللہ نے تمہیں مال و دولت دیا ہوا ہے اس
میں سے انہیں بھی دو (اور آزادی حاصل کرنے میں ان کی مدد کرو) اور

اور اپنی کنیزوں کو اگر وہ نکاح کرنے کا ارادہ کریں (نکاح سے روک کر) بدکاری پر مجبور نہ کرو (کیونکہ جنسی خواہش فطری مجبوری ہے۔ اگر جائز طریقے سے اسے پورا نہیں کرنے دو گے تو وہ ناجائز راہیں تلاش کریں گی پس تم انہیں نکاح کرنے سے اسلئے روکو) تاکہ تمہیں اسباب زندگی کا حصول آسان ہو (اور وہ تمہاری خدمت کریں اور کچھ محنت مزدوری کر کے کما کر تمہیں دیں) جو شخص انہیں (اس طرح) بے راہ روی پر مجبور کرے گا۔ تو اللہ اس مجبور کرنے کے بعد (ان کے لئے تو) بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے (مگر تمہیں ضرور اس کی سزا دے گا۔

ان معاشرتی قوانین کو بیان کرنے کے بعد ضروری تھا کہ ان قوانین کے نفاذ کیلئے اور مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرانے کے لئے اور حقداروں کو ان کا حق دلوانے کے لئے عدالتیں قائم کر کے اعلیٰ حاکم یعنی رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی تاکید فرمائی جائے۔ چنانچہ یہ تاکید بھی خوب زور سے فرمائی گئی اور اس اطاعت کو اطاعتِ معروفہ کا لقب عطا فرمایا گیا۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ؕ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ۔ (۲۴ / ۵۳-۵۴) اور انہوں نے اللہ کی بڑی ہی پختہ قسمیں کھائیں کہ اگر آپ انہیں حکم دیں گے تو وہ ضرور (جنگ اور قتال کیلئے) باہر نکلیں گے۔ اے پیغمبر! آپ (ان سے) کہہ دیں کہ قسمیں مت کھاؤ (اس کی ضرورت نہیں) دستور کے مطابق فرمانبرداری مطلوب ہے۔ یقیناً جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کی فرمانبرداری کرو، اور رسول کی فرمانبرداری کرو، سو اگر وہ اس سے روگردانی کریں تو رسول پر تو اسی کی ذمہ داری ہے جو اس پر بوجھ ڈالا گیا ہے۔ اور تم پر اس

بوجھ کی ذمہ داری ہوگی جو تم پر ڈالا گیا ہے۔ اور اگر تم رسول کی فرمانبرداری کروگے تو
ہدایت پا جاؤ گے۔ اور رسول کے ذمہ تو صرف وضاحت کے ساتھ پہنچا دینا ہی ہے۔

اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان آیات کے نزول کے وقت خود موجود تھے۔ لہذا آیت میں اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ فرمانا چاہیئے تھا۔ چنانچہ فرمایا گیا لیکن رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم ایک بشر تھے۔ اور انہیں ایک دن دنیا سے چلا جانا تھا

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۳/۱۴۴

محمدؐ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں، ان سے پہلے اور رسول بھی گذر چکے ہیں، پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو تم لوگ اسلام سے پلٹ جاؤ گے؟ یاد رکھو! جو الٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا۔ البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انہیں وہ اس کی جزا دے گا۔

اس لئے ضروری تھا کہ اس انتظام کو (آگے کیلئے) قائم رکھنے کی خاطر آپ کے بعد آپ کے خلفاء کے قائم کرنے کا بھی وعدہ فرمایا جائے۔ چنانچہ آیت (۲۴/۵۵) میں یہ وعدہ بھی پورے زور کے ساتھ کیا گیا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِىْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِىْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ (۲۴/۵۵) اللہ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک کام کئے ہیں وعدہ فرمایا ہے کہ انہیں زمین میں ضرور خلافت عطا فرمائے گا جیسا کہ ان لوگوں کو خلافت فرمائی تھی جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں اور ان

کیلئے ان کے دین کو محکم کردیگا جو اللہ نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے اور خوف واندیشے کے بعد ان کے لئے امن تبدیل کر دے گا تاکہ وہ (آزادی سے) میرے احکام کی اطاعت کرسکیں۔ اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں اور جو اس کے بعد بھی کفر کی روش اختیار کرے۔ تو ایسے ہی لوگ فاسق ہوتے ہیں۔

لہٰذا ان تمام آیات میں رسول کی اطاعت سے مراد خود رسول اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں ان کی اطاعت اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء کی انتظامی اطاعت ہے۔ کتب روایات کی اطاعت ہرگز مراد نہیں بعض روایات میں بھی یہ چیز وضاحت سے بیان کی گئی ہے مثلاً ارشاد نبوی ہے کہ

من اطاعنی فقد اطاع اللہ۔ ومن اطاع امیری فقد اطاعنی ومن عصانی فقد عصی اللہ ومن عصی امیری فقد عصانی (صحاح) جس نے میری اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے میرے مقرر کردہ حاکم کی اطاعت کی اس نے دراصل میری ہی اطاعت کی ـــ اسی طرح میرے امیر کی نافرمانی، میری نافرمانی اور میری نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے۔ (بخاری و مسلم)

غرض یہ کہ اللہ کی ماتحتی میں رسول کا قائم کردہ یہ انتظام نوع انسانی کے لئے بڑی ہی رحمت تھا۔ مگر وائے افسوس کہ اس کی کماحقہٗ قدر نہیں کی گئی۔

ضابطۂ الٰہی کی روشنی میں انبیاء کا قائم کردہ نظام

جو نظام ضابطۂ خداوندی کی روشنی میں حضرات انبیاء کرام کے ہاتھوں قائم ہوتا ہے وہ کافر اور مؤمن ہر ایک کے لئے رحمت ہی رحمت ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے تمام لوگوں کے ساتھ بلا تفریق مذہب وملت، عدل و احسان، قسط اور بِرّ یعنی نیکی اور بھلائی کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآیِٔ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ۔

(۱۶/۹۰) یقیناً حق تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم فرماتے ہیں اور قرابت داروں کو امداد

دینے کا اور بے حیائی، بُرے کام اور سرکشی سے منع فرماتے ہیں۔ حق تعالٰے تمہیں نصیحت فرماتے ہیں شاید تم اسے یاد رکھو۔

بلکہ قرآن کریم نے تو بدی کے بدلے میں بھی نیکی کرنا سکھایا ہے۔

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ط اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ ہ (۳۴/۴۱) نیکی اور بدی برابر نہیں ہو سکتیں۔ (اے پیغمبر! برائی کا) آپ دفعیہ ایسے طریقے سے فرمائیے جو بہترین ہو تو (آپ دیکھیں گے کہ) یکایک وہی آدمی جو آپ کا (سخت) دشمن تھا گویا کہ آپ جگری (مخلص) دوست بن گیا ہے۔

قرآن مجید کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام شاہِ مصر کے قوانین کے مطابق چلتے تھے۔ اور اسی کے مطابق فیصلے دیتے تھے۔ عزیز کی غلامی میں یوسف علیہ السلام باوجود ہزار تحریصوں اور دھمکیوں کے عزیز کے خائن نہ بنے۔ اگرچہ آپ حقیقتہً غلام نہ تھے لیکن جب غلامی سر پر آن پڑی تو حق غلامی بخوبی ادا فرمایا۔ قید خانے میں نیک قیدی ثابت ہوئے اور اپنی صفائی کرائے بغیر قید خانہ سے نہ نکلے۔ آخر بادشاہ کی نوکری کی۔ اور ایسی نوکری کی کہ اس کے ملک کو مالا مال کر دیا۔ اور ملک کی رعایا کو خوشحال بنا دیا۔ اور جب تک بادشاہ کا پورا پورا اعتماد حاصل نہ کر لیا اپنے ماں باپ کو بھی نہ بلایا۔ بلکہ ظاہراً پتہ بھی نہ بتایا کہ میں کون ہوں اور کہاں کا رہنے والا ہوں۔ حالانکہ آپ کے باپ نے آپ کے فراق میں سخت تکلیفیں اٹھائیں اور سخت اذیتیں برداشت کی تھیں۔ بہر حال سرزمین مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قائم کردہ نظام ایک عالمگیر رحمت ثابت ہوا۔

وحی کے تحت عقل کی ضرورت

خلاصہ یہ کہ وحی کے علاوہ عقلی کوششوں کی بھی ضرورت ہے تمام مباحثات اور تحقیقات کے لئے پہلے ایسے علوم کی ضرورت ہے جن پر اُن تحقیقات کی بنیاد رکھی جائے۔ ...... یہ ابتدائی اور بنیادی علوم ہر ایک صحیح

دماغ والے کے نزدیک مسلّم ہونے چاہئیں۔ وحی کی دریافت کا اور تمام عقلی کوششوں کا انحصار انہی پر ہوتا ہے۔ وحی اور عقل کی ضرورت پر اس سے پہلے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ یہاں کسی قدر علیحدہ بھی اس موضوع پر تحریر کیا جاتا ہے۔

حق تعالیٰ نے دیکھنے کے لئے ہر انسان کو چشم بینا عطا فرمائی ہے لیکن چشمِ بینا اسی وقت صحیح کام کر سکتی ہے جب باہر کی فضا بھی روشن ہو، گھٹا ٹوپ اندھیرے میں انسانی آنکھ بینائی سے معذور ہو جاتی ہے۔ ضروری ہے کہ فضا میں سورج کی، چاند کی، بجلی کی یا مٹی کے دیئے ہی کی روشنی ہو تاکہ چشمِ بینا اپنا کام کر سکے۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے ہر انسان کو غور و فکر کرنے، سوچنے اور سمجھنے کے لئے عقل و شعور کی طاقت عطا فرمائی ہے لیکن عقل و شعور کی یہ طاقت اسی وقت صحیح کام کر سکتی ہے جبکہ بیرونی فضا وحی کی روشنی سے منور ہو۔ بغیر وحی کی روشنی کے انسانی عقل و شعور بھی خیالی اور وہمی باتوں کو حقیقت باور کر لیتی ہے۔ اس لئے وحی اور عقل و شعور کا باہمی تعلق بہت ضروری ہے۔

لیکن جن اشخاص کو وحی الٰہی کی روشنی نہیں پہنچ سکی۔ ضروری ہے کہ ان کا حساب و کتاب حق تعالیٰ کے ہاں ان کی عقل و فہم ہی کے مطابق ہو۔ پس وحی نہ ملنے کی صورت میں عقل سے کام لینا ضروری ہے۔ اس سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جو باتیں وحی الٰہی نے بیان نہیں کیں وہ اسی لئے چھوڑ دی گئی ہیں کہ دُنیا میں عقل تو موجود ہے جس سے کام لینا ضروری ہے وحی الٰہی کے علاوہ اگر عہدِ رسالت میں عرب اور غیر عرب کے لئے زباندانی کی ضرورت تھی تو اب بھی ہے اگر اس وقت بھی ملکی جنگی قواعد کی ضرورت پڑتی تھی تو اب بھی ویسی ضرورتیں برابر پڑتی رہتی ہیں۔ پس وحی الٰہی کے علاوہ جو باتیں انسانی سعی و کوشش اور فہم و شعور پر آج کل چھوڑی ہوئی ہیں وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں آپ کی سعی و کوشش اور عقل و فہم پر بھی چھوڑی گئی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چنانچہ آنحضور صلعم کے بعد اصول و معانی، صرف و نحو، لغت و بیان کی بڑی بڑی کتابیں اور حفظانِ صحت کی خاطر، جس پر عبادت و تحصیل علم کا انحصار

ہے۔ طبی ذخیرے تیار کئے گئے۔ جن کی ضرورت آئندہ بھی عرب و عجم کے لئے ہمیشہ رہے گی۔ وحی الہٰی کے ساتھ ایسے خادموں کی ضرورت ہونے سے یہ نتیجہ بھی نکال لینا کہ اس وقت یا رسول اللہ کے وقت میں قرآن کریم کے سوا کسی اور وحی کی ضرورت باقی رہا کرتی تھی سرتاپا باطل ہے (کیونکہ یہ سب علوم بلا وحی حاصل ہوئے ہیں)

وحی، وحی کی مخالف نہیں ہوسکتی

حق تعالیٰ کی ایک وحی دوسری وحی کے مطابق اور ایک دوسری کی مؤید، مفسر، معاون تو ضرور ہوسکتی ہے۔ مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ خدا ہی کے ایک حکم کو مخدوم اور دوسرے کو خادم قرار دیا جائے۔ اس سے تو خود خدا ہی مخدوم اور خدا ہی خادم بن جائے گا۔ پس صرف ونحو لغت وبیان وغیرہ خادموں کی موجودگی میں (جو بلا وحی حاصل کر لئے گئے ہیں) دو مخدوم وحیوں، یعنی قرآن وحدیث کا ثبوت بہم پہنچانا، پھر ایک کو مخدوم اور دوسری کو خادم ٹھہرا لینا، پرلے سرے کے تعصب کو ثابت کرتا ہے۔ تمام خادم علوم، انسانوں کی اپنی کوششوں اور کاوشوں پر چھوڑے گئے ہیں جو وحی الہٰی سے علاوہ ہیں۔ پس اگر (بقول بعض اہلِ حدیث) حدیثیں اور روایات، صرف ونحو، لغت وبیان کی طرح خادم قرآن ہیں تو وہ بھی یقیناً "وحی نہیں ہوسکتیں۔

قرآن کو خادم کیوں ٹھہرالیا گیا؟

بڑے ہی افسوس کا مقام ہے کہ ان حضرات نے قرآنِ کریم کو بالکل ہی حدیث کے رنگ میں ڈھالا ہوا ہے۔ اور اسی لئے یہ لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ کے قرآن پر قاضی اور حاکم سمجھتے ہیں۔ بلکہ حدیثوں اور سنتوں کو بھی قرآنِ محفوظ پر آج تک قاضی اور حاکم مانتے چلے آرہے ہیں۔ قرآن مجید کا اپنا مفہوم کچھ اور ہوتا ہے۔ لیکن حدیثوں کو ساتھ ملا کر کچھ اور بنا لیا جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم وعزیز کو احادیث کے پیچھے چلایا جاتا ہے۔ قرآن کریم کو جو مفصّل اور مبین ہے گونگا کہتے ہیں۔ اور حدیثوں کو قرآن کی ایسی تفسیر بتلاتے ہیں جو وحی سے کی گئی ہے۔ اس تفسیر

کو بلا کسی عام اصول یا کائنات کے علوم متعارفہ کے، جن کی موافقت میں وحی نازل کی جاتی ہے۔ تخصیص و استثناء کرنے، بلکہ صریح الفاظ کے برخلاف معنے اور مفہوم کر لینے کا حق بھی دیتے ہیں جو کسی اور مفسر کو نہیں مل سکتا۔ حاصل یہ ہے کہ حدیثوں کو قرآن پر قاضی اور حاکم بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی جاتی۔ مگر تماشا یہ ہے کہ ساتھ ہی اُنہیں خادم بنا کر بھی پیش کیا جاتا ہے۔ شاید خادم کا کام ہی یہ ہوتا ہو کہ وہ آقا کو بالکل اپنے رنگ میں رنگ لے۔ حق تعالیٰ تو رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو قاضی اور حاکم بالکتاب بنا سکھلاتا ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ (۳/۷۹) کسی انسان کو زیبا نہیں کہ اللہ تو اسے کتاب، حکومت اور نبوت عطا فرمائے، پھر وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کے سوا میرے بندے (مطیع و فرمانبردار) بن جاؤ۔ لیکن (وہ تو یہی کہے گا کہ) تم اللہ والے بن جاؤ (یعنی اللہ کے بندے بنو) کیونکہ تم اللہ کی کتاب کی تعلیم دیتے ہو۔ اور پڑھتے پڑھاتے رہتے ہو۔

مگر یہ حضرات بڑی جراءت اور گستاخی کے ساتھ کہدیتے ہیں کہ اَلسُّنَّةُ قَاضِيَةٌ عَلَى الْكِتٰبِ (سنت قرآن پر حاکم ہے) شاید ان حضرات کے نزدیک اس فقرہ میں بِالْكِتٰبِ اور عَلَى الْكِتٰبِ کا ایک ہی مفہوم ہوگا؟

حضرات علمائے اہل حدیث کی طرف سے حدیث کے تفسیر ہی نہیں بلکہ حاکم اور قاضی ہونے کی عموماً یہ مثال پیش کی جاتی ہے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ

(۴/۱۱) اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت فرماتا ہے کہ نرینہ اولاد کو لڑکیوں سے دوگنا حصہ ملے گا۔

علماء فرماتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو اس الٰہی وصیت

کے حکم کے برخلاف دوسرے اہلِ ایمان سے مستثنٰی قرار دے لیا ہے چنانچہ آپ کا ارشاد ہے کہ "ہم انبیاء اس حکم میں داخل نہیں ہم نہ کسی کے وارث ہوتے ہیں نہ کوئی ہمارا وارث ہوتا ہے۔ جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے" ـــــــ حالانکہ دوسری قرآن کی آیتیں تمام انبیاء ورسل کو دیگر صالحین کی طرح خدا کے احکام کی فرمانبردار بتلاتی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم بتلاتا ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۚ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝ (۲۱/۲۶-۲۷)

اور انہوں نے کہا کہ رحمٰن (اللہ) نے بیٹا بنالیا ہے۔ اللہ کی ذات اس بہتان سے پاک ہے۔ (اس کے بھیجے ہوئے رسول، اسکے بیٹے نہیں) بلکہ مکرم ومعظم بندے ہیں۔ وہ بات کرنے میں اس سے سبقت نہیں کرتے اور وہ اسی کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

اور خاص وراثت کے حکم میں بھی رسولوں کو شامل کرتی ہیں۔ (جیسے ۲۷/۱۶ میں آیا ہے وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ سلیمان داؤد کے وارث ہوئے) مگر ان آیتوں کے برخلاف علمائے اہلِ حدیث فرماتے ہیں کہ رسولوں کو ایسی تخصیص یا اِستثناء کا اختیار، قوت اور حق ملا ہوتا ہے کہ وہ جس حکمِ الٰہی سے چاہیں اپنے کو مستثنٰی فرمالیں۔ تعجب ہے۔ کیا رسولوں کی تغیبر اسی شان کی ہوا کرتی ہے۔ گویا یہ تفسیر معنوی اور اصطلاحی نہیں ہوتی بلکہ مغالطہ دینے کے لئے اس کا نام تفسیر رکھ لیا جاتا ہے۔ اب حضرات علماء کرام ہی فرمائیں کہ اگر خدانخواستہ رسول نے ایسا کہا ہو تو کیا حضورؐ نے اس سے کتاب الٰہی کے حکم پر عمل فرمایا یا خود قاضی علی الکتاب بن گئے۔ پناہ بخدا!! ؏

؏ خواجہ صاحب کا اعتراض علماء کرام کے عام تصور کے اوپر ہے کیونکہ وہ حضرات ایک طرف تو مال فئے سے جو کچھ حاصل ہوا سے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتی ملکیت خیال فرماتے ہیں اور پھر اس میں وراثت کا قانون نافذ ہونے کے منکر بھی ہیں۔ حالانکہ وہ پہلی بات ہی غلط ہے بغیر جنگ وجدل کے جو اموال (فئے) حاصل ہوتے تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ مملکت (State) کی ملکیت ہوتے تھے۔ البتہ سربراہ مملکت (Head of the State)

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

حضرت عائشہؓ کی طرف سے تفسیر نبوی کی معاذ اللہ تغلیط

قرآن مجید کا ارشاد ہے۔
لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی
۶/۱۶۴ و ۱۷/۱۵ و ۳۵/۱۸ و ۳۹/۷ و ۵۳/۳۸

کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

لیکن بخاری اور مسلم کہتی ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میت کو اس کے رشتہ داروں کے رونے اور نوحہ کرنے سے عذاب ہوتا ہے" روایات کے مطابق اس تفسیر نبوی کی تردید کرتے ہوئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسے آیت مذکورہ کے خلاف قرار دیا۔

اسی (۶/۱۶۴ والی) آیت کریمہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ

(بقیہ صفحہ گزشتہ) ہونے کی حیثیت سے آپ کی تحویل میں ہوتے تھے۔ اور آپ کی وفات کے بعد جو آپ کا جانشین ہوا اسکی تحویل میں چلے جاتے تھے۔ حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ انبیاء اور رسل مال و دولت چھوڑ جاتے ہیں اور پھر بھی اس میں وراثت جاری نہیں ہوتی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ مال و دولت چھوڑتے ہی نہیں کہ اس میں وراثت جاری ہوسکے وہ تو کتاب اللہ اور ہدایات خداوندی چھوڑ کر جاتے ہیں اور وارث ہونے والے اسی کے وارث ہوتے ہیں۔ چنانچہ بخاری اور نسائی میں حضرت عمرو ابن الحارث خزاعیؓ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے نہ کوئی دینار چھوڑا نہ درہم، نہ کوئی غلام چھوڑا نہ باندی نہ کوئی اور چیز چھوڑی سوائے سفید خچر (البغلۃ البیضاء) کے جس پر آپ سواری فرمایا کرتے تھے اور اپنے ہتھیاروں کے اور اس زمین کے جسے آپ نے مسافروں کے لئے (وقف) صدقہ فرما دیا تھا (بخاری و نسائی) نیز بخاری ہی میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد کوئی ترکہ نہیں چھوڑا سوائے اس کے جو دفتین کے درمیان بشکل قرآن موجود ہے (بحوالہ جمع الفوائد ج ۱ ص ۲۷۳) لہٰذا انبیاء و رسل کے ترکہ میں وراثت جاری نہ ہونیکی وجہ انبیاء کی کوئی خصوصی حیثیت نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ مال و دولت نہ جمع کرتے ہیں، نہ چھوڑ کر جاتے ہیں کہ اسکو ورثہ میں تقسیم کیا جائے وہ تو صرف علم الٰہی چھوڑ کر جاتے ہیں اور ان کے جانشین اسی علم کے وارث ہوتے ہیں حضرت داؤد علیہ السلام کے جانشین اور سربراہ مملکت حضرت سلیمان علیہ السلام ہوئے ان کی وراثت بھی مالی نہیں تھی بلکہ علمی ہی تھی کیونکہ داؤد علیہ السلام نے جو سلطنت چھوڑی تھی وہ ان کی ذاتی ملکیت نہیں تھی بلکہ وہ قوم کی ملکیت تھی اور حضرت داؤدؑ کی تحویل میں تھی (ناشر)

باپ دادوں کے گناہوں کا بدلہ ان کی اولاد سے نہیں لینا چاہیئے مگر حدیث فرماتی ہے کہ گرگٹ (پنجابی کرلہ) کو جہاں دیکھو، قتل کردو۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آگ کو پھونک پھونک کر بھڑکاتا تھا۔ اگر اسی کا نام تفسیر ہے تو ایسی تفسیر سے تو خالی رہنا ہی بہتر ہے۔ جب ایسے دلائل سے جانوروں کے ساتھ کینہ رکھنا سکھایا جاتا ہے تو مسلمانوں کے مختلف فرقے آپس میں جو کچھ ایک دوسرے کے خلاف کر رہے ہیں وہ تو ضرور ہی حق بجانب بن جائیگا۔

افسوس صد افسوس! اس صاحب خلق عظیم رسول اکرمؐ پر ایسے کینہ پروری کے الزام لگائے جاتے ہیں مگر حضورؐ کو اپنی بشری عقل سے کام لینے والا ماننے سے گریز کیا جاتا ہے۔ اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو بشری عقل سے کام لینے والا مانتے تو ایسی باتیں رسول کے ذمہ نہ لگاتے کہ گرگٹ (کرلے) کو تو دیکھتے ہی فوراً مار دینا۔ لیکن اگر کسی کے گھر میں سانپ نکل آئے تو اس کو تین روز تک وارننگ دیتے رہنا کہ اے سانپ اگر تو جن ہے تو چلا جا۔ اور تین دن تک نہ جائے تب مارنا۔ اور تین دن تک اسے حضرت نوح اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے قول وقرار یاد دلانا اور یہ سمجھنا کہ جن، سانپ بن جایا کرتے ہیں۔ شاید کوئی مسلمان جن سانپ بن کر نہ آگیا ہو۔ وہ غلطی سے مارا نہ جائے اور اس طرح ایسے وہموں سے اپنے اہل وعیال کو تین دن تک خطرے میں ڈالے رکھنا، کسی ایسے شخص سے جو بشری عقل سے کام لینے والا ہو۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، مگر ایسی حدیثوں کو کیا کہیں جو یہ سب باتیں آنحضرت فداہ ابی وامی کے ذمہ لگاتی ہیں۔

(بحوالہ مشارق الانوار۔ بخاری ومسلم کی قولی احادیث کا مجموعہ)

حدیث نمبر (۳۲۶)

فہم نبوی بھی بشری فہم تھا حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم چونکہ ایک بشر تھے اس لئے آپ کا فہم بشری ہی تھا۔ نبی اور رسول ہونے کی وجہ سے آپ کا فہم مافوق البشر نہیں تھا۔ حق تعالےٰ کا ارشاد ہے۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَ لَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ

غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝ وَاِذَا جَآءَهُمْ
اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۝ وَلَوْ رَدُّوْهُ
اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ
يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ۝ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ
لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (۴/ ۸۲-۸۳) یعنی پھر کیا یہ لوگ قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے اور اگر یہ قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت اختلافات پاتے اور جب ان کے پاس کوئی بات امن کی یا خوف کی آتی ہے تو وہ اسے پھیلا دیتے ہیں۔ اور اگر یہ اسے رسول کی طرف اور اپنے میں سے (مقرر کردہ) حکام وقت کی طرف لوٹا دیتے تو وہ ان میں سے جو استنباط کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یقیناً اسے جان لیتے اور اگر تم پر اللہ کا فضل (یعنی قرآن) اور اس کی رحمت (یعنی تدبر فی القرآن اور استنباط نہ ہوتی) تو تم ضرور شیطان کے پیچھے لگ لئے ہوتے مگر تم میں سے تھوڑے سے۔

وحی اور عقل دو نعمتیں

ان مبارک آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے پاس دو نعمتیں ہیں ایک خود وحی الٰہی یعنی قرآن مجید ہے۔ دوم عقلی ذرائع۔ عقلی ذرائع بھی دو قسم کے بتلائے ہیں ایک ہمارا خود قرآن میں تدبر اور غور وفکر کرنا۔ دوم خارج از قرآن باتوں میں استنباط کرنے والوں سے سمجھ لینا۔ وحی الٰہی کو فضل الٰہی فرمایا ہے اور عقلی ذرائع کو رحمتِ الٰہی بتلایا ہے، یہ دونوں نعمتیں بڑی ضروری اور اہم ہیں اور ان دونوں میں ہی ہمارا تمام دین آجاتا ہے لیکن علمائے اہل حدیث کا کہنا ہے کہ حضور کی ہر بات وحی تھی یعنی اللہ تعالے ہر وقتی امر تک کا فیصلہ آپ پر بذریعہ وحی نازل فرمایا کرتا تھا۔ اہل حدیث کے اس عقیدے کے مطابق بات یہ بنتی ہے کہ یا تو معاذ اللہ معاذ اللہ آپ کو عقل دی ہی نہیں گئی تھی اور یا آپ اسے استعمال نہیں فرما سکتے تھے۔ حالانکہ آیت زیر نظر میں یہاں امن اور خوف کی باتوں کو رسول کی طرف اور اولی الامر کی طرف موڑنے کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ

کہ ان میں سے جو لوگ استنباط کی صلاحیت رکھتے تھے وہ اس بات کی حقیقت کو معلوم کرلیں۔ اب اگر رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم استنباط کر ہی نہیں سکتے تھے۔ تو استنباط کی خاطر رسول اللہ کی طرف ان کا علیحدہ ذکر فرما کر اس امر کے موڑنے کا حکم کیوں صادر فرمایا گیا۔ اس طرز بیان سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف صاحبِ عقل وفہم تھے بلکہ عقل وفہم کے ساتھ آپ میں استنباط کی اور بات کی تہ تک پہنچ جانے کی پوری پوری صلاحیت تھی اور آپ فی الواقع استنباط کیا بھی کرتے تھے اور یہ ایسا ہی استنباط تھا جیسا دوسرے اولی الامر میں سے بہت سے کر سکتے تھے۔ پھر آیتِ کریمہ میں رسول اور اولی الامر کے استنباط کرنے کا نتیجہ بھی ایک ہی بتلایا ہے۔ یعنی وہ اس بات کی حقیقت کو جان لیتے تھے اور بات کی تہ تک پہنچ جاتے تھے۔

آنحضرت گمان بھی کرتے تھے

پھر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم دوقتی امور میں، دوسرے انسانوں کی طرح بشری گمان بھی کیا کرتے تھے۔ حق تعالے نے یہودیوں کے متعلق ارشاد فرمایا۔

تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى ۔ (۵۹/۱۴) آپ سمجھتے ہیں کہ وہ متحد و متفق ہیں۔ حالانکہ ان کے دل (ایک دوسرے سے) پھٹے ہوئے ہیں۔

وغیرہ وغیرہ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضور کا فہم بشری فہم تھا کوئی مافوق البشر فہم نہیں تھا۔ جب ہی تو بات کو سمجھنے میں غلطی ہو جاتی تھی کہ یہودیوں کے دل حقیقت میں تو ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں۔ لیکن آپ انہیں متحد الخیال سمجھ رہے تھے ـــــ حضورؐ کا طریقۂ تحقیق بھی دوسرے بشروں کی طرح ہی ہوا کرتا تھا۔ آپ سچے حاجت مند فقیروں کو جو لوگوں سے لپٹ لپٹ کر نہیں مانگتے تھے ان کے چہروں سے عام انسانوں ہی کی طرح پہچان لیا کرتے تھے۔

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ

بِسِیْمٰھُمْ ج لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ط (۲/۲۷۳)

ناواقف لوگ اُنہیں سوال سے بچنے کیوجہ سے مالدار سمجھ بیٹھتے ہیں۔
لیکن ان کے چہروں کے نشانات سے تم اُنہیں پہچان لوگے۔ وہ لوگوں سے
لپٹ لپٹ کر نہیں مانگتے۔

آپ منافقوں کو ان کے لَحْنُ الْقَوْلِ رچا چا کر باتیں کرنے کے انداز سے شناخت فرمایا کرتے تھے۔

وَلَوْ نَشَاءُ لَاَرَیْنٰکَھُمْ فَلَعَرَفْتَھُمْ بِسِیْمٰھُمْ ط وَلَتَعْرِفَنَّھُمْ
فِیْ لَحْنِ الْقَوْلِ ط وَاللّٰہُ یَعْلَمُ اَعْمَالَکُمْ ہ (۴۷/۳۰)

اور اگر ہم چاہتے تو ہم آپ کو وہ لوگ دکھا دیتے اور (اے پیغمبر!) آپ
انہیں ان کے چہروں کے نشانات سے پہچان لیتے اور آپ انہیں
ان کے باتیں کرنے کے انداز سے بھی ضرور پہچان لیں گے۔ اور (اے منافقو!)
اللہ تمہارے اعمال کو اچھی طرح جانتا ہے۔

یہ سب بشری عقل ہی کے قاعدے ہیں۔ ان قاعدوں سے سارے انسان وقت پڑنے پر کام لیتے ہیں اور اسی لئے ان میں غلطی بھی ہو جاتی تھی۔ آپ بہت عرصہ تک اہلِ مدینہ کے تمام منافقوں کو بھی نہیں جانتے تھے جیسا کہ سورۂ توبہ میں ارشاد ہوا ہے۔

لَا تَعْلَمُھُمْ نَحْنُ نَعْلَمُھُمْ (۹/۱۰۱) اے پیغمبر!
آپ انہیں نہیں جانتے، مگر ہم اُنہیں خوب جانتے ہیں۔

جو عورتیں کفار کے دینی جبر کے سبب ہجرت کر کے آتی تھیں۔ اُن کے دلی ایمان کو تو اللہ ہی جانتا تھا لیکن ان کے متعلق جو تحقیقات درکار تھیں۔ وہ حضور کے سامنے انسانی امتحان سے ہی کرنے کا حکم تھا۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَکُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُھٰجِرٰتٍ
فَامْتَحِنُوْھُنَّ ط اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِھِنَّ ج فَاِنْ عَلِمْتُمُوْھُنَّ
مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْھُنَّ اِلَی الْکُفَّارِ ط (۶۰/۱۰)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جب تمہارے پاس ہجرت کر کے کچھ مؤمن عورتیں آجائیں تو تم ان کی جانچ پڑتال کر لیا کرو۔ ان کے دلی ایمان کو تو اللہ (ہی بہتر) جانتا ہے۔ تو اگر تم انہیں (ظاہر طور پر) واقعی مؤمن عورتیں سمجھو تو انہیں کفار کی طرف واپس نہ کرو۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم بھی اپنی بشری عقل اور لوگوں کے انداز سے جھوٹوں سچّوں کو پرکھا کرتے تھے۔ وحی خفی نہیں بتایا کرتی تھی کہ فلاں سچا ہے اور فلاں جھوٹا۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (۹/۴۳) اللہ آپ کو معاف فرمائے، آپ نے انہیں (غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ جانے کی) کیوں اجازت دے دی۔ آپ کو معلوم تو ہو جاتا کہ کون اُن میں سے سچ بول رہے ہیں اور آپ (اُن میں سے) جھوٹوں کو بھی جان لیتے۔

پھر آپ کو بعض اوقات صرف قسموں کے ذریعہ مقدموں کا فیصلہ کرنا پڑتا تھا۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (۲۴/۴-۹) —

اور جو پاکدامن عورتوں کو تہمت لگائیں پھر چار گواہ (تہمت کے ثبوت میں)

پیش نہ کر سکیں تو انہیں اسّی کوڑے مارو اور کبھی ان کی شہادت قبول نہ کرو۔ یہ لوگ فاسق ہیں بجز ان لوگوں کے جو اس کے بعد توبہ کریں اور اصلاح احوال کر لیں۔ تو یقیناً حق تعالیٰ بخشنے والے رحم کرنیوالے ہیں اور جو اپنی بیویوں پر تہمت دھرتے ہیں اور ان کے پاس بھی بجز اپنے کوئی گواہ نہیں ہیں تو انہیں خود چار شہادتیں ادا کرنی چاہئیں کہ بخدا وہ سچے ہیں اور پانچویں شہادت یہ کہ ان پر خدا کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹے ہوں اور عورت بھی اپنے سے سزا کو شہادتوں سے ہٹا سکتی ہے وہ چار شہادتیں اس بات کی ادا کرے کہ بخدا اس کا شوہر (تہمت لگانے میں) جھوٹا ہے اور پانچویں شہادت یہ ادا کرے کہ اگر وہ سچا ہو تو مجھ پر خدا کا غضب نازل ہو۔

اور ظاہر ہے کہ جو فیصلے حق تعالیٰ نے قسموں پر کرنے سکھائے ہیں۔ رسولؐ انہیں ہرگز ہرگز وحی سے نہیں کر سکتے تھے۔ پس حضورؐ کے عقل و فہم کا بشری عقل و فہم ہی ہونا سورج کی طرح روشن ہے۔

جس شخص کو مقدمات کا فیصلہ کرنے میں قسموں پر چھوڑا جاتا ہے اس کی تمام غلطیوں کو نکال دینا، خدا نے اپنے ذمہ نہیں لیا تھا۔ ورنہ مقدمہ کو قسموں پر چھوڑنے کا یہ ادنیٰ طریقہ نہ سکھایا جاتا۔ آپ کے حضور میں (مقدمہ کے) دونوں فریق قسمیں کھا کر سزا سے بچ جایا کرتے تھے اور معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ ان دونوں سے کون سچا ہے۔ حالانکہ دونوں میں سے ایک کا جھوٹا ہونا یقینی تھا۔

حوالہ کے لئے سورہ نور کی آیات کریمہ ا $\frac{۲۴}{۹ تا ۶}$) دوبارہ ملاحظہ فرمائیں جن میں بتلایا گیا ہے کہ اگر کوئی شوہر اپنی بیوی پر بدکاری کا الزام لگائے اور اس کے پاس چار گواہ نہ ہوں تو ارشاد ہوتا ہے کہ وہ عدالت میں چار مرتبہ قسم اٹھا کر یہ کہے کہ وہ سچا ہے اور پانچویں مرتبہ قسم اٹھا کر یہ کہے کہ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس پر خدا کی لعنت ہو۔ اس سے آگے ارشاد ہوتا ہے کہ اب وہ ملزمہ جس پر بدکاری کی حد کے طور پر سو کوڑے کی سزا لازم آتی ہے وہ اس سزا سے اس

طرح بچ سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ قسم اٹھاکر یہ کہے کہ اس کا شوہر جھوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ قسم اٹھاکر یہ کہے کہ اگر وہ سچا اور میں جھوٹی ہوں تو مجھ پر خدا کا غضب نازل ہو۔ اب ظاہر ہے کہ فریقین میں سے دونوں تو سچے ہو نہیں سکتے یا تو شوہر نے غلط الزام لگایا ہے اور وہ اسّی کوڑوں کی سزا کا مستحق ہے اور اگر وہ سچا ہے تو بیوی پر سو کوڑوں کی سزا لازم آتی ہے اور وہ غلط قسمیں اٹھاکر سزا سے بچ گئی ہے۔ اب یہ فیصلہ جس میں لازمی طور پر فریقین میں سے کوئی ایک ضرور جھوٹا ہے، دربار رسالت سے صادر ہو رہا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ دربارِ رسالت کے ایسے فیصلے رسولی فہم اور استنباط کے ذریعہ ہوا کرتے تھے یعنی وہ ہرگز ہرگز کسی نام نہاد وحی خفی کے ذریعہ نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ ایسے مبہم اور اور غیر یقینی فیصلوں کو وحی الٰہی کی طرف منسوب کرنا حق تعالیٰ کو جاہل مطلق قرار دینا ہے کہ وہ بھی نہیں جانتا تھا کہ فریقین میں سے کون جھوٹا ہے اور کون سچا ہے اور حق تعالیٰ نے معاذ اللہ معاذ اللہ وحی خفی کے ذریعہ غیر یقینی فیصلہ دے دیا ہے۔ فلہٰذا رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال مبارکہ وحی یا نام نہاد وحی خفی ہرگز ہرگز نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نہ غیب داں تھے نہ آپ کے اقوال و افعال وحی کے ذریعہ سرزد ہوا کرتے تھے۔ حق تعالیٰ نے میاں بیوی کے باہمی جھگڑوں کو جن میں گواہ موجود نہ ہوں معاشرے کا امن و امان قائم رکھنے کے لئے فریقین سے قسمیں اٹھواکر ختم کر دینے کی ہدایت فرمائی ہے۔ باقی رہا فریقین میں سے جھوٹی قسمیں اٹھانے والے فریق کا معاملہ تو وہ قیامت میں حق تعالیٰ کی عدالت عالیہ میں جھوٹی قسموں کی سزا سے ہرگز نہیں بچ سکیگا۔

حضور اکرم کی تمام اجتہادی غلطیاں قرآن نے نہیں نکالیں

یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ فریقین میں سے (لعان کے واقعہ میں) ایک فریق تو یقیناً جھوٹا تھا اور سزا کا مستحق بھی تھا۔ لیکن عدالت نبوی سے دونوں فریقوں کو براءت کا پروانہ مل گیا۔ اور دونوں سزا سے بچ گئے۔ ان میں سے ایک فریق جو یقیناً جھوٹا تھا۔ اس کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے براءت کا

پروانہ مل جانا اور سزا سے اس کا بچ جانا یقیناً غلط تھا۔ اور وحی جلی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس غلط فیصلہ کی تصحیح آجتک بھی نہیں فرمائی۔ لہٰذا یہ دعویٰ بھی غلط ہوگیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجتہادی غلطی تو ہو جانی ممکن تھی مگر وحی جلی سے اس غلطی کو فوراً درست کر دیا جاتا تھا۔ اور یہ کہ جب کسی فیصلہ کے خلاف کوئی تنبیہ نازل نہیں ہوئی تو ثابت ہوگیا کہ وحی الٰہی نے اس فیصلہ کو مسلّم رکھا ہے اس لئے وہ وحی کے حکم میں ہے۔

بشریت رسول ہر رسول بشر ہی ہوتا ہے (۱۴/۱۱، ۱۸/۱۱۰، ۱۷/۹۴، ۴۱/۹، ۶/۹، ۱۴/۱۰، ۲۱/۳، ۲۳/۲۴، ۲۳/۳۳، ۵۶/۱۸۶، ۲۶/۱۱۵، ۶۴/۶، ۱۱/۲۷، ۱۷/۹۴، ۲۳/۳۴) تمام آیتیں ہم نے تفصیلی طور پر شروع میں بیان کر دی ہیں۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم بھی بشر ہی تھے۔ سوال یہ ہے کہ حضور اکرمؐ کی فطرت بعینہ وہی فطرت تھی جو عام انسانوں کی ہوا کرتی ہے یا اس سے کچھ مختلف تھی یعنی رسول اللہ کی فطرت، قطعاً فطرت الناس تھی۔ یا وہ فطرت الناس سے جدا فطرت تھی۔ کیا حضورؐ میں کوئی خاص قوت یا سمجھ یا باریک بینی ایسی بھی تھی جو قیامت تک دوسرے بشروں (انسانوں) کو نہیں مل سکتی؟

یہ سوال ہمیں یہاں اس لئے اٹھانا پڑا کہ عام لوگوں کے اذہان میں یہ مسئلہ واضح نہیں ہے۔ اکثر محراب و منبر سے اس قسم کی آوازیں آپ نے بھی سنی ہوں گی کہ یہ لیجئے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر کہتے ہیں اور قرآن کی آیت سے ثبوت پیش کرتے ہیں کہ

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ (۱۸/۱۱۰، ۴۱/۶)

اے پیغمبر آپ کہہ دیجئے کہ تمہاری ہی طرح کا ایک آدمی ہوں، مجھ پر وحی آتی ہے۔

اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کو تو دیکھتے ہیں مگر يُوْحٰٓى اِلَيَّ کو بھول جاتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بشر تو ضرور ہیں مگر آپ ایسے بشر ہیں جس پر وحی آتی ہے ایسا بشر اب اور کوئی نہیں ہو سکتا جس پر وحی بھی آتی ہو۔ اسی ٹکڑے میں آپ کی

خصوصیت کبریٰ بیان کر دی گئی ہے۔ آپ ہماری طرح کے بشر نہیں ہیں۔ ہم پر توکسی پر وحی نہیں آسکتی وغیرہ ـــــ اور یہ تمثیل دیجاتی ہے کہ

"صاحبو! جھانواں بھی پتھر ہوتا ہے۔ اور سنگریزہ بھی پتھر ہوتا ہے لیکن ہیرا بھی تو پتھر ہی ہوتا ہے یاقوت اور زمرد بھی تو پتھر ہی ہوتا ہے۔ کیا سارے پتھر برابر ہوتے ہیں؟ ہیرا، یاقوت اور زمرد باوجود پتھر ہونے کے پتھر کے ایک پورے پہاڑ پر بھاری ہوتا ہے۔ جھانویں اور سنگریزہ کو پھینک دیا جاتا ہے اور ہیرے یاقوت اور زمرد کو شہنشاہوں کے تاج میں جگہ دی جاتی ہے۔ کہنے کو تو سب پتھر ہیں مگر ایک پتھر بے قیمت ہے اور ایک پتھر بیش قیمت ہے۔

تو صاحبو! آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ایسے ہی بشر ہیں جیسے ہیرا، یاقوت اور زمرد بھی پتھر ہی ہوتا ہے مگر پتھر پتھر میں فرق ہے ایسے ہی بشر بشر میں فرق ہے"۔

لیکن ایسا کہنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ اسی آیت میں مِثْلُکُمْ کا لفظ بھی تو رکھا ہوا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم صرف اپنی بشریت ہی کا اعلان نہیں فرما رہے ہیں

بلکہ ایسی بشریت کا اعلان فرما رہے ہیں جو عام انسانوں جیسی ہے۔ کوئی مخصوص اور ممتاز بشریت نہیں ہے لہٰذا یہاں جھانویں اور ہیرے کی مثال نہیں دی جاسکتی۔

اس کے علاوہ اس پر بھی غور فرمائیے کہ اگر آپ کی بشریت کچھ مخصوص اور ممتاز بشریت تھی جو دوسرے لوگوں کو حاصل نہیں تھی تو آپ کا یہ فرمانا کہ "میں تمہارے جیسا بشر ہوں اگر میں نے قرآن مجید کو خود بنا لیا (یہ اللہ کا نازل فرمودہ نہیں ہے) تو تم بھی اس کے مثل بنا سکتے ہو" بالکل ہی غلط ہو جاتا ہے۔

یہ بات حضورؐ نے اپنے قبل از نبوت زمانہ کے متعلق نہیں فرمائی، بلکہ بعد از نبوت بحکم خدا مکہ میں بھی فرماتے رہے اور مدینہ میں بھی یہی ارشاد فرماتے

رہے۔ اگر آپ کی فطرت، عام فطرت انسانی سے الگ تھی۔ عام لوگوں سے ممتاز و مخصوص تھی یا آپ کی سمجھ بوجھ فوق البشر تھی تو لوگ کہہ سکتے تھے کہ آپ نے خدا سے کلام سننے کے بجائے قرآن بنانے میں اپنی خاص قوتوں سے کام لیا ہے۔ جب ہم میں وہ خاص قوتیں آ ہی نہیں سکتیں تو ہم سے قرآن کی مثل مانگنا فضول ہے۔ لہٰذا یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعینہٖ وہی بشری فطرت تھی جس پر حق تعالےٰ نے تمام آدمیوں کو پیدا کیا ہے اور آپ کی وہی عقل تھی جو دوسرے بشروں کو بھی مل سکتی ہے۔

نبوّت اکتسابی چیز نہیں

یاد رہے کہ نبوت کوئی اکتسابی چیز نہیں ہے جو لیاقتوں اور مناسبتوں کے مطابق حاصل ہو سکے اور دنیا میں اگرچہ نبی کی ضرورت نہ ہو پھر بھی ان مناسبتوں اور لیاقتوں والے فرد کو ضرور ہی نبی بنایا جائے پھر وہ مناسبتیں اور لیاقتیں نبوّت کیساتھ کوئی خاص تعلق نہیں رکھا کرتیں کہ جن سے نبی بنائے جانے والے کو پہلے ہی سے اپنے نبی یا رسول بننے کی اُمید یا توقع پیدا ہو جایا کرے۔ قرآن مجید کے ارشاد

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۚ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۴۲/۵۲) اور (اے پیغمبر!) اسی طرح ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے کہ اپنے حکم سے ایک روح بھیجی۔ آپ کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور نہ یہ معلوم تھا کہ ایمان کیا ہوتا ہے لیکن ہم نے اسے (یعنی وحی کو) ایک نور بنا دیا ہے جس کے ذریعہ سے ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں ہدایت دے دیتے ہیں (وہی نور ہم نے آپ کو عطا کر دیا ہے) اور یقیناً آپ صراط مستقیم کی طرف (وحی ہی کیوجہ سے) ہدایت دے دیتے ہیں۔

کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی اُمید نہیں تھی کہ مجھ پر کوئی کتاب اترے گی۔ صرف الٰہی رحمت و موہبت نے ہی آپ کا انتخاب فرمالیا اور آپ کو چن لیا تھا۔ قرآن مجید کے اترنے کے بعد حضورؐ کو بھی قرآن مجید ہی سے ہدایت ہوئی تھی اور دوسرے لوگوں کو بھی قرآن مجید ہی سے ہدایت ملتی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اگرچہ موجود اشخاص میں سے زیادہ لائق اور مناسب شخص کو ہی رسول بنایا جاتا تھا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر لائق اور مناسب شخص کو زمانہ کی ضرورت کے بغیر ہی خواہ مخواہ رسول بنا دیا جائے۔۔۔ تو جب ▪ مناسبتیں اور لیاقتیں کسی کو خود ہی رسول نہیں بنا سکتیں تو انہیں رسولوں کے ساتھ خاص کر دینے کے کیا معنے؟ بالضرور وہ لیاقتیں اور مناسبتیں دوسروں میں بھی ہو سکتی ہیں۔ رسولوں کے ساتھ ان کی کوئی مخصوصیت نہیں (لیکن یاد رہے کہ ہر شخص میں ان خواص کا موجود ہونا ضروری نہیں) جس مریض کو دوسروں کا فکر تو علیحدہ رہا۔ اپنے علاج کا بھی خیال نہ ہو۔ اس کو علاج کی وحی کر دینا درست نہیں ہوگا۔ رسول ان لوگوں سے چنے جاتے تھے۔ جن کے دل میں انسانوں کے لئے کمال درد اور ان کی مصیبتوں اور بیماریوں اور مرضوں کا بڑا فکر ہو۔ وہ خود بھی بڑی حیرت اور سراسیمگی میں ہوتے ہیں۔ مگر اس حیرت و سراسیمگی میں مگن نہیں ہوتے بلکہ اس سے نکلنے کے لئے بیتاب اور بے قرار ہوتے ہیں۔ یہ حالت کسی دوسرے میں بھی پیدا ہو سکتی تھی مگر فی الواقعہ جسقدر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں تھی۔ کسی اور میں نہیں تھی۔ دُنیا میں کھلی گمراہی اور ضلال مبین کے سبب حق تعالیٰ کی حکمت و رحمت رسول بھیجنا چاہتی تھی۔ خدا نے ایک اعلیٰ سائل کو چن لیا اور فرمایا کہ تو بھی سائل کو مت جھڑکنا۔ وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ (۹۳/۱۰)

دوسری طرف حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ۔ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ

فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ۝ (۵۷/۴۹-۵۱) - انہیں کیا ہوگیا ہے کہ وہ اس تذکرہ یعنی قرآن مجید سے اعراض اور روگردانی کرتے ہیں۔ گویا کہ وہ گدھے ہیں جو بدک کر کسی شیر سے بھاگ کھڑے ہوتے ہوں۔

ان مبارک آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حق سے اعراض کرنے والوں اور آخرت سے بے خوف ہونے والوں کو وحی نہیں دی جاسکتی۔ وہ تو اس وحی کو لے کر اسکی بے قدری کریں گے۔ دوسروں کو کیا پہنچائیں گے؟ لہٰذا رسول اور نبی ان لوگوں سے چنے جاتے ہیں جو اعلیٰ درد، طلب اور اضطراب رکھتے ہوں۔ لیکن اس درد، طلب اور اضطراب میں فوق البشریت نہیں ہوتی بلکہ وہ محض وہی ہوتے ہیں۔ جو عام بشر حاصل کر سکتے ہیں۔ کفار کہتے تھے کہ خود ہم کو رسول کی طرح وحی کیوں نہیں ملتی۔ ہم پر بھی وحی آنی چاہیئے۔ حق تعالیٰ ان کے جواب میں فرماتے ہیں۔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (۶/۱۲۴) اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کہاں رکھے۔

سورۂ مدثر ہی میں ہے:۔

بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ۝ كَلَّا ؕ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝ (۷۵/۵۲-۵۳) بلکہ ان میں سے ہر آدمی یہی چاہتا ہے کہ اسے بھی (خدا کی طرف سے وحی کے) کھلے ہوئے صحیفے دیدیئے جائیں۔ (یہ کیسے ہوسکتا ہے) ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ تو آخرت سے بھی نہیں ڈرتے۔

رسالت کی پہلی بنیادی شرط تو خوف آخرت ہے۔ ان میں وہی نہیں ہے۔ ان پر وحی کیسے بھیجی جاسکتی ہے۔ ان پر صحیفے کیسے نازل ہوسکتے ہیں؟ مطلب یہ ہے کہ رسالت کے لئے لائق اور مناسب شخص چنا جاتا ہے۔ لیکن تم ایسے نہیں ہو۔ تم میں وہ صلاحیتیں ہی نہیں ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ رسولوں میں کوئی فوق البشر فطرت ہوتی ہے۔ وہ فوق البشر قوتوں کے مالک ہوتے ہیں۔

غیب داں اور بے اختلاف صرف حق تعالیٰ کی ذات ہے

اہل حدیث حضرات تسلیم فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم عالم الغیب

نہیں تھے۔ ایسا کہنے سے ان کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہوتا کہ آپ کی توہین اور ہتک کریں بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ قرآنی اسرار اور پیشگوئیاں آنحضرت کا کام نہیں ہے بلکہ یہ اس ذاتِ واحد کا کام ہے جس کی صفت یَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲۵/۶) ہے۔ اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یَعْلَمُ السِّرَّ والی صفت و اختیار اور قوت ملی ہوئی تھی۔ تو اس طرح قرآن مجید اسی قوت و اختیار کا نتیجہ کہلائے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے خود اپنے بنائے ہوئے شریک قرار پائیں گے (العیاذ باللہ)

اسی طرح میری گذارش ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام ارشادات چونکہ وحی نہیں تھے۔ اس لئے ان میں اختلافات ہو سکتے تھے۔ وہ بے اختلاف نہیں تھے۔ کیونکہ اگر آپ کے تمام اقوال بے اختلاف ہو سکتے تھے تو تیئس (۲۳) سالہ حیاتِ طیبہ کے تمام بے اختلاف اقوال ایک کتاب میں جمع بھی کئے جا سکتے تھے اور یوں غیر خدا کی طرف سے ایک لمبی چوڑی بے اختلاف کتاب تیار ہو جانی ممکن تھی لیکن حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا ۝ (۴/۸۲) تو کیا وہ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے۔ اگر وہ خدا کے سوا کسی دوسرے کے پاس سے ہوتا تو وہ ضرور اس میں بہت اختلاف پاتے۔

یعنی اگر یہ قرآن غیر خدا کی طرف سے ہوتا اور جیسا کہ کفار کہتے ہیں اسے خود رسول نے تیار کیا ہوتا تو اس میں بڑے اختلافات ہوتے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام ارشادات کو بے اختلاف ثابت نہ کرنا خدانخواستہ اس لئے نہیں ہے کہ معاذ اللہ آنحضرت کی کوئی ہتک اور توہین کی جائے بلکہ دکھانا یہ مقصود ہے کہ ایسی اختلافی باتوں والا بشر رسول ایسے بے اختلاف قرآن کو خود نہیں بنا سکتا تھا

رسول اللہ بلحاظ بشریت بڑے نیک لیکن لوازم بشریت سے مبرا نہیں تھے

حدیث کے مطابق، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا

ارشاد ہے کہ انبیاء بھی اللہ کی نعمتوں کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ اور اُن نعمتوں کے لائق شکر بجا نہیں لا سکتے۔ ایک سانس میں دو نعمتیں ہوتی ہیں۔ (سانس کا اندر جا کر اندر ہی نہ رک جانا اور باہر آ کر مطلقاً ہی خارج نہ ہو جانا) بندے کے لئے بجز عذرِ تقصیر کے کوئی چارہ نہیں۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ جن الفاظ کا زبان پر لانا عام داناؤں کے لئے بھی مناسب نہیں اور جن کاموں کا کرنا عام نیکوں کے خیال میں بھی نہیں آ سکتا رسولوں کے لئے کبھی زیبا نہیں ہو سکتے اور جو باتیں شریف گھرانوں کے لئے فی الحقیقت موجبِ عار ہیں رسول کے گھر میں برضائے رسول ہرگز واقع نہیں ہو سکتیں حاصل یہ ہے کہ رسولؐ، ضبطِ نفس، شرافت اور ایثار میں گرے ہوئے نہیں ہوتے۔ مگر بخاری کی کئی ایک حدیثیں ایسی ہیں کہ جو کچھ ان میں مذکور ہے ان کے لکھنے سے شرم آتی ہے (ناظرین بخاری شریف کا باب الغسل اور باب الحیض نمونۃً خود ملاحظہ فرمائیں)

رسول عمداً حق تعالے کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ شریروں اور بدمعاشوں والے کام ان سے ہرگز سرزد نہیں ہو سکتے۔ وہ یہ نہیں کر سکتے کہ کسی کی عورت پر عاشق ہو جائیں اسے اپنے گھر میں ڈال لیں۔ اور اس کے خاوند کو تابوتِ سکینہ کے پاس سب سے آگے کھڑا کر کے قتل کرا دیں (جیسا کہ روایات میں حضرت داؤدؑ پر الزام لگایا جاتا ہے) ایسا کر کے وہ رسول نہیں رہ سکتے۔ رسولوں کو اگر اپنی ادنیٰ خطا کا بھی علم ہو جاتا تو وہ اس پر نادم ہوتے اور خدا سے اس کی بخشش طلب کرتے تھے۔ رسول اپنی غلطیوں کا اقرار کرتے

رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (۲۰/۱۱۴) اے میرے پروردگار میرے علم میں اضافہ فرما۔ اور

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (۱/۵)۔ مجھے سیدھے راستے کی ہدایت فرما

کی دُعا مانگتے رہتے۔ ترقیات (سائنس) اور اصلاحوں کے کبھی مخالف نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے کبھی اپنے نفس کی پیروی نہیں فرمائی۔ ان کا واحد مقصود صرف

خدا ہوتا۔ انہیں علم کا کمال شوق ہوتا۔ وہ تو کفار سے بھی کہتے تھے۔

هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا (۶/۱۴۸) تمہارے پاس علم کی کوئی بات ہو تو اسے ہمارے لئے باہر نکالو۔

یعنی اسے ہمارے سامنے پیش کرو ۔ ۔ ۔ ۔ مختصر یہ کہ رسول بشریت کے لحاظ سے بڑے ہی نیک تھے مگر لوازم بشریت سے عاری نہیں ہو سکتے۔

وحی کی ضرورتوں کیلئے قرآن کافی ہے

قرآن مجید نے ہماری وحی کی ضرورتوں کو پورا کر دیا ہے۔ جو باتیں وحی سے بتلانی ضروری تھیں۔ وہ سب قرآن مجید ہی میں آگئی ہیں۔ اس کے سوا ہمیں کسی اور وحی کی تلاش کی کوئی ضرورت باقی نہیں رکھی گئی۔ ہاں قرآن مجید نے ہمارے دین کا بہت ساحصہ عقلی کوششوں پر بھی چھوڑا ہے۔ ہم دوسروں کی عقلوں سے بھی مدد لے سکتے ہیں۔ جب بات یہ ہے تو کیا حدیثوں کے ہی احسن واہدی اور معقول حصہ کو ہم چھوڑ سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو ہم سر اور آنکھوں پر جگہ دیں گے۔ دُنیا کے تمام عقلاء کی باتوں پر آنحضرت کی باتیں بھاری ہیں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ ہم اُنہیں عقلی طور پر ہی لیتے ہیں نہ کہ وحی کے طور پر۔ ہم آنکھیں کھول کر علیٰ بصیرۃ چلتے ہیں۔ آنکھیں بند کر کے نہیں۔ قرآن مجید نے ہمیں اسی لائن پہ چلایا ہے۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی راستہ پر چلتے تھے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (۱۲/۱۰۸)

اے پیغمبر! کہدیجئے۔ یہی میرا راستہ ہے کہ میں اللہ کی طرف بصیرت کے اوپر لوگوں کو بلاتا ہوں (آنکھیں بند کر کے نہیں) اور میرے متبعین کی روش بھی یہی ہے۔ اور اللہ کی ذات پاک ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خداداد عقل و فہم سے کام لیتے تھے آپ نے

عقل کو جواب نہیں دیا ہوا تھا۔

صحیح بخاری اور مسلم میں ہے کہ ضبّ یعنی سوسمار (گوہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دسترخوان پر پیش کی گئی تو آپ نے فرمایا "لَستُ بِآکِلِہٖ وَلَا مُحَرِّمِہٖ" یعنی میں اسے کھاتا بھی نہیں اور اسے حرام بھی نہیں کہتا۔ ذرا علمائے اہل حدیث بتلائیں کہ بقول حدیث سوسمار (گوہ) حلال ہوئی یا حرام؟ ظنی باتوں میں ایسا ہی کہنا ٹھیک ہے کہ ہم اسے کھاتے بھی نہیں اور حرام بھی نہیں کہہ سکتے اب بتایئے کہ کیا یہ حدیث وحی ہو سکتی ہے؟

عقل رسولؐ پر سوقیانہ حملہ

لیکن صحیح مسلم میں ضبّ (گوہ) کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں نہیں کھایا تھا اس کی جو وجہ بتائی گئی ہے وہ یقیناً آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی عقل و فہم پر سوقیانہ حملہ ہی کہا جائے گا۔ صحیح مسلم میں جو وجہ بتائی گئی ہے۔ وہ وحی تو کیا ہوتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشری عقل کے بھی لائق نہیں۔ حسب حدیث صحیح مسلم حضور فرماتے ہیں کہ "بنی اسرائیل کے ایک قبیلہ پر حق تعالےٰ نے غضب نازل کر کے انہیں مسخ کر دیا تھا۔ یعنی ان کی شکل بدل کر دوابّ (جانور) بنا دیا تھا۔ پس مجھے معلوم نہیں کہ گوہ شاید انہی میں سے ہو سو نہ میں اسے کھاتا ہوں اور نہ اس سے منع کرتا ہوں"۔ افسوس صد افسوس! حضرات اہل حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر توہم پرست تو بنا دیتے ہیں۔ مگر آپ کے لئے بشری عقل کو تسلیم کرنے کے روادار نہیں۔ (یعنی آپ کے ہر قول و فعل کو وحی قرار دیکر آپ کی بشری عقل سے انکار کرتے ہیں)۔ ..

.. .. لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہر مسئلہ میں شک و شبہ خود رسول اکرمؐ نے پیدا کر دیا تھا۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی نے مجبور کیا تھا کہ جب آپ سوسمار (گوہ) کو حرام نہیں کہہ سکتے تو کھا کر کیوں نہیں دکھاتے؟ آپ کو تو ہر بات میں نمونہ بننا چاہیئے۔ پھر آپ سوسمار کے معاملہ میں کیوں شک میں پڑے ہوئے ہیں؟ جبکہ آپ کی ہر حدیث وحی ہے تو پھر کیوں وہمی لوگوں والے قیاس

سے فرماتے ہیں کہ شاید بنی اسرائیل کے مسخ شدہ آدمیوں کی اولاد ہو؟ اس لئے میں اس کے کھانے میں متردد ہوں۔ اور چونکہ مجھے خود یقین نہیں اس لئے کسی کو اس سے روک بھی نہیں سکتا۔ اور اگر آپ کو شک ہے تو کیا آئندہ بھی کبھی اس شک سے نکل کر سوسمار کا قطعاً حلال ہونا آپ واضح کردیں گے؟ وغیرہ وغیرہ العیاذ باللہ

امام اعظمؒ کے نزدیک حرام، اور امام شافعیؒ کے نزدیک حلال

اب جبکہ بقول علمائے اہل حدیث وحی کے بغیر نہ بولنے والے نبی اور رسول کے شک کی معاذ اللہ معاذ اللہ یہ حالت ہو تو امت کے شک واختلاف کا کیا حال ہوگا۔ جیسے کہ سوسمار آج تک امام اعظمؒ کے مقلدوں کے نزدیک حرام ہے اور امام شافعیؒ کے مقلدین کے نزدیک حلال ہے۔ جب اُمت میں (حلال وحرام کے متعلق) ایسا اختلاف موجود ہے کہ ایک گروہ دوسرے کو کہہ سکتا ہے کہ تم نے حلال کو حرام کر دیا ہے اور دوسرا اسے الزام دے سکتا ہے کہ تم نے حرام کو حلال بنا دیا ہے اور یہ سب کچھ حدیث شریف کے طفیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر تھوپا جا رہا ہے۔ العیاذ باللہ۔ اور جب علمائے اہل حدیث کی اپنی یہ حالت ہو تو ہم اگر کسی امر کے متعلق احتیاطاً یہ بھی کہہ دیں کہ یہ امر ہمارے نزدیک بھی قابل غور ہے تو کیا اس سے ہماری اس بحث پر کوئی اثر پڑ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ مختصر یہ کہ ہم سے اس بحث کے متعلق ایسے سوالات پوچھنا سرتاپا باطل ہے ہمیں تو اس بحث سے صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ ہمارے لئے:-

(۱) سوائے قرآن مجید کے کسی اور وحی کا (تورات، انجیل وغیرہ تک کا بھی) بطور وحی کے کوئی استقلال باقی نہیں رہا۔

(۲) پھر نرے اجتہادات خواہ کسی کے بھی ہوں، قرآن مجید کے ساتھ کس طرح بطور وحی کے دوسرا مستقل اصول ٹھہر سکتے ہیں؟



باب دوم

احادیث وحی نہیں

اس کتاب کا اصل موضوع تو یہی ہے کہ علمائے اہلِ حدیث جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و اقدامات کو وحی کا درجہ دینے پر مصر ہیں۔ اس کا مبنی بر خطا ہونا واضح کیا جائے۔ چنانچہ وہ آپ کے افعال و اقوال کو کبھی وحی خفی کا نام دیتے ہیں اور کبھی وحی غیر متلو کے لقب سے یاد کرتے ہیں چونکہ کتاب کا اصل موضوع یہی مسئلہ ہے اس لئے آپ کو ہر باب میں اسی کی پرچھائیاں ملیں گی۔ پہلا باب جو انبیاء کرام کی بشریت اور ان کے اقوال و افعال کو مبنی بر بشری عقل و اختیار ثابت کرنے کے لئے تھا۔ اس میں بھی جگہ جگہ یہ بحث آتی رہی ہے۔ اور آیندہ ابواب میں بھی آتی رہے گی۔ لیکن حضرت خواجہ صاحب نے اس موضوع پر تبعًا نہیں بلکہ اصالۃً جو کچھ تحریر فرمایا ہے۔ اسے ہم اس باب میں پیش کر رہے ہیں۔

خواجہ صاحب فرماتے ہیں:۔

اگر حدیثیں بطور وحی الٰہی کے کفار کے سامنے پیش کی جاتی تھیں تو کیوں انہوں نے کبھی قرآن مجید کی مانند حدیثوں کی مخالفت نہیں کی اور کیوں احادیث کے وحی ہونے کے متعلق جھگڑے اور اعتراض نہیں کئے تھے؟ کفار تو غیر قرآن کو خود ہی مانگ رہے تھے وہ قرآن ہی کے بدلنے پر زور دیا کرتے۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ
لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۭ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ
اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ
اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۰/۱۵﴾

اور جب ان کے سامنے ہماری آیتوں کی جو کھلی کھلی اور واضح ہیں تلاوت کی جاتی ہے تو جنہیں ہمارے روبرو پیش ہونے کی توقع نہیں ہے (یعنی اُخروی زندگی پر ان کا ایمان نہیں ہے) کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا قرآن لائیے یا اسے بدل دیجئے۔ (اے پیغمبر!) کہدو کہ میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ میں اسے اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں تو اسی کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے دن (قیامت) کے عذاب کا اندیشہ ہے۔

منافقین بھی قرآنی سورتوں اور آیتوں ہی کے نازل ہونے سے ڈرا کرتے تھے۔ اُنہیں احادیث سے کوئی ڈر نہیں تھا۔

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ۝

(۹/۶۴) منافقین ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں مسلمانوں پر کوئی ایسی سورت نازل نہ کر دی جائے جو انہیں ہمارے دلوں میں جو کچھ ہے اس کی خبر دیدے۔ (اے پیغمبر!) آپ کہدیجئے۔ خوب ٹھٹھے کر لو۔ یقیناً اللہ ان چیزوں کو ظاہر کر کے رہے گا جن کے اندیشے تم کرتے رہتے ہو۔

حالانکہ حدیثیں تو ہر روز ان کے سامنے پیش ہوتی رہتی تھیں۔ مؤمن بھی سورتوں ہی کے نازل ہونے کا انتظار کیا کرتے تھے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۭ فَاَوْلٰى لَهُمْ ۝ (۴۷/۲۰) اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ کہتے ہیں کہ کوئی سورۃ کیوں نازل نہیں کر دی جاتی۔ تو جب کوئی واضح اور محکم سورت نازل کر دی گئی جس میں جہاد کا ذکر کیا گیا تھا۔ تو آپ ان لوگوں کو دیکھتے ہیں جن کے دل میں (نفاق کا) روگ ہے کہ وہ آپ کی طرف ایسے دیکھ رہے ہیں جیسے وہ شخص

دیکھا کرتا ہے جس پر موت کی مدہوشی طاری ہو۔ تو ایسے لوگوں کے لئے
تباہی ہی ہے۔

ایک دفعہ (بقولِ روایات) کچھ عرصہ کے لئے قرآن مجید کا نزول رک گیا۔ لوگوں نے نزول وحی کے اس وقتی طور پر رک جانے کو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متروک و مبغوض الٰہی ہونے پر محمول کر لیا۔ حالانکہ احادیث کا وقوع اس وقت بھی ہو رہا تھا۔ اگر حدیث بھی وحی ہے تو ان کا وقوع آپ کو منظور و مقبول بارگاہِ الٰہی ٹھہرانے کے لئے کیوں نہ کافی ہو گیا؟ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے طعن و طنز پر کیوں نہ فرما دیا کہ مسخرو! وحی کی دوسری قسم (وحی خفی یا وحی غیر متلو) تو مجھ پر برابر آ رہی ہے۔ میں خدا کا مقہور و مبغوض کیسے ہو گیا؟ اس کے بعد یہ بھی ملاحظہ فرمایئے کہ قرآن کریم صحابۂ کرام کو ایسی باتوں کے سوال کرنے سے جن کا جواب تکلیف دہ بن جائے تاکیداً روکتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ (۵/۱۰۱-۱۰۲)۔ اے پیروانِ دعوت ایمانی!
ایسی چیزوں کے متعلق نہ پوچھا کرو کہ اگر وہ تمہارے سامنے ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں بری لگیں۔ اور اگر تم ان کے متعلق پوچھو گے جبکہ قرآن نازل ہو رہا ہے تو وہ تمہارے لئے ظاہر کر دی جائیں گی۔ حالانکہ اللہ نے ان سے درگذر کی ہے۔
اور اللہ بڑا بخشنے والا بردبار ہے۔ تم سے پہلے قوموں نے ایسے ہی سوالات کئے تھے۔ پھر وہ ان کے منکر بن گئے۔

اس آیت کریمہ میں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو ڈرایا ہے کہ اگر قرآن کے نازل ہوتے وقت ان کا سوال کرو گے۔ تو ضرور تمہیں جواب ملے گا۔ اب اگر حدیثیں بھی وحی کے ذریعہ سے ملتی تھیں۔ تو کیوں ان سوالات کے جوابات کو قرآن کے نزول کے ساتھ ہی وابستہ فرما دیا گیا۔

کفار اعتراض کیا کرتے تھے کہ کیوں یہ قرآن ایک ہی دفعہ سارے کا سارا نازل نہیں کر دیا جاتا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ج

(۲۵/۳۲) اور کفار کہتے ہیں کہ پیغمبر پر یہ قرآن ایک ہی بار سارے کا سارا کیوں نازل نہیں کر دیا جاتا۔

اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے کئی وجہیں بیان فرمائی ہیں۔

اوّل :۔ یہ کہ اس سے مصیبتوں اور مشقتوں کے اوقات میں رسول اللہ کی دلجمعی اور قلب اطہر کی تقویت مطلوب ہے۔ جب آدمی کو کوئی مشکل پیش آجائے اور اس کے ساتھ ہی اس کی تسلی کرنے والا کوئی تسلی کے الفاظ کہہ دے تو یہ مصیبت زدہ کی تقویت کا باعث ہوتا ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ کتاب ساری کی ساری ایک دم نازل کر دی جاتی اور زندگی بھر اس کی تعلیم کی اشاعت میں مختلف صعوبات و مشکلات پیش آتی رہتیں مگر کوئی تسلی کے دو لفظ بھی کہنے والا نہ ہوتا تو اکثر اس کی وجہ سے بشری ہمت جواب دی جاتی ہے۔ اور آدمی حوصلہ کھو بیٹھتا ہے۔ آہستہ آہستہ قرآن کو نازل کرنے میں یہ فائدہ ہے کہ ہر محل اور ہر وقت ہمت افزائی کا سامان ہوتا رہتا ہے۔ جہاں ہمتیں پست ہونے لگیں فوراً حوصلہ بڑھانے والی آیات نازل ہو گئیں۔

كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۝ (۲۵/۳۲)

ایسا ہی ہوا ہے (کہ ہم نے قرآن کو ایک دم سارے کا سارا نازل نہیں کر دیا) تاکہ اس کے ذریعے ہم آپ کے دل کو ثابت رکھ سکیں اور اسی لئے ہم نے قرآن کو آہستہ آہستہ پڑھا (نازل کیا) ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر اکٹھی ایک ہی وقت میں تمام تسلیاں دے دی جائیں تو وہ ساری زندگی کے لئے کافی نہیں ہو سکتی تھیں۔ حضرات علمائے اہلِ حدیث غور فرمائیں کہ اگر کوئی حدیثی اور روایتی وحی خفی کا ذریعہ بھی آپ کے قلب اطہر کو تسلی دینے اور ثبات بخشنے کے لئے قرآن کی طرح (مثلہ معہٗ) موجود تھا تو کیا حق تعالیٰ کی طرف سے یہ جواب

صحیح ہو سکتا ہے؟ اس پر کفار کہہ سکتے تھے کہ تسلی دینے کے لئے اور دلجمعی قائم رکھنے کے لئے وحی خفی کا ایک اور ذریعہ موجود ہے قرآنِ کریم کو یکبارگی نازل کرنے میں کیا عذر ہے تو اس کا جواب ظاہر ہے کہ کچھ نہیں دیا جا سکتا تھا۔

دوم:۔ دوسری وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ قرآنِ کریم پر کفار کی طرف سے جو اعتراض یا اہل حاجت کی طرف سے کچھ سوالات ہوں تو ان کے جواب بھی قرآن ہی میں دے دیئے جائیں

وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ (۲۵/۳۳)

اور نہیں لاتے ہیں وہ آپ کے پاس کوئی مثال مگر ہم لے آتے ہیں آپ کے پاس (اس کا) صحیح جواب

مطلب یہ کہ قرآن کے متعلق موافقین ومخالفین کے اگر کچھ اشکالات یا سوالات ہوتے ہیں تو ان کا جواب بھی ہم قرآن ہی میں ساتھ کے ساتھ دے دیتے ہیں اگر سارا قرآن یکبارگی ایک ساتھ ہی نازل کر دیا جاتا تو لوگوں کے اشکالات وسوالات کے جواب وحی کے ذریعہ سے نہ دیئے جا سکتے۔ یہ بات بھی علمائے حدیث کے عقیدہ پر صحیح نہیں ہو سکتی اگر قرآن جیسا کوئی اور ذریعہ (وحی خفی کا) جواب دینے کے لئے موجود تھا تو مختلف اشکالات کے جوابات بجائے قرآن کے اس ذریعہ سے دیئے جا سکتے تھے۔

سوم:۔ تیسری وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ قرآن کو آہستہ آہستہ نازل کرنے میں یہ بھی مصلحت ہے کہ قرآن کی ضروری تفسیر بھی ساتھ کے ساتھ ہی ہوتی جائے۔

وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا (۲۵/۳۳) اور تاکہ ہم بہترین تفسیر بھی کر دیں۔

حضرات اہل حدیث کے قول پر یہ جواب بھی صحیح نہیں ٹھہرتا۔ اگر قرآن جیسی وحی والی تفسیر کرنے کے لئے کوئی اور ذریعہ (وحی خفی کا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھا۔ تو قرآن کو یکبارگی سارے کا سارا نازل کر دینے میں کیا امر مانع تھا۔ وحی خفی کے ذریعہ سے قرآن کی تفسیر ہوتی رہتی۔

قرآن مجید کی تبلیغ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایسی فرض تھی کہ چلتی

ہوئی تلواریں اسے نہیں روک سکتی تھیں۔لیکن احادیث صرف حیا یا دلجوئی کے خیال سے بھی روکی جا سکتی تھیں جس کی وجہ یہی تھی کہ قرآن وحی تھا اس کو روکنا ممکن نہیں تھا اس کی تبلیغ ضروری تھی لیکن احادیث وحی نہیں تھیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی اور شخصی صوابدید سے متعلق تھیں۔ان کی تبلیغ آپ پر فرض نہیں تھی۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ (۳۳/۵۳)۔ اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! نبی کے گھر میں نہ گھس جایا کرو، اِلّا یہ کہ تمہیں اس کی اجازت دی جائے مثلاً کھانے کے لئے بلایا جائے تو کھانے کی تیاری کے انتظار میں نہ جم جاؤ، لیکن جب تمہیں بلایا جائے تو گھر میں جاؤ اور جب کھانا کھالو تو منتشر ہو جاؤ بات چیت سے رغبت رکھتے ہوئے جم کر نہ بیٹھ جاؤ۔یہ بات نبی کی اذیت کا باعث ہوا کرتی تھی لیکن نبی حیا کی وجہ سے کچھ نہیں کہتا تھا اور اللہ حق بات کہہ دینے میں نہیں شرماتا۔

ملاحظہ فرمایئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں غریب لوگ کھانا کھانے آیا کرتے تھے۔ وہ کھانا پکنے سے پہلے ہی آ بیٹھتے تھے اور کھانے کے بعد بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بات چیت اور گفتگو (حدیثوں) کے لالچ میں لگے رہتے تھے۔اکثر لوگوں کی ایسی ہی عادت ہوتی ہے۔رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ان کے اس فعل سے سخت اذیت ہوتی تھی۔ اگر آپ انہیں اپنے حدیثی بیان سے منع فرما دیتے تو بالکل بجا ہوتا۔لیکن آپ حیا کے سبب ایسی سچی حدیث بھی بیان نہیں کر پاتے تھے۔چنانچہ آپ ان لوگوں کو ان کے اس فعل سے نہ روک سکے حتیٰ کہ حق تعالےٰ نے وحی کے ذریعہ سے قرآنِ کریم

میں ساری بات نازل فرمادی۔ اب قرآن مجید میں آجانے کے بعد اسی بات کے بیان سے وہی حیا آپ کو ہرگز ہرگز نہ روک سکی اور آپ نے ڈنکے کی چوٹ اس کا اعلان فرما دیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ حدیثی بیان کے ذریعہ سے آپ کو حیا آئی اور آپ ان صحابہ کو نہیں روک سکے۔ اس کی تبلیغ آپ پر فرض نہیں تھی۔ وہ آپ کا ایک ذاتی اور شخصی معاملہ تھا۔ اس لئے اختیاری تھا۔ لیکن قرآنی وحی کے بیان کو آپ نہیں روک سکے نہ آپکو کوئی حیا مانع آئی کیونکہ یہ شخصی اور ذاتی معاملہ نہیں تھا۔ یہ قرآنی وحی تھی۔ اس کی تبلیغ آپ پر فرض تھی۔

قرآن مجید کے متعلق تحدی فرمائی گئی ہے کہ اس کی مثل ایک سورت بلکہ ایک حدیث ہی لے آؤ۔ یہ تحدی صرف عبارت آرائی اور قرآن کی فصاحت و بلاغت ہی میں نہیں بلکہ زیادہ تر ہدایت میں ہے جو قرآن مجید کا مقصود اصلی ہے۔ حق تعالےٰ اپنے رسول کو فرماتے ہیں کہ

قُلْ فَأْتُوا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (۲۸/۷۷) اے پیغمبر! کہدیجئے کہ تم اللہ کے پاس سے کوئی اور کتاب لے آؤ جو ان دونوں (تورات اور قرآن) سے زیادہ ہدایت والی ہو تو میں اسی کا اتباع کر لوں گا۔ اگر تم سچے ہو۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حدیثیں (خود آنحضرت کی طرف سے) اس وقت بھی قرآن کی مثل نہیں سمجھی جاتی تھیں بلکہ تورات کا درجہ بھی نہیں رکھتی تھیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر یہ قرآن میں نے اپنے دل سے بنالیا ہے تو تم بھی تو میرے ہی جیسے بشر ہو اس کی مانند بنالاؤ۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (۱۰/۴۸)۔ کیا وہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو محمدؐ نے خود ہی بنالیا ہے۔ (اے پیغمبر! آپ) کہدیجیے کہ اس جیسی ایک ہی سورت بنا کر لے آؤ اور اللہ کے سوا جسے تم مدد کیلئے بلا سکتے ہو بلا لو اگر سچے ہو۔

اور سورۂ طور میں ہے

فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ. (۵۲/۳۴)

تو اس قرآن جیسی ایک بات (حدیث) ہی لے آئیں اگر وہ سچے ہیں۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے سوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی اور ایسی چیز نہیں تھی جو دوسرے بشر حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ یعنی جسے وحی کہا جا سکتا ہو۔ صرف قرآن ہی ایسی چیز تھی جس کے متعلق قرآن نے تحدی کی ہے۔ باقی رہیں احادیث تو وہ بشری عقل و اختیار سے حاصل ہوئی تھیں۔ جو ہر شخص حاصل کر سکتا ہے اسی وجہ سے ان کے بارے میں قرآن نے کوئی تحدی نہیں فرمائی۔

حق تعالےٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کی ذمہ داری خود اپنے ذمہ لی ہے۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ. (۱۵/۹)

یقیناً اس ذکر یعنی قرآن کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

لیکن حق تعالےٰ نے حدیثوں کی کوئی ذمہ داری قبول نہیں کی بلکہ سچ پوچھئے تو روایتوں اور حدیثوں کو بالکل راویوں کے سچ جھوٹ پر چھوڑ دیا ہے۔ اگر حدیثیں بھی داخل قرآن (وحی) تھیں تو وہ بھی مثلیت اور حفاظت قرآن میں بھی داخل ہونی لازم تھیں۔ قرآن کی حفاظت کا ذمہ حق تعالےٰ نے کیوں لیا ہے؟ اسی لئے تو لیا ہے کہ وہ وحی ہے۔ خدا کلام ہے۔ اگر حدیثیں بھی وحی ہیں اور خدا ہی کا کلام اور مثلہ معہ ہیں تو ان کی حفاظت کا ذمہ حق تعالےٰ نے کیوں نہیں لیا۔ واقعہ یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہمارے پاس کوئی چیز سوائے قرآن مجید کے الٰہی حفاظت کے ساتھ نہیں پہنچی۔ اگر حدیثیں بھی قرآن مجید کی طرح ہمیشہ کے لئے مقصود اور ضروری التبلیغ ہوتیں تو لامحالہ قرآن مجید کی طرح محفوظ صورت میں ہی ہم تک پہنچائی جاتیں۔

حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اکثر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسائل پوچھتے رہتے تھے لیکن جب کوئی بات پوچھتے تو پہلے حکم

آلہی یعنی مَا اَوْحیٰ اور مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ کے متعلق پوچھتے تھے۔ اسی طریق سے ایک مرتبہ صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گدھوں کے متعلق سوال کیا (کہ ان پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں) آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا کہ گدھوں کے بارہ میں مجھ پر کوئی خاص آیت نازل نہیں ہوئی سوائے اسی جامع آیت کے جو سب پر حاوی ہے اور جمادات و نباتات وحیوانات سب کو سمیٹ لیتی ہے۔ علیحدہ کچھ نازل نہیں ہوا۔ مطلب یہ کہ تم کو مال کی زکوٰۃ کا حکم پہنچ چکا ہے۔ لہٰذا جو کچھ بھی مال کے ضمن میں آتا ہے۔ اس کا بھی یہی حکم ہے (یعنی زکواۃ دینی ہی ہوگی) حق تعالیٰ کا منشا تو یہی ہے کہ نیکی کرو۔ اور بدی سے بچو کیونکہ تم کو اپنا ذرہ ذرہ عمل دیکھنا ہوگا۔ تو کیا گدھوں کی زکوٰۃ دینے یا نہ دینے ہی پر سوال نہ ہوگا؟

حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ مجھ پر سوائے اس آیۂ کاملہ اور جامعہ کے

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ۔ (۹۹/۷)۔ تو جو ذرہ بھر نیکی کرے گا۔ اسے (قیامت میں) دیکھ لے گا۔

اور کچھ نازل نہیں ہوا، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک مُنَزَّلٌ مِنَ اللّٰہِ یا مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ صرف وہی ہے جس میں خود یہ آیت ہے یعنی صرف قرآن مجید۔ آپ نے ایک جامع آیت قرآنی ہی سے استنباط اور استدلال کر کے جواب دینے کے بجائے دوسری وحی (وحی خفی یا وحی غیر متلو) کے ذریعہ سے جواب نہیں دیا بلکہ قرآن کی آیت سے استدلال فرما کر جواب دیا اور فرمادیا کہ اس سلسلہ میں کوئی الگ حکم اس آیت جامعہ کے علاوہ مجھ پر نازل نہیں ہوا۔ حالانکہ جو جواب آپ نے دیا ہے۔ وہ علمائے حدیث کے نزدیک وحی خفی والی مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ میں سے تھا۔ لہٰذا حضور کا یہ جواب غلط ٹھہرتا ہے۔

نیز حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اگر مَا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا میں تمہیں

شک ہے تو اس کی مثل ایک ہی سورت بنا کر لے آؤ۔ اس سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ مَا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا سوائے قرآن کے اور کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ سورتیں تو قرآن ہی میں ہوتی ہیں۔ حدیثوں میں تو سورتوں کا وجود ہیں آج تک نہیں ملا۔ شکر ہے علمائے حدیث نے بخاری شریف کے تیس پارے تو بنا ڈالے مگر انہیں سورتیں بنانے کا خواب نہیں آیا۔

سورۂ اعراف کی ابتداء ہی ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

الٓمّٓصٓ ۝ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ

(۷/۳) الٓمّٓصٓ ۝ یہ (قرآن) ایک کتاب ہے جو (اے پیغمبر!) آپ کی طرف نازل کی گئی ہے۔ تو آپ کے سینہ میں اس کی وجہ سے کوئی تنگی نہیں ہونی چاہیئے۔ تاکہ آپ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو ڈرا سکیں اور یہ مومنین کے لئے نصیحت ہو۔ اے لوگو! جو کچھ تم پر تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو۔ اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے اولیاء (مددگاروں) کی پیروی مت کرو۔ تم بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہو۔

پہلی آیت میں بتا دیا ہے کہ اے پیغمبر آپ کی طرف صرف یہ قرآن (کِتٰبٌ) نازل کیا گیا ہے۔ (احادیث نہیں) لہٰذا آپ اسی کے ذریعہ سے لوگوں کو ڈرائیے اور اس کی وجہ سے آپ کے دل میں کوئی تنگی نہیں ہونی چاہیئے۔ اس کے بعد دوسری آیت میں تمام مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو۔ ظاہر ہے کہ اس سے مُراد وہی کِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ ہے جو پچھلی آیت میں آچکا تھا۔ کوئی اور چیز نہیں ہے۔ کیونکہ لوگوں پر تو ان کے پروردگار کی طرف سے سوائے اس قرآن کریم کے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا تھا

کوئی اور چیز نازل نہیں ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ تمام مفسرین نے بالاتفاق مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ سے مراد قرآن کریم ہی لیا ہے۔ لہٰذا ان آیتوں سے واضح طور پر ثابت ہے کہ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ یا کِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَیْکَ یعنی مُنَزَّلٌ مِّنَ اللّٰہِ (اللہ کی طرف سے نازل شدہ) قرآن اور صرف قرآن ہی ہے۔ لیکن پھر بھی ہمارے علمائے حدیث کو اصرار ہے کہ حدیثیں بھی آنحضرت پر نازل ہوا کرتی تھیں۔ العجب ثم العجب۔

حضرت ہارون علیہ السلام رسول اور نبی تھے اور اولوالعزم انبیا میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ مگر چالیس رات تک کوہ طور پر رہنے کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آئے اور قوم کو گوسالہ پرستی میں مشغول پایا تو حضرت ہارون علیہ السلام کو جواب دہی کے لئے بلایا اور پوچھا

قَالَ یٰہٰرُوْنُ مَا مَنَعَکَ اِذْ رَاَیْتَہُمْ ضَلُّوْٓا۔ اَلَّا تَتَّبِعَنِ، اَفَعَصَیْتَ اَمْرِیْ (۲۰/۹۲-۹۳) موسیٰ نے کہا اے ہارون! جب تو نے انہیں دیکھا کہ وہ گمراہ ہو گئے ہیں تو تجھے میرا اتباع کرنے سے کس چیز نے رد کا تھا۔ تو کیا تو نے میرے حکم کی نافرمانی کی؟۔

اس پر جب انہوں نے جواب دیا۔

قَالَ یَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْیَتِیْ وَلَا بِرَاْسِیْ، اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ ہ (۲۰/۹۴) ہارون نے کہا اے میرے ماں جائے! میری ڈاڑھی اور سر کے بال نہ پکڑ۔ میں اس سے ڈرا کہ تو کہے گا کہ ہارون نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور میری بات کا لحاظ نہیں رکھا۔

تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون کی معذرت قبول کر لی اور انہیں چھوڑ کر سامری کی طرف متوجہ ہو گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارونؑ سے یہ نہیں فرمایا کہ نبی کا ہر حکم اللہ کا حکم ہوتا ہے۔

اللہ کے حکم کی تعمیل میں مصلحتیں نہیں سوچی جاتیں۔ اسے ہر حال میں بجالانا ہوتا ہے۔ تم مصلحتوں کا شکار ہوگئے کہ موسیٰ یوں نہ کہدے اور وہ یوں نہ کہدے؟ اس سے بھی معلوم ہوا کہ نبی کا ہر قول و فعل وحی سے نہیں ہوتا۔ اگر نبی کا ہر قول و فعل وحی سے ہوتا ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی نبی اور رسول ہیں نیز حضرت ہارون علیہ السلام بھی نبی اور رسول ہیں دونوں کا فعل ایک دوسرے کے خلاف ہے تو بتایا جائے کہ کیا خدا نے ہی موسیٰؑ کو ایک حکم دیا تھا اور ہارونؑ کو اس کے خلاف حکم دیا تھا یا پھر دونوں میں سے کس کا حکم، حکم الٰہی تھا اور کس کا قول و فعل اپنا ذاتی تھا؟

(۶) ○ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ نبی اور رسول خدا کے مقرر کردہ حاکم ہوتے ہیں۔ لوگوں کو ان کے عزل و نصب کا دوسرے حاکموں کی طرح کوئی اختیار نہیں ہوتا چونکہ وہ اللہ کے مقرر کردہ حاکم ہوتے ہیں اس لئے ان کے احکام بھی اللہ ہی کے احکام ہوں گے۔ اس میں اتنی بات تو درست ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے مقرر کردہ حاکم ہوتے ہیں۔ اس لئے دوسرے حکام کی طرح لوگوں کو ان کے عزل و نصب کا اختیار نہیں ہوتا۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ خدا کے مقرر کرنے سے ایک بشر حاکم اپنی بشری کمزوریوں سے بری ہو جاتا ہے۔ اب اس میں بشری کمزوریاں نہیں رہتیں، یاد رکھیے حق تعالیٰ انسانوں کو ایسی ہی حکومت کرنے کے لئے مقرر فرماتا ہے جیسی کے بشر کر سکتے ہیں اور اسی لئے ان سے جواب بھی طلب ہوتا ہے۔

طالوت کو خود حق تعالیٰ نے ہی اپنے حکم سے بادشاہ بنایا تھا۔ قرآن مجید میں ہے وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا (پ۲ ع۲۲) یعنی بنی اسرائیل سے ان کے نبی نے فرمایا کہ بیشک اللہ نے طالوت کو تم پر حکمران مقرر کیا ہے، مگر اس سے ان کا معصوم اور بے غلط ہونا تو الگ رہا وہ نبی یا رسول بھی

نہیں بن گئے۔ حق تعالےٰ نے بنی اسرائیل میں اور بھی بہت سے ملوک اور انبیاء بنائے تھے مگر اس طرح وہ تمام ملوک معصوم تو نہیں بن گئے تھے۔ جب کوئی نبی آئندہ کیلئے اپنا خلیفہ یا حاکم یا امیر مقرر کرتا تھا اور فرماتا تھا کہ جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت اور جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی تو اس سے اطاعت کے معنے خود ہی واضح ہوجاتے ہیں۔ نبیوں کے تمام خلفاء اور امیر نہ معصوم ہوتے تھے نہ بے غلط۔ بلکہ احادیث کی رو سے تو سب نیک بھی نہیں ہوتے تھے۔ (العیاذ باللہ!)

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے عبداللہؓ ابن حذافہ کو امیر بنا کر کہیں بھیجا۔ اور لوگوں کو ہدایت فرمائی کہ جو تمہارا امیر کہے اس کی اطاعت کرنا۔ ایک دن عبداللہ نے کسی بات پر ناراض ہوکر غصہ میں بہت سی آگ روشن کرائی اور لشکر کو حکم دیا کہ اس آگ میں کود پڑو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تم پر میری اطاعت واجب کردی ہے۔ لہٰذا تم میرے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتے۔ لشکر نے کہا کہ ہم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر دوزخ کی آگ سے بچنے کے لئے ایمان لائے ہیں۔ آگ میں گھسنے کے لئے تو ایمان نہیں لائے۔ جب حضورؐ نے یہ بات سُنی تو فرمایا لَوْ دَخَلْتُمُوْہُ لَمْ تَزَالُوْا فِیْهَا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ (یعنی اگر تم اس آگ میں داخل ہوجاتے تو ہمیشہ قیامت تک اسی میں رہتے۔ (بخاری ومسلم) اس حدیث سے طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ کی حقیقت اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے۔

یہاں آپ نے دیکھا کہ حضرت عبداللہؓ ابن حذافہ اس وجہ سے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو امیر مقرر فرمایا تھا معصوم اور راست کار نہیں بن گئے بلکہ وہ بشری کمزوریوں کے اسی طرح حامل رہے جیسے حضورؐ کے مقرر کرنے سے پہلے تھے اور انہوں نے ایک غلط حکم دے

ڈالا۔ اسی طرح انبیاء اور رسل کو حق تعالیٰ کے حاکم مقرر کر دینے سے انبیاء و رسل بشریت سے عاری نہیں ہو جاتے۔ بشری کمزوریاں اس کے بعد بھی ان کے ساتھ لگی رہتی ہیں۔ لہٰذا ان کا حکم، وحی الٰہی نہیں ہو سکتا۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھئے کہ حضرت عبداللہؓ ابن حذافہ کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے امیر مقرر فرما کر لشکر کو یہ ہدایت فرمائی تھی کہ "جو تمہارا امیر کہے اس کی اطاعت کرنا" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم حضرات اہل حدیث کے نزدیک وحی الٰہی تھا۔ یعنی خدائی حکم تھا۔ لشکر کو جب عبداللہؓ ابن حذافہ نے آگ میں گھس جانے کا حکم دیا تو اس نے اس حکم کی تعمیل نہیں کی۔ یعنی خدا کے حکم کو نہیں مانا اور اپنی حجت بازی سے کام لیا کہ آنحضرتؐ پر ہم آگ سے بچنے کے لئے ایمان لائے ہیں۔ آگ میں گھسنے کے لئے نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اللہ کے حکم میں اس قسم کی حجت بازی کرنا کہاں تک درست تھا۔ اس حجت بازی میں اور ابلیس کی اس حجت بازی میں کہ

خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ۔ تُو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔

کیا فرق ہے؟ حجت کے اعتبار سے ابلیس کا بیان بالکل صحیح ہے کہ آگ کا شعلہ ہمیشہ اوپر کو جاتا ہے اور مٹی کا مجسمہ پھینکا جائے تو وہ ہمیشہ نیچے کو آتا ہے۔ لہٰذا میں اوپر کی چیز یعنی اعلیٰ ہستی ہوں اور آدمؑ پستی کی چیز یعنی ادنیٰ ہستی ہے۔ میں آدمؑ کے سامنے سربسجود ہو جاؤں اس میں کچھ معقولیت نہیں ہے۔ حق تعالیٰ کے احکام کی تعمیل تو بے چون و چرا کی جانی چاہیئے۔ تو اگر یہ حکم کہ "جو تمہارا امیر کہے اس کی اطاعت کرنا" خدا کا حکم تھا تو لشکر کو بے چون و چرا اس کی تعمیل کرنی چاہیئے تھی۔ اس میں حیلے تلاش کرنے کی اسکو کہاں گنجائش تھی مگر حیرت ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی لشکر کی اس حیلہ جوئی کی توثیق و تصدیق

فرما دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ حکم الٰہی نہیں تھا اور اس حکم میں سوچنے سمجھنے اور کسی مناسب فیصلہ پر پہنچنے کی گنجائش تھی۔

فہم قرآن از روئے قرآن

حق تعالےٰ کا ارشاد ہے کہ

حٰمٓ ۔ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۔

اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۔ (۴۳/۱-۳)

حٰمٓ ۔ یہ واضح کتاب گواہ ہے کہ ہم نے اسے یعنی قرآن کو عربی زبان میں بنایا ہے تاکہ تم سمجھ سکو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ایک واضح اور مبین کتاب ہے جسے عربی زبان میں اس لئے اتارا گیا ہے تاکہ سب لوگ مع پیغمبر کے اسے سمجھ سکیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی قرآن کریم کو اس کی عربیت ہی کے لحاظ سے سمجھتے تھے اور تمام صحابہؓ بھی ——— بلاشبہ یہ درست ہے کہ اگر قرآن مجید کی کوئی بات ہماری سمجھ میں نہ آئے تو دوسرے عربی داں لوگوں سے مدد لے کر، قرآن مجید ہی کے الفاظ کے مطابق ہم اس کی تحقیق کر سکتے ہیں ۔ ... .. ایسی باتیں معقول طور پر مانی جا سکتی ہیں لیکن یہ بڑے غضب کی بات ہوگی کہ اگر کوئی انسان ہو کر یہ دعوےٰ کرے کہ قرآن مجید کے بہت سے مسائل صرف میری ہی سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ ان کو کوئی دوسرا انسان تاقیامت قرآن مجید سے سمجھنے کے قابل نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے اے لوگو! میری سمجھ کو قرآن مجید کے ساتھ ہمیشہ کے لئے ایک جدا اور مستقل اور غیر متبدل اصول قرار دے لو۔ تمہارے لئے اس کے سوا کوئی چارا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ میری سمجھ الوہی سمجھ ہے۔ جب ہی تو میں وہ باتیں قرآن سے سمجھ سکتا ہوں جو تم قیامت تک نہیں سمجھ سکتے۔

اہلِ حدیث کا دعویٰ ہے کہ تمام حدیثیں فہم قرآن ہی ہیں۔ لیکن یہ ایسا فہم قرآن ہے جس کو کوئی شخص قرآن مجید سے کسی دوسرے کو نہیں

سمجھا سکتا اور اسی لئے وہ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ فلاں فلاں چیز (مثلاً کُتا بلی وغیرہ) کا حرام ہونا قرآن سے ثابت ہے مگر تم قرآن سے نکال کر نہیں دکھا سکتے۔ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے اسے قرآن سے سمجھا ہے۔

اہل حدیث، حدیثوں کے فہم قرآن ہونے کا دعویٰ کر کے اس دعوے کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ انہیں "مطلقاً" کوئی شخص قرآن سے نہیں سمجھ سکتا ہے۔ خود رسول اکرمؐ بھی اُن سب کو قرآن مجید سے کسی کی سمجھ میں نہیں لا سکتے تھے ورنہ اُنہیں اپنے فہم کو بھی قرآن مجید کے ساتھ جدا مستقل اور غیر متغیر اصول نہ قرار دینا پڑتا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسا فہم قرآن ہے جو صرف ایک شخص کی سمجھ میں ہی آیا۔ لیکن وہ بھی معاذاللہ دوسروں کو قرآن سے سمجھانے کے قابل نہ ہو سکا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی عربی جو (۴۳) کی شہادت کے مطابق ہر خاص و عام کے سمجھنے کے لئے نیز دوسروں کو سمجھانے کے لئے ہی نازل ہوئی ہے وہ ایسی نہیں ہے کہ خود رسول بھی اپنے سمجھے ہوئے مسائل کو خود قرآن کے الفاظ سے کسی دوسرے کو نہ سمجھا سکے۔ البتہ رسول کی حدیثی عربی خدا کی نازل کردہ عربی مبین سے ایسی واضح تر اور روشن تر ہے کہ جسے تمام و کمال ہم خود بھی سمجھ سکتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی سمجھا سکتے ہیں۔ اس سے قرآن کریم کی عربی کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ وہ ظاہر ہے۔ اس سے قرآن مجید کی عربی بھی بے مثل نہیں رہتی اور حق تعالیٰ کا یہ دعویٰ بھی غلط ہو جاتا ہے کہ ہم نے قرآن کو عربی بنا کر اس لئے بھیجا ہے کہ تم سب اسے سمجھو۔ افسوس صد افسوس! فہم قرآن تو وہی ہو سکتا ہے جو خود قرآن سے سمجھایا جا سکے۔ اس کے برعکس روایات جو قرآن کا فہم نہیں۔ محض نام رکھ دینے سے قرآن کا فہم نہیں بن سکتیں۔

یہ بات ہم پہلے باب میں واضح کر چکے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا فہم مافوق البشر فہم نہیں تھا۔ آپ غیب داں بھی نہیں تھے۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (۹/۴۳)۔
اے پیغمبر! اللہ آپ کو معاف فرمائے۔ آپ نے انہیں (غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ جانے کی) اجازت کیوں دے دی۔ آپ کو معلوم تو ہو جاتا کہ کون لوگ سچ بول رہے ہیں۔ اور آپ جھوٹوں کو بھی پہچان لیتے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ منافق لوگ آپ کو دھوکہ دیکر اور جھوٹ بول کر آپ سے بلاوجہ اجازت لے لیا کرتے تھے اور

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (۲۴/۶-۹) اور جو لوگ اپنی بیویوں پر تہمت لگاتے ہیں اور سوائے اپنے نفسوں کے ان کے پاس گواہ بھی نہیں ہوتے تو ان میں سے ایک (یعنی شوہر) چار اللہ کی قسمیں کھائے (شہادتیں دے) کہ وہ سچا ہے اور پانچویں شہادت یہ دے کہ اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹا ہو۔ اور (بیوی) اپنے سے (زنا کی) سزا کو اس طرح ہٹائے کہ وہ بھی اللہ کی چار قسمیں کھائے (شہادتیں دے) کہ اس کا شوہر یقیناً جھوٹا ہے اور پانچویں شہادت یہ دے کہ اس پر خدا کا غضب نازل ہو اگر وہ سچا ہو۔

کے مطابق لعان کے طریقہ سے میاں بیوی دربار رسالت میں جھوٹی قسمیں

کھاکر سزا سے بچ جایا کرتے تھے اور آپ کو معلوم نہیں ہوتا تھا کہ دونوں میں سے کون جھوٹا اور کون سچا ہے نیز

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ۖۗ وَ اللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ۝ اَلَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآىٕهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ؕ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔیْ وَلَدْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّهُمْ لَیَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَ زُوْرًا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝ - (۵۸: ۲-۱)

اللہ نے اس عورت کی بات سن لی ہے جو (اے پیغمبر!) اپنے شوہر کے بارے میں آپ سے جھگڑ رہی تھی اور اللہ سے شکایت کر رہی تھی۔ اللہ تم دونوں کی گفتگو کو سن رہا تھا۔ یقیناً اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے، جو لوگ تم میں سے اپنی عورتوں سے ظہار[1] کر لیتے ہیں تو (اس سے) وہ بیویاں مائیں نہیں بن جاتیں مائیں تو ان کی وہی ہیں جنہوں نے انہیں جنم دیا ہے۔ البتہ یہ لوگ یقیناً ایک ناپسندیدہ اور جھوٹی بات منہ سے نکال دیتے ہیں۔ یقیناً اللہ معاف فرمانے والا اور بخشنے والا ہے۔

کے مطابق ایک عورت جسے اس کے شوہر نے ماں کہدیا تھا آنحضورؐ سے جھگڑتی تھی کہ شوہر کے ماں کہدینے سے طلاق نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ کیسا قانون ہے کہ حماقت تو شوہر سے سرزد ہو اور خمیازہ اس کی بیوی بھگتے آنحضورؐ چونکہ جس معاملہ میں وحی کا فیصلہ نہ ہو، اس میں اجتہاد کیا کرتے تھے۔ اسلئے آپنے مذکورہ عورت کے خیال سے اتفاق نہیں فرمایا۔ چونکہ عربوں کے دستور کے مطابق ایسا کہنے سے

---

[1] ظہار کرنا یہ ہے کہ اپنی بیوی کو ماں بہن وغیرہ کہدینا یا ان کے کسی عضو کو محرمات کے اعضاء سے تشبیہ دیدینا۔ عربوں میں ایسا کہہ دینے کا عام دستور تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ اس سے بیوی پر طلاق پڑ جاتی ہے۔

طلاق پڑ جاتی تھی اس لئے آپ کا خیال یہی تھا کہ طلاق ہو جانی چاہیئے۔ لیکن اللہ تعالے نے فیصلہ عورت کے حق میں دیدیا۔ نیز

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنَافِقِينَ فِئَتَيْنِ وَاللَّهُ أَرْكَسَهُم بِمَا كَسَبُوا ۚ أَتُرِيدُونَ أَن تَهْدُوا مَنْ أَضَلَّ اللَّهُ ۖ وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ سَبِيلًا ۔۔۔۔ (۴/۸۸)

مسلمانو! یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ منافقوں کے بارہ میں تمہارے دو گروہ بن گئے ہیں۔ اور اللہ نے تو انہیں ان کے اعمال کے سبب اوندھا کر دیا ہے کیا جسے خدا نے گمراہ کر دیا ہے تم اسے ہدایت دینا چاہتے ہو؟ جسے اللہ گمراہ کر دے (اے پیغمبر!) تم ان کے لئے کوئی راہ نہ پا سکو گے۔

کے مطابق منافقوں کے بارے میں صحابہؓ کے دو گروہ ہو گئے تھے۔ ایک گروہ ان کو قتل کر دینے کے حق میں تھا۔ اور دوسرا ان سے درگذر کر دینے کے حق میں تھا۔ کیونکہ وہ بہر حال کلمہ گو تھے۔ اور اپنے مؤمن ہونے کے مدعی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے گروہ کے ہم خیال تھے۔ یہاں بھی آپ کا فہم ایسا بشری فہم ہی ثابت ہوا کہ آپ کی رائے جس گروہ کے ساتھ تھی حق تعالیٰ نے اس کی توثیق نہیں فرمائی بلکہ اپنا فیصلہ دوسرے گروہ کے حق میں نازل فرمایا۔ تو اسطرح کی سچی اور واقعی احادیث اور اقوال نبوی کو بھی قرآن کریم کی تفسیر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ چہ جائیکہ ان روایات کو تفسیر قرآن مان لیا جائے جن کے اقوال رسول ہونے میں بھی شک ہے۔ اور جو بالاتفاق ظنی ہیں۔ اس کا بین ثبوت خود اہل حدیث حضرات کے اپنے عمل میں موجود ہے کہ جب وہ کوئی روایت بیان کرتے ہیں تو پہلے تو یہ کہتے ہیں " قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ (فلاں صحابی نے کہا کہ حضورؐ نے فرمایا) لیکن روایت کے خاتمہ پر اس قال قال رسول اللہ کو خود ہی یہ کہہ کر مشکوک ٹھہرا دیتے ہیں کہ۔ اَوْ کَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ (یا اور جیسا کچھ رسول اللہؐ نے فرمایا)

حیرت کا مقام ہے کہ جس ذخیرہ پر خود اپنا یقین نہیں کہ وہ اقوالِ رسول ہیں بھی یا نہیں۔ اسے کتاب لاریب یعنی قرآن کریم کی تفسیر بتایا جاتا ہے۔ یعنی غیر مشکوک کی تفسیر مشکوک سے۔ قطعی کی تفسیر ظنی سے۔ العجب ثم العجب۔

مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰى

احادیث و روایات کو وحی آلہی ثابت کرنے انہیں وحی خفی اور وحی غیر متلو ثابت کرنے کے لئے سورۂ والنجم کی ان آیات کو علمائے اہل حدیث کی طرف سے بڑے شد و مد سے پیش کیا جاتا ہے۔ اور ان سے ثابت کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ فیض ترجمان سے جو لفظ بھی ادا ہوتا تھا وہ وحی ہوا کرتا تھا۔ لہٰذا تمام احادیث وحی ہیں۔

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰى۔

سورۂ والنجم کی آیت ہے۔ اس سورۃ سے پہلے سورۂ طور اور اس کے بعد سورۂ قمر ہے۔ ان سورتوں میں زمین کی طرح چاند اور ستاروں کے پھٹنے یا ٹوٹنے کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے اپنے جلال کو دکھلاتا ہے۔ اور توحید کو ثابت کرتا ہے۔ لوگ ستاروں کی پرستش کیا کرتے تھے۔ ان سورتوں میں ستاروں کی حقیقت دکھلائی جا رہی ہے اور ثابت کیا جا رہا ہے کہ ان سب کا رب بھی خدا ہی ہے۔

وَ اَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى۔ (۵۳/۴۹)

اور یقیناً وہی شعریٰ ستارہ کا بھی پروردگار ہے۔

سورۂ طور میں دلیل کے طور پر پہلے کوہ طور کو جو ایک آتش فشاں پہاڑ تھا۔ شہادت میں پیش کیا ہے۔ اس سے زمین کی اندرونی آگ کا پتہ دیا گیا ہے۔ پھر اس کے بعد کِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ سے طبقات الارض کی کتاب کے رنگا رنگ عجائبات کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے پھر اس کے بعد خشکی و تری و ہوائی جانداروں کی معموری کا عالم

دکھایا ہے۔ پھر اس کے اوپر سقف مرفوع یعنی ایتھریل آسمان کا ذکر ہے۔ پھر اور اوپر بنیولا کے آتشیں سمندر پیش کئے گئے ہیں۔ ان نظاروں سے حق تعالیٰ کے جلال و جبروت کو دکھا کر عذاب کے واقع ہونے پر استدلال فرمایا ہے۔ پھر جزا و سزا کا تذکرہ فرما کر دکھلایا ہے کہ اس جزا و سزا کے دینے میں ہمارے ساتھ کسی اور کا کوئی دخل نہیں۔ پھر توحید کے ثبوت پیش کرکے بتایا ہے کہ اگر ہم آسمان سے کوئی ٹکڑا اتار دیں تو یہ لوگ اسے دیکھ کر اس بات کو نہ مانیں گے کہ ستاروں کی حقیقت یہ ہے بلکہ مذہبی تعصب کے ماتحت یہ کہدیں گے کہ یہ کوئی بادل جم کر گر پڑا ہے پھر سورت کے آخر میں فرمایا کہ ستاروں کے پیچھے یعنی ان کے زوال و غروب کے بعد یا ان کے مٹ جانے (غائب ہو جانے) کے بعد تسبیحیں کیا کر .. .. .. اس کے بعد ستارۂ ہدایت یعنی قرآن کریم کے نزول کو بطور دلیل شہادت میں پیش کرکے ارشاد کیا ہے۔ وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ‎(۵۳/۱)

شہادت ہے ستارۂ ہدایت یعنی قرآن کریم کے مندرجات کی۔
مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ ‎۝ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ‎۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ‎۝ عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ‎۝ ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَىٰ ‎۝ ‎(۵۳/۲-۶) تمہارا ساتھی نہ تو بہکا ہے نہ غلطی میں پڑا ہے۔ اور نہ خواہش نفسانی سے بول رہا ہے۔ نہیں ہے یہ مگر ایک (عالیشان) وحی۔ جو پوری حفاظت سے وحی کیا جاتا ہے۔ یہ اسے مضبوط قوتوں والے صاحب حوصلہ نے سکھایا ہے۔ .. ..

یہ رسول بہکا نہیں۔ یہ تمہارے ساتھ رہنے والا ہے تم جانتے ہو کہ اس کے ساتھ کوئی جنون نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اس نے کسی شیطانی آواز کو خدائی پیغام سمجھ لیا ہو۔ اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ خدائی پیغام کے لینے میں اس سے کوئی کمی بیشی ہو گئی ہو۔ (وَمَا غَوَىٰ)، جیسا حق تعالیٰ کی طرف سے

اتارا گیا ہے ویسا ہی اس کے دل پر اترا ہے۔ پس جو منہ سے بول رہا ہے۔ یہ تمہیں اپنی خواہش کے الفاظ نہیں سنا رہا۔ یہ الفاظ تو وحی ہیں جو پوری حفاظت کے ساتھ وحی کئے جاتے ہیں۔ یہ اس کی اپنی باتیں نہیں۔ یہ تو اسے مضبوط قوتوں والے صاحب حوصلہ نے سکھایا ہے۔

یہ سب صفات وحی الٰہی کی ہیں۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رایوں اور بشری عقل کی باتوں کو وحی نہیں فرمایا۔ یاد رہے کہ حق تعالیٰ غیر وحی (یعنی آنحضرتؐ کی ہر بات) کو وحی بتا کر خلاف واقعہ بیان کرنے کا مرتکب نہیں ہو سکتا (جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کو غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کرنے کی) اجازت دیدی اور آیت (۹/۴۳) میں تنبیہ نازل ہوئی کہ کیوں اجازت دیدی اور (۵۸/۱) میں حق تعالیٰ نے شوہر کے متعلق آپ سے جھگڑنے والی عورت کے حق میں فیصلہ دیا ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہاں حق تعالیٰ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کو جو سو فیصدی وحی نہیں تھے) وَحْیٌ یُّوحٰی کہہ رہا ہے (افسوس ہے کہ اہل حدیث حضرات سے ذات باری بھی محفوظ نہیں رہ سکی جو اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوحٰی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول کو وحی بتا کر آنحضرت کے ان اقوال و ارشادات کو بھی وحی قرار دیدیتے ہیں جنکی تردید خود حق تعالیٰ نے قرآن کریم ہی میں فرما رکھی ہے)

حاصل کلام حاصل یہ ہے کہ ان آیات میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جو غیر وحی کو وحی ٹھہراتا ہو۔ یہاں صرف ایک ہی حقیقی وحی کا بیان ہے۔ کسی ایسی بات کا کوئی ذکر بھی نہیں ہے جسے بمنزلہ وحی یا ہم پایۂ وحی قرار دیا گیا ہو۔ اگر کوئی غیر وحی بات سچیؐ ہو تو حق تعالیٰ اپنی وحی میں اس کی تصدیق تو فرما سکتا ہے جیسا کہ

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ
لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ

مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَ مُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۲۷/۴۸﴾ اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا تھا۔ تم ضرور ضرور انشاء اللہ مسجد حرام میں امن و اطمینان کے ساتھ اپنے سروں کو منڈائے ہوئے یا بالوں کو کترائے ہوئے داخل ہو کر رہو گے کہ تمہیں کوئی اندیشہ نہیں ہوگا۔ خدا کو وہ بات معلوم ہے جو تمہیں معلوم نہیں ہے۔ اس نے اس کے تھوڑے دنوں کے بعد ایک قریبی فتح رکھ دی ہے۔

یہ ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فتح مکہ والے خواب کی تصدیق فرما دی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ غیر وحی والی بات کو کبھی وحی کہہ کر خلاف واقعہ بیان کا مرتکب نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے آنحضورؐ کے خواب کی تصدیق تو فرما دی ہے۔ لیکن اسے وحی قرار نہیں دیا۔ ہر سچی بات ماننے کے لائق تو ہوتی ہے مگر ہر سچی بات وحی نہیں ہوتی۔

بندے تین طرح پر کام کرتے ہیں۔ **اوّل** وحی الٰہی کی صریح ہدایات کے مطابق۔ **دوم** عقلی تحقیقات و اجتہادات کے مطابق **سوم** اپنی ہوا (خواہش نفس) اور تمنا کے مطابق۔ ہویٰ اور تمنا کے کاموں میں شیطان (نفس امارہ کا) دخل ہوتا ہے۔ کیونکہ ان میں وحی اور عقل کے مطابق کام کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ اس سے بچنا لازم ہے۔ نیک وہ ہے جو

نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۷۹/۴۰﴾

نفس کو بری خواہش پر عمل کرنے سے روکتا ہے

اور فرمایا وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴿۳۸/۲۶﴾

اور نفسانی خواہشات کا اتباع نہ کرنا۔ وہ تجھے اللہ کی راہ سے گمراہ کر دیگا۔

اور جو کام اجتہاد سے کئے جاتے ہیں۔ ان میں اجتہاد کرنے والے سے اگر غلطی بھی ہو جائے۔ (بشرطیکہ ارادۃً نہ ہو) تو وہ اجر کے مستحق رہتے ہیں۔

لیکن وحی کی متابعت یقیناً نہایت ہی اعلیٰ چیز ہے۔ انبیاء علیہم السلام اصولاً وحی کے تابع ہوتے ہیں۔ اور وحی کی ہدایات کے مطابق عقل و شوریٰ سے بھی کام لیتے ہیں۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ (۳/۱۵۹)

توصحابہؓ کو معاف کیجئے (یعنی ان سے درگزر کیجئے) اور ان کے لئے خدا سے بخشش طلب کیجئے اور معاملات میں ان سے مشورہ کیجئے۔ تو جب آپ ایک رائے قائم کرلیں تو اللہ پر بھروسہ کیجئے (اور کام کر ڈالئے)

اور چونکہ وہ بشر ہی ہوتے ہیں۔ اس لئے کبھی الفت و عادت کے غلبہ سے کسی بات کی تمنا میں بھی پڑ جاتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے بیٹے کو طوفان سے بچانے کی تمنا میں پڑ کر۔

رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ (۱۱/۴۵)

اے میرے پروردگار! یقیناً میرا بیٹا تو میرے اہل میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے۔

کی التجاء حضور الٰہی میں پیش کر دی کیونکہ حق تعالیٰ نے شروع ہی میں یہ فرما دیا تھا۔

قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ آمَنَ ۚ (۱۱/۴۰)

اور ہم نے کہا (اے نوح!) کشتی میں ہر قسم کے حیوانات میں سے نر و مادہ دو دو کو اور اپنے اہل کو بجز ان کے جن کے متعلق پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہے اور مؤمنوں کو سوار کرلے۔

لیکن جواب ملا۔

يَا نُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ ۖ إِنَّهُ عَمَلٌ

غَيْرُ صَالِحٍ ۚ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۖ إِنِّيْ أَعِظُكَ أَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ٥ (۱۱/۴۶) —

اے نوح! تمہارا وہ بیٹا تمہارے اہل میں سے نہیں ہے کیونکہ وہ بلاشبہ غیر صالح عمل کرنے والا ہے۔ پس تم مجھ سے ایسا سوال نہ کرو جس کا تمہیں علم ہی نہیں اور میں نصیحت کرتا ہوں کہ (غلط تمنا میں پڑکر) جاہلوں میں سے نہ بن جاؤ۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیدارِ خداوندی کی تمنا میں پڑکر سرِ طور

رَبِّ أَرِنِيْ أَنْظُرْ إِلَيْكَ (۷/۱۴۳) میرے پروردگار مجھے اپنے کو دکھا دیجئے کہ میں آپکو دیکھ لوں۔

کی التجا کر دی۔ لیکن جواب ملا۔

لَنْ تَرٰنِيْ (۷/۱۴۳) تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکو گے۔

اب غور طلب یہ امر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے متعلق جو ایسے تمام واقعات قرآن کریم میں مذکور ہیں ان کی بشریت کو آفتاب نصف النہار کی طرح عیاں کر دیتے ہیں۔ فلہذا قرآن کریم پر غور و فکر کرنے والوں کے لئے مندرجہ بالا دو واقعات ہی اس امر کے لئے کافی ہیں کہ انبیاء علیہم السلام بشری تقاضوں سے مبرا نہیں تھے۔ اور ان کے وہ بشری اقوال و افعال ہرگز وحی نہیں تھے۔

قرآنِ کریم خالص وحی الٰہی ہے

قرآن کریم نہ بشری عقل کا نتیجہ ہے نہ اجتہاد و شوری کا بلکہ [redacted] تو محض وحی ہے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو کی گئی ہے۔ سورۂ والنجم کے شروع میں بتایا گیا ہے کہ قرآنی علوم، رسول اللہ کو صرف عقل سے معلوم نہیں ہوئے۔ بشری عقل تو بھٹکنے والی اور غلطیاں کر جانیوالی چیز ہے۔ لیکن ان علوم میں مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى تمہارا ساتھی نہ بھٹکا ہے نہ غلطی میں پڑا ہے۔ پس ایسے علوم جو ہر قسم کی اغلاط اور تضادات سے پاک ہوں

محض وحی ہی سے مل سکتے ہیں پھر یہ علوم انسانی خواہشات (ھویٰ) اور تمناؤں کا نتیجہ بھی نہیں، جیسا کہ فرمایا

مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی (۵۳/۳) اور ہمارا رسول ہمارے ذمہ لگا کر ہوائے نفس سے نہیں بولتا۔

اور جب یہ علوم نہ محض عقل سے معلوم ہوتے ہیں اور نہ یہ ھویٰ اور تمنا سے ہی مل سکتے ہیں تو پھر یہ ہیں کیا؟

اسی لئے ارشاد فرمایا

اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (۵۳/۴) یعنی یہ تو عالی شان وحی ہے جو وحی کی جاتی ہے اور وحی بھی کیسی؟

عَلَّمَہٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی (۵۳/۵) یہ وحی ایسی ہے جس کی تعلیم ہمارے رسول کو شدید قوتوں والے نے دی ہے۔

ذُوْ مِرَّۃٍ فَاسْتَوٰی (۵۳/۶) جو بڑے حوصلہ والا ہے پس وہ قائم ہوا۔

انبیاء کے اقوال و اعمال بھی خود اختیاری ہوتے تھے

حاصل یہ ہے کہ جو صفات حق تعالےٰ نے وحی کی بیان فرمائی ہیں۔ وہ سوائے قرآن پاک کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی اور قول و فعل کے نہیں ہو سکتے۔ رسول تو اپنے اقوال و افعال میں حالتِ ابتلاء میں ہوتے ہیں۔ اپنے اقوال و افعال کے جواب دہ بھی ہوتے ہیں۔ جیسے خود رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا اقرار سورۂ یونس میں درج ہے۔

اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۱۰/۱۵) اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔

یعنی اس امر میں ذرہ بھر بھی شک نہیں ہے کہ میں بھی اپنے اعمال کے لئے

حضور خداوندی میں جوابدہ ہوں۔ بیشک اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو میں بھی بڑے دن (یعنی قیامت) کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ وہ (انبیاء) بھی اپنے کاموں کے نتائج بشرط درستئ عمل ہی حاصل کر سکتے تھے۔ اور جسقدر اعمال کی درستگی ہو اس کے مطابق ہی انہیں ان کا پھل دیا جاتا تھا۔ جیسے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کمان میں جنگِ بدر میں باوجود انتہائی کمزوری اور قلت کے بے نظیر و بیمثال فتح نصیب ہوئی۔ لیکن جنگِ احد میں کچھ صحابہؓ کی عدم درستئ عمل کی بدولت خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں فتح شکست میں بدل گئی۔ سچ فرمایا ہے ذاتِ باری تعالیٰ نے

اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ (۱۳/۳۳) تو کیا جو خدا لئے کھڑا ہے ہر نفس پر جو کچھ اس نے کمایا ہے (انہیں چھوڑ دے گا؟ ہرگز نہیں) اور انہوں نے تو اللہ کے لئے شریک بنائے ہیں۔

اس کی گرفت سے بچنا ناممکن ہے وہ تو ہر نفس پر اس کی کمائی کے مطابق جزاء و سزا کے ساتھ کھڑا ہے۔

انبیاء کے ساتھ ایک مخصوص وعدۂ نصرت

ہاں! اللہ تعالےٰ کی رحمانیت کے کام الگ ہیں۔ جو سب سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۭ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ (۱۴/۱۳-۱۴) اور کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا، ہم ضرور تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے یا تمہیں ہمارے طریقہ پر واپس آنا ہوگا۔ سو

خدا نے انبیاء کی طرف وحی کی کہ ہم ان ظالموں کو ہلاک کردینگے اور تمہیں ان کے بعد اس ملک میں بسا دیں گے۔ یہ وعدہ اس کے لئے ہے جو میرے حضور میں (بروز قیامت جوابدہی کے لئے) کھڑے ہوئے اور میری وعید سے ڈرے۔

انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کئے گئے حق تعالیٰ کے اس مخصوص عہد رحمانیت کا اعادہ سورۂ مجادلہ میں

لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ (۵۸/۲۱) ضرور ضرور میں اور میرے رسول ہی غالب رہیں گے۔

کے الفاظ میں فرمایا ہے اس وعدہ کو علیٰحدہ رکھ کر باقی چیزوں کو دیکھئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے اعمال بھی اختیاری ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ بندوں کے اختیاری اقوال و افعال وحی آلٰہی نہیں ہو سکتے۔

باب سوم

اطیعو اللہ و اطیعوا الرّسول

قرآن کریم میں جا بجا جہاں حق تعالیٰ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم بھی دیا گیا ہے اس سے ہمارے علماء حضرات اہلِ حدیث نے یہ بات نکالی ہے کہ اللہ کی اطاعت تو قرآن کریم کے احکام کی تعمیل سے ہو جاتی ہے لیکن رسول کی اطاعت لازماً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے ارشادات یعنی احادیث کے ذریعہ سے ہی ہو سکتی ہے لہٰذا قرآن اور حدیث کی اطاعت ضروری ہو گی۔

اطاعت: ہم تفصیلی بحث کرنے سے پہلے یہ بات بتا دینا چاہتے ہیں

کہ ہم معاذ اللہ اطاعت رسول کے منکر ہرگز نہیں ہیں۔ اطاعت کے ہم بھی قائل ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہمارے نزدیک بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی قرآن مجید نے کسی بھی مسلمان کے لئے ضروری قرار دی ہے۔ لیکن ہماری اطاعت کے تصور میں اور عام علمائے اہلحدیث کے تصور اطاعت میں جو کچھ فرق ہے وہ صرف یہ ہے کہ عام علمائے اہل حدیث اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جس طرح اللہ کی اطاعت ضروری ہے بعینہ اسی طرح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بھی ضروری ہے۔ لیکن ہمارا موقف اس سلسلہ میں وہی ہے جو ہم شروع میں بیان کر چکے ہیں کہ حق تعالٰے خالق ہیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مخلوق ہیں۔ خالق کی اطاعت اور مخلوق کی اطاعت میں لازماً فرق ہونا چاہیئے۔ لہٰذا حق تعالیٰ کی اطاعت تو ویسی ہی کرنی ہوگی۔ جیسا کہ خالق کی اطاعت کی جانی چاہیئے۔ اور مخلوق کی اطاعت ویسی ہی کرنی ہوگی۔ جیسی مخلوق کی اطاعت کرنی چاہیئے، ہم نے وہیں کئی مثالیں دی تھیں مثلاً اللہ کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور والدین کا شکر ادا کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ لیکن دونوں کا شکر بالکل ایک جیسے طریقہ پر ادا نہیں کیا جا سکتا دونوں میں فرق کرنا ہوگا۔ قرآن کریم نے مسلمانوں کو خطاب فرماتے ہوئے بتایا ہے کہ تمہارا ولی اللہ بھی ہے اور اس کا رسول بھی ہے اور تمام مسلمان بھی ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ولایت (کارسازی) اور رسول کی ولایت اور مومنین کی ولایت کی ایک کیفیت نہیں ہے۔ اللہ کی کارسازی کی کچھ اور کیفیت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کارسازی اور مومنین کی کارسازی کی کچھ اور کیفیت ہے۔ اسی طرح اطاعت اور اطاعت میں بھی فرق ہے حق تعالیٰ کی اطاعت تو اسی طرح کرنی ہوگی جو آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے کے لائق ہے اور مخلوق کی اطاعت اسی طرح

کی جائے گی۔ جس طرح مخلوق کی اطاعت کی جاتی ہے۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔

اطاعت کے سلسلہ میں قرآنِ کریم نے اللہ اور رسول کی اطاعت کے ساتھ اُولوالامر (ماتحت حکام) کی اطاعت کا بھی حکم دیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ ماتحت حکام کی اطاعت کی وہ نوعیت نہیں ہو گی جو رسول یا اس کے بعد خلیفۂ رسول) کی ہے۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اِطاعت کی نوعیت بھی اللہ کی اطاعت سے مختلف ہو گی۔

کہا جاتا ہے کہ اللہ کی اطاعت اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ جیسا کہ اللہ کی نافرمانی باعثِ عذابِ الٰہی ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی بھی موجب عذاب آخرت ہے۔ لہٰذا دونوں کی حیثیت ایک سی ہے۔ سورۂ نور میں ہے۔

لَا تَجْعَلُوْا دُعَاءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (۲۴)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! رسول کے پکارنے کو تم آپس میں اسطرح نہ بناؤ جس طرح تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ یاد رکھو، اللہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے (جو محاذ جنگ سے) چپکے سے کھسک جاتے ہیں۔ تو جو لوگ رسول کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ ڈرتے رہیں کہ انہیں کوئی فتنہ نہ گھیرے یا انہیں دردناک عذاب نہ پہنچ جائے۔

اس آیت کریمہ کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ حضورؐ کے احکام کی مخالفت کرنے پر مبتلائے فتنہ ہونے کی نیز عذابِ الیم کی دھمکی دی گئی ہے جو قطعاً معصیت الٰہی کے مشابہہ ہے۔ لہٰذا دونوں میں فرق کرنا مشکل ہے لیکن

واقعہ یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں ایسا کوئی لفظ نہیں ہے جس سے ظاہر ہو کہ یہ مخالفتِ رسول ہی کا خاصہ ہے۔ دراصل یہ حکم ان لوگوں کے حق میں ہے جو کسی امر جامع (اجتماعی فرض) یعنی جہاد وغیرہ سے چھپ کر بلا اذن کھسک جایا کرتے تھے۔ اللہ کے رسول کا تو بڑا درجہ ہے ایک عام جنرل بھی اپنے سپاہیوں کو ایسا کہہ سکتا ہے۔ کیونکہ ایسے موقعوں پر بلا اذن چپکے سے کھسک جانے سے پوری قوم یا پوری فوج کو جو شدید نقصان پہنچ جاتا ہے اس کا مشاہدہ مسلمان جنگِ اُحد میں کر چکے تھے۔ وہ چالیس سپاہیوں کا ایک دستہ ہی تو تھا جو پہاڑی درہ پر تعینات کیا گیا تھا۔ کہ مسلمانوں کو فتح ہو یا شکست تم یہاں سے نہ ہٹنا۔ لیکن اس دستہ میں سے اکثر نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم کی مخالفت کی اور فتح ہو جانے کے بعد مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لالچ میں انہوں نے اس درہ کو چھوڑ دیا اور میدان جنگ میں مالِ غنیمت اکٹھا کرنے میں لگ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیتی ہوئی بازی ہار گئے اور ستّر کے قریب صحابہ شہید ہوئے۔ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم زخمی ہوئے اور شکست ہوتے ہوتے رہ گئی۔ بہر حال یہ ایسے موقع ہوتے ہیں کہ ہر کمانڈر کے حکم کی تعمیل ضروری ہوتی ہے۔ اور کمانڈر کی نافرمانی چونکہ اجتماعی مصیبت کا باعث ہوتی ہے۔ اس لئے باعثِ فتنہ اور موجبِ عذابِ الیم ہوتی ہے۔ یہاں آیتِ کریمہ میں آپ کے ایسے ہی احکام سے سرتابی کرنے والوں کو ڈرایا گیا ہے کہ دیکھو، اس مخالفت سے تمہیں کوئی تکلیف نہ پہنچ جائے اور تم دردناک عذاب میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔

اس آیتِ کریمہ میں یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ اس سرتابی کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا بلکہ یہ بتایا گیا ہے کہ ان باتوں کا خطرہ ہو سکتا ہے لہٰذا ان سے بچتے رہو اور اس میں احتیاط برتو فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ (مخالفت کرنے والے اس سے محتاط رہیں) یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ دوسری جگہ آنحضرت

صلے اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے۔

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْ بَعْضِ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (۵/۵۹)۔ اے پیغمبر! انکی خواہشات کا اتباع نہ کیجئے اور ان سے بچتے رہئے کہیں وہ آپ کو کسی ایسے حکم سے جو اللہ نے آپ کی طرف نازل فرمایا ہو منحرف نہ کر دیں۔

یعنی اے پیغمبر آپ ان مخالفین سے محتاط رہئے کہ کہیں وہ آپ کو مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ کے کسی حصہ سے بچلا نہ دیں۔ یہاں لفظ حذر سے احتیاط ہی سکھلائی گئی ہے۔ یہ مطلب تو نہیں ہے کہ آپ خدانخواستہ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ سے ضرور بچل جائیں گے یا آپ ان سے منحرف ہو چکے ہیں معاذ اللہ اب بتائیے کہ اس آیت میں کونسا ایسا حکم ہے جو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے۔ کیا رسول ہی مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ سے بچل سکتا ہے اور کوئی نہیں بچل سکتا۔ اسی طرح آیت زیر بحث میں کیا رسول کے احکام کی سرتابی ہی باعث مصیبت اور باعث تکلیف ہو سکتی ہے۔ کسی دوسرے کمانڈر اور جنرل کے حکم کی سرتابی سے اس کا کوئی احتمال نہیں ہے؟

اطاعت رسول اطاعت رسول کے معنے سمجھنے میں اکثر غلطی ہو جاتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ یہاں اس کی تشریح کر دی جائے۔ حقیقی وحی خواہ کتنی ہی قسم کی کیوں نہ ہو، وہ مخلوق کے کسی اختیاری دخل کے بغیر، محض تصرف الٰہی سے ہوتی ہے۔ ایسی وحی کی اطاعت بلاشبہ اللہ کی اطاعت ہے۔ اس میں رسولوں کا ذمہ صرف بلاغ ہی ہوتا ہے۔ مگر چونکہ یہ وحی رسول کے دل پر نازل ہوتی ہے اور ظاہر میں اس کی تبلیغ بھی وہ رسول ہی کرتا ہے۔ اس لئے ظاہری واسطہ کے اعتبار سے یہ رسول کی اطاعت کہلاتی ہے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ

اَنَّ اللّٰہَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۙ وَرَسُوْلُہٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّکُمْ غَیْرُ مُعْجِزِی اللّٰہِ (پ۱۰) یعنی اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حج اکبر کے دن یہ اعلان عام ہے کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بیزار ہیں سو اگر تم اے مشرکو توبہ کر لو تو وہ تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر منہ موڑو تو خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے اعلان کے الفاظ خود ہی تجویز فرما دیئے ہیں اور اپنے قرآن میں بھی درج کر دیئے ہیں۔ باوجودیکہ یہ اعلان صرف اللہ کی طرف سے ہے اور اس کے الفاظ بھی تجویز فرمودۂ الٰہی ہی ہیں۔ اور رسول کا اس اعلان اور اس کے الفاظ میں کوئی دخل نہیں۔ مگر چونکہ یہ کام رسول ہی کا تھا کہ وہ اپنے نمائندہ (آدمی) کو بھیجکر بحکم الٰہی اس اعلان کو عام لوگوں تک پہنچا دے۔ اور ان مشرکوں کا معاملہ بھی ظاہر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے پڑتا تھا۔ اس لئے حق تعالیٰ نے اس اپنے ہی اعلان کو اللہ اور رسول کی طرف سے اعلان فرمایا ہے۔ حالانکہ وہ اعلان صرف اللہ کا تھا۔ اور اللہ ہی کے قرآن میں اترا تھا۔ اور اللہ ہی کے لفظوں میں آیا تھا۔ اسی طرح ایک قرآن ہی کی اطاعت اصل حاکم کے لحاظ سے اللہ کی اطاعت کہلاتی ہے اور ظاہر تبلیغ کے لحاظ سے رسول اللہ کی اطاعت بھی کہلا سکتی ہے۔ کیونکہ وہ حکم قرآنی ہمیں رسول کے ذریعہ سے ملا ہے۔

قرآن کی اطاعت ہی اللہ و رسول کی اطاعت ہے

قرآن کریم میں بے شمار جگہ پہلے کچھ حکم دیئے جاتے ہیں۔ پھر ان ہی قرآنی احکام کو کہا جاتا ہے کہ اطاعت کرو اللہ اور اس کے رسول کی۔ حالانکہ حکم صرف ایک قرآن مجید ہی کے ہوتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہی قرآن، رسول کی اطاعت بھی کہلا سکتا ہے۔ حق تعالیٰ نے اپنے رسول کو فرمایا

قُلْ فَأْتُوا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ٥ (۲۸/۴۹) اے پیغمبر! آپ کہدیجئے کہ اگر تم سچے ہو تو اللہ کے نزدیک سے کوئی کتاب لے آؤ جو ان دونوں (قرآن اور تورات) سے زیادہ ہدایت والی ہو۔ میں اس کی پیروی کروں گا۔

یہ الفاظ خدا کے تھے اور خدا نے ہی رسول کی زبان سے کہلوائے تھے اس کے بعد حق تعالیٰ فرماتے ہیں

فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ (۲۸/۵۰) تو اے پیغمبر! اگر وہ تمہاری بات نہ مانیں تو سمجھ لیجئے کہ وہ صرف اپنی خواہشات ہی کی پیروی کرتے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں اسی بات کو جو حق تعالیٰ کی بات تھی اور حق تعالیٰ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے اپنے حکم سے کہلوائی تھی رسول اللہ کی بات قرار دیدیا گیا ہے۔ یعنی "تو اے پیغمبر! اگر وہ تمہاری بات نہ مانیں"۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدائی الفاظ جو بندے (یعنی رسول) کی زبان سے کہلوائے جائیں۔ وہ اس بندے (رسول) کی بات بھی کہلا سکتے ہیں۔ اسی طرح خود قرآن پاک کی نسبت بھی کہا جا سکتا ہے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (۶۹/۴۰، ۸۱/۱۹)

بیشک وہ (قرآن) رسول کریم کا قول ہے۔

حالانکہ ساری دنیا جانتی ہے کہ قرآن کریم خدا کا قول ہے۔ رسول کریم کا قول نہیں ہے۔ قرآن کریم نے ہی بار بار اس کا اعادہ کیا ہے کہ یہ قرآن ہم نے وحی کیا ہے۔ محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے اسے خود نہیں بنا لیا ہے اور بار بار تحدی فرمائی گئی ہے کہ اگر یہ کلام ہمارے رسول نے خود ہی بنا لیا ہے تو تم بھی اس جیسا کلام بنا لاؤ۔ اس جیسی دس

سورتیں بنا لاؤ، چلو، اس جیسی ایک سورت ہی بنا لاؤ۔ لیکن اس قدر تحدی اور چیلنج کے بعد خود قرآنِ کریم اپنے کو لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْم بھی بتا رہا ہے۔ وجہ وہی ہے کہ چونکہ حکم خداوندی سے یہ قرآن لوگوں تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے پہنچا ہے۔ اسلئے وہ قولِ الٰہی بھی ہے اور قول رسول بھی ہے۔

بعینہٖ یہی انداز بیان سورۂ ھود میں بھی اختیار کیا گیا ہے کہ اوّل تو یہ ارشاد ہوتا ہے

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (۱۱/۱۳)

کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ قرآن کو ہمارے رسول نے خود ہی گھڑ لیا ہے اے پیغمبر! کہدو کہ پھر تم بھی اس جیسی دس گھڑی ہوئی سورتیں لے آؤ اور اللہ کے سوا جسے تم بلا سکو بلا لو۔ اگر سچے ہو۔

اس آیت میں اس قدر زور سے تحدی کی جا رہی ہے کہ قرآن ہمارے رسول کا اپنا بنایا ہوا کلام نہیں۔ بلکہ خدا کا کلام ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اور تمام مؤمنین نے کفار کو حق تعالیٰ کا یہ چیلنج دیا۔ اس کے بعد اگلی آیت میں ہے۔

فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ (۱۱/۱۴)۔ تو اے مسلمانو! اگر وہ تمہارا چیلنج قبول نہ کریں تو سمجھ لو کہ جو کچھ نازل کیا گیا ہے وہ اللہ کے علم کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔

اب دیکھئے پچھلی آیت میں جو چیلنج دیا گیا تھا وہ حق تعالیٰ کا چیلنج تھا اور حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان سے (بحکم الٰہی) کفار کو دلوایا

گیا تھا۔ یہی چیلنج جہاں حضورؐ نے بحکم الٰہی دیا تھا۔ مسلمانوں نے بھی دیا تھا۔ چنانچہ اگلی آیت میں حق تعالیٰ نے اپنے چیلنج کو مسلمانوں کا چیلنج بتایا ہے کیونکہ آنحضرت سمیت وہ مسلمانوں کی زبان سے کہلوایا اور دلوایا گیا تھا۔ حاصل یہ کہ یہ بات اگرچہ خدا کے قرآن کی تھی مگر مؤمنوں کی زبان سے ہونے کے سبب مؤمنوں کی بات بھی کہلائی۔

اسی طرح جنوں نے صرف قرآن ہی سنا تھا اور اسی کی تبلیغ اپنی قوم کو کی تھی اور اسی کے متعلق اپنے لوگوں سے کہا تھا کہ۔

اَجِیۡبُوۡا دَاعِیَ اللّٰہِ (۴۶/۳۱) یعنی اللہ کے داعی کی بات مانو۔

یہاں اللہ کی یعنی قرآن کی بات ماننا، اللہ کے داعی (رسول اکرم) کی بات کو ماننا بتلایا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اس قسم کی اور بہت سی آیتیں بھی ہیں۔

حق تعالیٰ اپنے رسول کو خطاب کر کے فرماتے ہیں۔

وَاذۡکُرۡ فِی الۡکِتٰبِ مَرۡیَمَ ۘ (۱۹/۱۶)

کتاب میں مریم کا تذکرہ کیجئے۔

اور وَاذۡکُرۡ فِی الۡکِتٰبِ اِبۡرٰہِیۡمَ ۬ؕ (۱۹/۴۱)

کتاب میں ابراہیم کا ذکر کیجئے۔

وَاذۡکُرۡ فِی الۡکِتٰبِ مُوۡسٰۤی ۬۔ (۱۹/۵۱)

کتاب میں موسیٰ کا تذکرہ کیجئے۔

وَاذۡکُرۡ فِی الۡکِتٰبِ اِسۡمٰعِیۡلَ ۬۔ (۱۹/۵۴)

کتاب میں اسمٰعیل کا ذکر کیجئے۔

وَاذۡکُرۡ فِی الۡکِتٰبِ اِدۡرِیۡسَ ۬۔ (۱۹/۵۶)

کتاب میں ادریس کا ذکر کیجئے۔

اس کے مطابق ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم میں مریمؑ کا، ابراہیمؑ کا، موسیٰؑ، اسماعیلؑ، ادریسؑ کا، ذکر فرمایا ہے حالانکہ

وہ سارے ذکر ایک (اکیلے) خدا کی طرف سے ہی ہیں اور خود خدا کے قرآن میں ہی موجود ہیں۔ لیکن ان تمام آیات میں اس ذکر کی نسبت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف فرمائی گئی ہے۔

ایک ہی کام اللہ، رسول اور قرآن ہر سہ کی طرف منسوب

قرآن مجید میں ایک ہی کام حق تعالیٰ کا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کا بتایا گیا ہے۔ یعنی اسکی نسبت کہیں اللہ کی طرف کہیں رسول اللہ کی طرف اور کہیں قرآن کی طرف کی گئی ہے مثلاً گذشتہ امتوں یا انبیاء کے جو واقعات گذر چکے ہیں۔ عبرت و موعظت کی خاطر قرآن کریم ان کو بیان کرتا ہے لیکن اس بیان کی نسبت کہیں تو حق تعالیٰ خود اپنی طرف فرماتے ہیں۔ مثلاً

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَٰذَا الْقُرْآنَ (۱۲/۱)۔ اے پیغمبر! ہم آپ پر ایک بہترین قصہ بیان کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم نے ہی آپ پر یہ قرآن وحی کیا ہے۔

لیکن دوسری جگہ واقعاتِ گذشتہ کو بیان کرنے کی نسبت قرآن کی طرف فرمادی گئی ہے۔ چنانچہ سورۂ نمل میں ہے۔

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَقُصُّ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَكْثَرَ الَّذِي هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ۔ (۲۷/۶) بلاشبہ یہ قرآن بنی اسرائیل کے سامنے اکثر وہ قصے بیان کردیتا ہے جس میں وہ اختلاف کیا کرتے ہیں۔

پھر اسی بیان کی نسبت حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی فرمادی گئی ہے۔ چنانچہ سورۂ اعراف میں ہے۔

فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِن تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَث ۚ ذَّٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ

الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ج فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (پ ۹ ع ۱۲)۔ تو اس کی مثال کتے کی مثال جیسی ہے۔ اگر تم اس پر حملہ کردو تب بھی زبان لٹکا کر ہانپے اور اسے چھوڑ دو (کچھ نہ کہو) تب بھی ہانپے۔ یہ مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں۔ تو اے پیغمبر! آپ ان قصوں کو بیان کیجئے۔ شاید وہ (کچھ) غور و فکر کریں۔

واقعات و حالات کو بیان کرنے والے تینوں جگہ خود حق تعالیٰ ہیں۔ وہ اپنے ہی الفاظ میں بیان کر رہے ہیں۔ اور حق تعالیٰ کا یہ بیان اسی کے قرآن میں محفوظ بھی کر لیا گیا ہے لیکن بیان کی نسبت ایک جگہ خود حق تعالیٰ کی طرف ہے۔ دوسری جگہ قرآن کی طرف ہے۔ اور تیسری جگہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف۔ اسی طرح انذار، تبشیر، تبیین (ڈرانے، بشارت دینے، وضاحت کرنے) کی نسبت قرآن کریم میں کہیں خود حق تعالیٰ کی طرف ہے اور کہیں قرآن کی طرف ہے اور کہیں رسول اللہ کی طرف ہے۔ حالانکہ بات ایک ہی ہے۔ حاصل یہ کہ جس طرح لکھنے کی نسبت، لکھانے والے، اور قلم سب کی طرف صحیح ہو سکتی ہے۔ باوجودیکہ لکھت ایک ہی ہے۔ یہی حال یہاں ہے اور جس طرح قرآن مجید کا انذار و تبیین حق تعالیٰ کے انذار و تبیین سے کوئی زائد اور جدا بات نہیں دکھلاتا، یہی حال رسول کے انذار اور تبیین کا ہے۔ رسول کی ایسی اطاعت حقیقت کے لحاظ سے صرف خدا کی اطاعت ہے۔ چونکہ ہماری بحث صرف حقیقت کے لحاظ سے ہے اس لئے ہم نے رسول کی ایسی اطاعت سے قطع نظر کی ہے اور اس اطاعت کو محض اس کی حقیقت کے اعتبار سے صرف خدا کی اطاعت ہی بیان کیا ہے۔ سو اگر حضرات علمائے کرام کے نزدیک بھی یہی رسول کی اطاعت ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے تو چشم ما روشن دل ما شاد۔

لیکن اگر رسول کی اطاعت ان کے نزدیک خدا کی اطاعت سے الگ کوئی دوسری اطاعت ہے۔ تو وہ رسول کی بشری اور اختیاری عقل کی اطاعت ہی ہو سکتی ہے جو اپنی حد سے آگے نہیں نکل سکتی۔

اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول

اس جگہ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کے معنوں پر غور کر لینا ضروری ہے۔ ان پاک الفاظ کے معنی ہیں۔" اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی" اللہ کی اطاعت میں سب کا اتفاق ہے کہ اس سے مراد قرآن مجید کی اطاعت ہے۔ قرآن مجید خود بھی سورۂ نساء میں

فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (۴/۵۹)۔ تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔

کے پاک کلمات فرما کر (کہ اگر تمہارے درمیان کوئی تنازعہ آپڑے تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹایا کرو)۔ آگے خود اس کی تفسیر اس طرح کرتا ہے کہ

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا۔

(۴/۶۱) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کی طرف اور رسول کی طرف آؤ تو آپ منافقوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ آپ سے بری طرح رکتے ہیں۔

یعنی وہ آپ سے بدکتے اور بھاگتے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالٰی کی اطاعت کرنے اور اللہ کی طرف مقدمہ (کا فیصلہ) موڑنے سے مراد مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ یعنی قرآن مجید کی طرف آنا ہے۔ کیونکہ حق تعالٰی کی ذات کی طرف مقدمات کو لوٹانے کے تو کچھ معنے ہی نہیں ہیں۔ حق تعالٰی کی ذات کی طرف لوٹنے کا تو امکان ہی نہیں ہو سکتا۔ مقدمات کو خدا کے قانون ہی کی طرف لوٹایا جا سکتا ہے۔ یعنی قرآن کی طرف۔ لیکن رسول کی

جگہ دوسری آیت (۴/۵۹) میں بھی حق تعالیٰ نے رسول کا لفظ ہی رکھ دیا ہے۔ اب ہمارا ناقص خیال تو یہی ہے کہ جس طرح اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا کہ رُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ سے مراد رُدُّوْهُ اِلٰى مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ ہے یعنی قرآن مجید ہی کو سمجھنا لازم ہے اور اطاعتِ الٰہی کے معنی صرف قرآن مجید ہی کی اطاعت کے ہونے چاہئیں۔ اسی طرح رُدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ یا تَعَالَوْا اِلَى الرَّسُوْلِ (رسول کی طرف لوٹاؤ یا رسول کی طرف آؤ) سے بھی مراد رسول کی ذات یا اس کی شخصیت نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں اگر اللہ کی اطاعت سے مراد قانونِ الٰہی کی اطاعت یعنی مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ اور قرآن کی اطاعت ہے تو رسول کی اطاعت سے مراد بھی بدرجۂ ادنیٰ قانونِ الٰہی یعنی مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ اور قرآن کی اطاعت ہی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ رسول کی ذاتی اور شخصی اطاعت کے کوئی معنے نہیں ہیں۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ
ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳/۷۹)

کسی انسان کو یہ حق نہیں ہے کہ اللہ اسے کتاب، حکومت اور نبوت
عطا فرمائے پھر وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم اللہ کے بجائے میرے بندے
(میرے مطیع و فرمانبردار) بن جاؤ۔

خود اہل حدیث بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتی اور شخصی اطاعت کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک تو رسول کی اطاعت ہے ہی نہیں۔ وہ جو کچھ کہتا ہے وحی جلی سے کہتا ہے یا وحی خفی سے کہتا ہے۔ اس کی ہر بات مَا اُوْحِیَ اِلَیَّ یا مَا اُنْزِلَ اِلَیَّ ہوتی ہے ان کے خیال میں تو نبی کا کوئی قول بشری عقل و اختیار کے ماتحت ہوتا ہی نہیں۔ لہٰذا ہم تو نبی کی انتظامی اور عقلی اطاعت کے بھی قائل ہیں مگر علمائے اہلِ حدیث تو اس کے بھی قائل نہیں۔ لہٰذا رسول کی اطاعت (پیغام لانے والے کی اطاعت) سے مراد بھی پیغام یعنی وحی الٰہی کی اطاعت ہی ہے اور وحی الٰہی کی اطاعت باعتبار حقیقت کے صرف خدا ہی کی اطاعت ہے لہٰذا

اطاعتِ رسول سے بھی مقصود صرف اللہ کی اطاعت ہی ہوئی۔ اور یہ مسلّم ہے کہ اللہ کی اطاعت سے مراد صرف قرآن مجید کی ہی اطاعت ہے۔ پس اطاعتِ رسول کے معنے بھی یہی ٹھہرے کہ قرآن مجید کی ہی اطاعت کرو۔ (جو اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ نازل فرمایا ہے۔

اس طرح أَطِيعُوا اللهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ کے یہ معنے ہوں گے کہ اطاعت کرو اللہ کی بلحاظ اصل حاکم اور منزّل قرآن (قرآن کو نازل کرنے والے) ہونے کے اور اطاعت کرو رسول کی بلحاظ اس قرآن کو لانیوالا واسطہ ہونے (مُنَزَّلِ عَلَيْهِ) کے۔ مطلب یہ کہ قرآن مجید کی اطاعت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اصل مُطَاع نہ جانو۔ اگرچہ قرآن مجید کو ماننے میں تمہیں بظاہر رسول ہی کی اطاعت کرنی پڑتی ہے۔ (کیونکہ قرآن خدا نے تمہیں براہِ راست نہیں دیا بلکہ رسول ہی کے ذریعے دیا ہے)

اس معنے کی رو سے، اگر اکیلے اللہ کا حکم فرمایا جائے تو بھی قرآن مجید ہی مراد ہوگا۔ اور اگر نرا اطیعوا الرسول ہی کہا جائے تو بھی اس سے قرآن ہی مقصود ہوگا۔ اور اگر فَاتَّبِعُونِي کا فرمان ہو تو بھی اس سے قرآن مجید ہی سمجھا جائیگا۔ مؤمن آلِ فرعون نے حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی موجودگی میں کہا تھا

يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ (۴۰/۳۸) یعنی اے میری قوم! میرا اتباع کرو۔

اس سے اس مؤمن کا منشا، یہ تو ہرگز نہیں تھا کہ میری اطاعت کرو، بلکہ مُنَزَّل من اللہ کی اطاعت مقصود تھی۔ یہ تمام تشریح صرف اس صورت میں ہوگی جبکہ رسول کی اطاعت اور خدا کی اطاعت کو ایک ہی قرار دیا جائے۔

لیکن اگر رسول کی اطاعت، اللہ کی اطاعت سے جدا کیفیت والی سمجھی جائے۔ تو بالضرور اس سے دو اطاعتیں ثابت ہوں گی۔ لیکن قرآن کی روسے اصل صاحبِ اطاعت اور اصل مطاع ایک ہی ہے۔ الگ الگ دو مستقل اطاعتیں اور جدا جدا دو برابر کے مطاع قرار دینا شرک فی الحکم ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے۔

اِنِ الحُکمُ اِلاَّ لِلّٰہِ (پ ۷ع ۱۴) اللہ کے سوا کوئی حاکم ہے ہی نہیں۔
ہم نے شروع سے ہی یہی معنے مدنظر رکھ کر بحث اٹھائی ہے اور یہی معنے تمام اہلِ حدیث علماء کے نزدیک بھی مسلّم ہیں۔

رسول کی تنہا حیثیت یہی ہو سکتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے وحی پاکر ابتداءً لوگوں کو پہنچا دے۔ اس کے سوا اس کے باقی تمام اقوال وافعال اور کوششیں وہی ہوتی ہیں جنکو وہ مکلّف، منتظم اور جوابدہ ہونے کی بشری حیثیت سے کرتا ہے۔ اس حیثیت والی کوششیں دوسروں کو بھی اپنے اپنے موقعہ پر کرنی ضروری ہوتی ہیں اور اسی حیثیت کے لحاظ سے رسول کے خلفاء اور جانشین بھی ہونے ضروری ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ رسول کا خاص کام اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی وحی کا پہنچا دینا ہے۔

خواہ وہ جلی ہو اور خواہ بقول اہل حدیث خفی ہو۔ سب حق تعالیٰ کی طرف سے ہی ہوتی ہے۔ اور رسول ہر صورت میں یکساں مبلغ ہے۔ جب بات یہ ہے۔ تو کسی وحی کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت سمجھنا اور کسی وحی کی اطاعت کو رسول کی اطاعت قرار دینا محض خانہ سازبات ہے۔ جو بات بشر کے اپنے فہم و اختیار کے دخل کے بغیر، محض تصرف الٰہی سے حاصل ہوتی ہے وہ صرف اللہ (اور صرف) اللہ تعالیٰ کی ہی اطاعت ہو سکتی ہے۔

حضرات اگر ہم ایک آیت کا ترجمہ بھی کر کے لوگوں کو پہنچا دیں یا کسی آیت کی صحیح تفسیر بھی کر دیں تو اس کا ماننا قرآن کی ہی اطاعت رہتا ہے کچھ ہماری اطاعت نہیں بن جاتا۔ پھر جس کا ترجمہ اور تفسیر بھی محض حق تعالیٰ کے ہی دخل اور تصرف سے مانا جائے۔ اس کی اطاعت کیسے حق تعالیٰ کے علاوہ دوسری اطاعت ہو سکتی ہے۔ دوسری اطاعت تو وہ صرف اس صورت میں کہلا سکتی ہے جبکہ اس میں اس کی اپنی عقل و رائے کا بھی دخل ہو۔ پس اگر رسول کی اطاعت خدا کی اطاعت سے جدا دوسری اطاعت ہے تو وہ ضرور حضورؐ کی اپنی عقل و رائے کی اطاعت ہے یہ اطاعت

بھی دین میں اپنے موقعہ پر ضروری ہوتی ہے اور ہماری بشری عقل ورائے وکوشش کے لئے رسول اسی میں نمونہ بن سکتا ہے۔ لیکن اس اطاعت کو وحی الہٰی کا درجہ کبھی نہیں دیا جا سکتا۔ اسی بات کو مدِ نظر رکھنے کے لئے ہم نے شروع میں ہی عرض کر دیا تھا۔ کہ وحی کی اطاعت خاص حق تعالےٰ کی اطاعت ہے۔ اور جس اطاعت میں بشری عقل و اختیار کا دخل ہوتا ہے وہی اطاعت ٹھیک طور پر بشری اطاعت کہلا سکتی ہے۔

اِطاعتِ رسول

اطاعتِ رسول پر حضرات علمائے اہلِ حدیث کیطرف سے اتنا زور دیا جاتا ہے کہ جیسے اطاعت رسول کا کوئی منکر ہو اور اسے قائل کرنا ہو۔ اطاعت کے متعنے فرمانبرداری کے ہیں۔ فرمانبرداری تو آدمی اپنی زندگی میں معلوم نہیں کتنوں کی کرتا ہے۔ خود قرآنِ کریم بھی فرمانبرداری اور اطاعت کا مختلف لوگوں کے لئے تذکرہ کرتا ہے۔ کفایتِ قرآن کے قائلیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور فرمانبرداری کے منکر تو نہیں ہیں۔ وہ تو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے علاوہ قرآنی حکم کے مطابق حکمرانوں کی، عدالتوں کی، حکموں کی، ماں باپ کی، شوریٰ نیز اور بھی کتنوں کی اطاعت کرتے ہیں۔ اور ان کی معروف اطاعت پر فخر کرتے ہیں۔

اہلِ ایمان کے تذکرہ میں قرآن کریم کہتا ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ (۹/۷۱)۔ اور مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ معروف کا حکم دیتے ہیں۔ منکر سے روکتے ہیں۔ نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ مسلمان مرد اور عورتیں ایک دوسرے کو معروف کا حکم اور منکر

سے منع مذاق کرنے کے لئے تو نہیں کرتے تھے۔ وہ معروف کا حکم اس لئے دیتے تھے کہ دوسرے ان کی بات مانیں اور جیسا وہ کہتے ہیں ویسا کریں۔ منکر سے اس لئے روکتے تھے کہ وہ برائیوں سے رکیں۔ اسی کو تو اطاعت کہتے ہیں۔ تو اطاعت تو اچھی بات میں ہر مسلمان ایک دوسرے کی کرتا ہی ہے۔

پھر ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ہ (۳۰/۲۳) لیکن جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیا اور ایک دوسرے کو حق کی اور صبر کی وصیت کی (وہ خسارہ میں نہیں ہوں گے)

یہ مومنین ایک دوسرے کو حق کی اور صبر کی وصتیں مذاق اڑوانے کیلئے تو نہیں کرتے تھے۔ وصیت تو اسی لئے کی جاتی ہے کہ اس کی تعمیل کیجائے۔ خود حق تعالیٰ جل شانہٗ حضرت انسان کو یہ وصیت فرما رہے ہیں کہ

وَاتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ ج ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ فَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ہ (۳۱/۱۵) جو میری طرف رجوع کرتا ہے اسی کے راستہ کی پیروی کر۔ پھر تم سب کو میری ہی طرف لوٹنا ہے تو میں تمہیں بتادوں گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔

جو اللہ کی طرف رجوع کرنے والے ہوں ان کے راستہ کی پیروی کرنا حق تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ اور محمود ہے بلکہ ان کی راہ کی پیروی کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ ان کی راہ کی پیروی ان کی اطاعت نہیں تو اور کیا ہے۔ اس کے علاوہ اہل ایمان کے راستہ پر چلنے کی بھی تاکید فرمائی جا رہی ہے۔

وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰی وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی

وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ (۴/۱۱۵) اور جو رسول کی مخالفت کرے
اس کے بعد کہ اس پر ہدایت واضح ہو چکی ہے۔ اور مسلمانوں کے
راستہ کو چھوڑ کر دوسرے راستہ کی پیروی کرے تو ہم اسے
اُدھر ہی پھیر دیں گے جدھر وہ پھر رہا ہے اور جہنم میں داخل
کر دیں گے۔

یہاں مسلمانوں کے راستہ کے اتباع نہ کرنے پر کسقدر سخت وعید دی جارہی ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی کے راستہ کی پیروی کرنے کے معنے اس کی اطاعت کرنے کے ہی ہیں۔

بے دین لوگوں کے اس فعل سے ڈرایا گیا ہے کہ انہیں جو لوگ انصاف کرنے کا حکم دیتے ہیں وہ ان کی بات نہیں مانتے بلکہ انہیں قتل کر دیتے ہیں۔ ان کا انجام اچھا نہیں ہو سکتا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ
بِغَیْرِ حَقٍّ وَّیَقْتُلُوْنَ الَّذِیْنَ یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ
فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (۳/۲۱) یقیناً جو لوگ اللہ
کی آیتوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں، انبیاء کو ناحق قتل کر دیتے ہیں۔
اُن عام لوگوں کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔ جو انہیں انصاف پر قائم رہنے
کا حکم دیتے ہیں تو (اے پیغمبر!) انہیں دردناک عذاب کی
بشارت دے دیجئے۔

ظاہر ہے کہ جو عام لوگ انصاف پر قائم رہنے کا حکم دیں اور ہم ان کی بات نہ مانیں۔ بلکہ اُلٹا انہیں قتل کر دیں۔ یہ نافرمانی ہی کی بدترین شکل ہے۔ وغیرہ وغیرہ

ان تمام آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر انبیاء کی بھی معروف اطاعت لازم ہے۔ اسی طرح خود رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے

متعلق بھی قرآن کا ارشاد ہے کہ رسول کی اطاعت بھی طاعۃ معروفۃ ہے اور وہ معروف ہی میں چاہی گئی ہے۔ اس کے لئے ذیل میں دو آیتیں پیش کی جاتی ہیں۔

اوّل:۔ سورۂ النور میں ہے۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ۭ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (۲۴/۵۳)۔ اور انہوں نے بڑی شدومد سے قسمیں کھائیں کہ اگر آپ (اے پیغمبر!) انہیں حکم دیں گے تو وہ (جہاد کے لئے) ضرور نکلیں گے۔ (اے پیغمبر!) آپ کہہ دیجئے کہ قسمیں مت کھاؤ۔ یہ تو دستور کے مطابق ایک فرمانبرداری ہے اور بس یقیناً جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے خوب واقف ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بھی "طاعۃ معروفۃ" ہے اور وہ معروف ہی میں چاہی گئی ہے۔

دوم:۔ سورۂ ممتحنہ میں ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَاۗءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓي اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَـيْـــًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۔ اے پیغمبر! جب آپ کے پاس ایمان لانے والی عورتیں آپ سے ان باتوں پر بیعت (عہد) کرنے کے لئے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک نہیں ٹھہرائیں گی، نہ چوری کریں گی نہ زنا کریں گی۔ نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی، نہ وہ بہتان

لگائیں گی جسے اپنے ہاتھوں اور پیروں کے درمیان باندھ لیں (یعنی کسی دوسری کی اولاد لے کر، اسے اپنے خاوند کی اولاد نہیں بنا دیں گی۔ یا دیدہ و دانستہ اپنی طرف سے بہتان بنا کر کسی پر نہیں لگایا کریں گی) اور نہ معروف یعنی معقول اور دستور کے مطابق اچھی باتوں میں آپ کی نافرمانی کریں گی۔ تو آپ ان سے بیعت (اقرار و پیمان) لے لیں۔ اور ان کے لئے اللہ سے بخشش کی دعائیں بھی مانگیئے۔ یقیناً اللہ بڑا بخشنے والا اور رحم والا ہے۔

اس سے رسول کی اطاعت کے معنے صاف طور پر معلوم ہو جاتے ہیں۔ عقلی اطاعت بھی نہایت ہی ضروری ہے۔ ماں باپ کی اور استادوں کی فرمانبرداری، منصفوں اور ججوں کی اطاعت، بادشاہوں اور خلفا کی اطاعت، حکام کی اطاعت کے بغیر دنیا جہان کا انتظام ہی قائم نہیں رہ سکتا۔ حضرات علمائے کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقلی اور انتظامی اطاعت کو (جو آپؐ کی زندگی تک محدود تھی)، وحی قرار دے کر، عقلی اطاعت اور انتظامی فرماں برداری کی قدر بالکل ضائع کر دی۔ ان کے نزدیک رسول اللہؐ کی عقلی و انتظامی اطاعت نہ فرض ہے نہ واجب، لہٰذا یہ اطاعت جو آگے آپ کے بعد خلفاء کی طرف منتقل ہونی تھی۔ اس کا پتہ ہی کٹ گیا۔ لیکن علمائے اہلِ حدیث کا اصرار ہے۔ کہ رسول بحیثیت بشریت ہماری طرح ایک مخلوق ہوتا ہے۔ جس کی اطاعت نہ فرض ہے نہ واجب مگر بوصف رسالت اور بحیثیت نبوت شان یہ ہے کہ اس کی اطاعت بعینہٖ خدا کی اطاعت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء اور امراء ظاہر ہے کہ نہ رسول تھے نہ نبی۔ لہٰذا ان میں وصف رسالت اور حیثیت نبوت نہ ہونے کی وجہ سے ان کی اطاعت نہ فرض ہے نہ واجب۔ ان پر صبح وشام ہمیں تبرا بھیجتے رہنا چاہیئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن یاد رکھیئے قرآن کریم قیامت تک کے لئے مسلمانوں کے واسطے

ایک ابدی ضابطۂ ہدایت ہے۔ اس میں بے شمار جگہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے (النبی۔ اور الرسول کے الفاظ سے) مختلف احکام دیئے گئے ہیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں ان کا مصداق خود آنحضورؐ کی ذات اقدس واطہر تھی۔ اور آپ کی وفات کے بعد ان احکام کا مصداق آپ کے خلفاء کرام ہیں ذیل کے قرآنی احکام پر غور فرمائیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد وہ احکام ختم اور بے اثر تو نہیں ہو گئے۔ بلکہ وہ آپ کے خلفاء راشدین کی طرف منتقل ہوتے رہیں گے اگر انہیں آپ کی وفات کے بعد آپ کے جانشینوں کی طرف منتقل نہیں ہونا تھا اور وہ آپ کی آنکھیں بند ہوتے ہی بے کار ہو جانے تھے۔ تو خدا کی اس کتاب عظیم میں جو قیامت تک کے لئے ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گی۔ ان احکام کو محفوظ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی وقتی چیزیں وقتی ہی ہوتی ہیں۔ وہ ہمیشہ کے لئے یوں محفوظ نہیں کی جاتیں۔ مثلاً

(۱) حق تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْھَرُوْا لَہٗ بِالْقَوْلِ کَجَھْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ (پ ۲۶)۔ اے پیروانِ دعوت ایمانی! نبی کی آواز پر اپنی آوازوں کو بلند نہ کرو۔ اور ان کے ساتھ زور زور سے باتیں نہ کیا کرو۔ جیسا کہ تم آپس میں ایک دوسرے زور زور سے باتیں کرتے ہو۔ کہیں تمہارے اعمال ہی غارت نہ ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ حکم نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی خاص نہیں تھا۔ اور یہ حکم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بیکار اور ناکارہ نہیں ہو گیا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ اس آیت کریمہ میں ہمیں تعلیم دی گئی ہے کہ سربراہِ مملکت کے ساتھ ہمیں کس طرح پیش آنا چاہیئے۔ اور کس طرح اس کا ادب و احترام ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ اس آیت کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا تو ادب و احترام کرنا اور اس کے بعد جو آپ کے جانشین، خلفاء، سربراہانِ مملکت ہوں تو ان کا ادب و احترام ملحوظ رکھنے کی ضرورت نہیں، ان کے ساتھ تو، تڑاق سے باتیں کیا کرنا۔ اس کے بعد آیت نمبر (۴۹/۵) تک سربراہِ مملکت کے لئے کیا کیا آداب ملحوظ رکھنے چاہئیں۔ ان سب کا بیان چلا گیا ہے۔ اور وہ سب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے نام سے ہی دیئے گئے ہیں۔ مگر آپ کیساتھ مخصوص نہیں۔

(۲) بعض نادان اور غیر شائستہ اعرابیوں (بدوؤں) نے جس طرح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو مِنۡ وَّرَآءِ الۡحُجُرٰتِ (۴۹/۴) پکارا تھا اور جس سے ممانعت فرمادی گئی تھی) اب بھی وہ ناشائستہ حرکت اپنے بڑوں اور حاکموں اور سربراہان مملکت کے ساتھ منع ہے۔ یہ حکم رسول اکرم کی وفات کے ساتھ جاتا نہیں رہا۔ اب بھی اسی ادب و احترام کی پابندی لازم ہے۔

(۳) سورۃ النور میں ہے۔

لَا تَجۡعَلُوۡا دُعَآءَ الرَّسُوۡلِ بَیۡنَکُمۡ کَدُعَآءِ بَعۡضِکُمۡ بَعۡضًا ؕ (۲۴/۶۳)

اے مسلمانو! آپس میں رسول کو ایسے نہ پکارو، جیسے تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔

یہ حکم بھی رسولِ اکرم کی وفات کے بعد آپؐ کے ساتھ ہی چل نہیں بسا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی آپ کے خلفاء، اعلیٰ حکام،

سربراہان مملکت کا ایسا ہی ادب اور احترام لازم ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰۤى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ (۲۴/۶۲)

ایماندار وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئیں اور (اتنا ہی نہیں بلکہ ساتھ ہی یہ بھی کہ) جب وہ کسی ایسے کام میں رسول کے ساتھ ہوں۔ جس میں سب کا جمع ہونا ضروری ہو (کوئی اجتماعی کام ہو) تو وہاں سے جب تک رسول سے (باقاعدہ) اجازت نہ لے لیں چلے نہیں جاتے۔

اب بھی امر جامع کے متعلق یہی حکم ہے کہ کسی ایسے اجتماع میں جس میں آپ کی شرکت ضروری ہو۔ اجتماع کے منتظم اور صدر سے پوچھے بغیر آپکو اجتماع سے چلے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ آج بھی اسے بدتمیزی سمجھا جاتا ہے۔ ایسی تمام آیتوں میں رسول سے مُراد خود رسولِ اکرم اور آپ کی وفات کے بعد نائب رسول، (خلیفہ یا سربراہ) ہے۔

(۵) خود ہمارے عام مفسرین اس قسم کی آیاتِ کریمہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں اس قسم کے احکام کا مخاطب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کی وفات کے بعد آپ کے نائب کو قرار دیتے ہیں۔ مثلاً صلوۃ الخوف کے سلسلہ میں قرآن کریم میں صاف طور پر فرمایا گیا ہے کہ اس ترتیب سے صلوۃ الخوف اس وقت پڑھی جائے گی۔

وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ (۴/۱۰۲)

جب اے پیغمبر! آپ ان میں موجود ہوں اور آپ انہیں نماز پڑھائیں۔

لیکن تمام فقہاء اور تمام مفسرین اس پر متفق ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ حکم آپؐ کے نائب کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔ اور اس طریقہ سے ہر امام شکر نماز پڑھا سکتا ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس کے مخاطب آپ تھے اور آپ کی وفات کے بعد جو آپ کا نائب اور قائم مقام ہو وہ اس کا مخاطب ہے۔

(۶) خیرات کے سلسلہ میں سورۂ بقرہ میں بتایا گیا ہے کہ یہ ان ضرورت مندوں کا حق ہے جو اللہ کی راہ میں روک دیئے جائیں۔ وہ ملک میں کہیں چل پھر نہ سکتے ہوں۔ کسی سے مانگتے بھی نہ ہوں۔ ناواقف لوگ انہیں بڑا مالدار سمجھتے ہوں۔ لیکن

تَعْرِفُهُمْ بِسِيمٰهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ط

(۲/۲۷۳)۔ اے پیغمبر! آپ اُنہیں اُن کے چہروں سے پہچان لیں گے۔ وہ لوگوں سے لپٹ لپٹ کر نہیں مانگتے۔

لیکن عام مفسرین اس حکم کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے خاص نہیں مانتے کہ رسول اللہ ہی ایسے لوگوں کو پہچان سکتے تھے۔ آپ کے بعد جو صدقات تقسیم کرنے والے ہوں وہ بھی پہچان سکتے ہیں۔

(۷) سورۂ آلِ عمران میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو صحابہ سے مشورہ فرمانے کا حکم دیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے۔

وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ط

(۳/۱۵۹)۔ اے پیغمبر! مملکت کے معاملات میں ان سے مشورہ کیجئے۔ تو جب آپ کسی فیصلہ پر پہنچ جائیں تو اللہ پر بھروسہ کیجئے اور (اقدام کر لیجئے)۔

آیت کریمہ میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ جب آپ کسی فیصلہ پر پہنچ جائیں۔ جب آپ کوئی رائے قائم کر لیں تو اللہ پر بھروسہ کر کے عملی قدم اٹھا لیجئے۔ اس موقعہ پر تمام مفسرین

اور فقہاء ہم زبان ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ یہ حکم مخصوص نہیں ہے بلکہ آپ کے بعد ہر سربراہِ مملکت مشورہ ضرور کریگا۔ اور مشورے کے بعد جب امام یا سربراہ ایک رائے قائم کرلے تو خدا پر بھروسہ کرکے اس کے مطابق اقدام کرسکتا ہے۔

(۸) سورۂ جمعہ میں ہے کہ جب آپ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ (شام سے غلّہ کا) ایک کاروان آگیا تو کچھ لوگ غلہ خریدنے کے لئے دوڑ کر چلے گئے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَۃً اَوْ لَھْوًا انْفَضُّوْا اِلَیْھَا وَ تَرَکُوْکَ قَآئِمًا قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰہِ خَیْرٌ مِّنَ اللَّھْوِ وَ مِنَ التِّجَارَۃِ ط (۱۱/۶۲)۔ اور جب وہ کوئی تجارت یا تماشے کو دیکھتے ہیں تو اس کی طرف تتر بتر ہوجاتے ہیں اور آپ کو کھڑا ہوا چھوڑ دیتے ہیں۔ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس تماشے اور تجارت سے کہیں بہتر ہے۔

اس آیت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم خطبہ کے لئے کھڑے ہوں۔ تو لوگوں کو دینوی کاموں کے لئے خطبہ چھوڑ کر چلے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن فقہاء اور مفسرین متفق ہیں کہ آنحضرت کے بعد یہی حکم ہر امام کا ہے کہ جب وہ خطبہ دے رہا ہو تو سامعین کو اطمینان وسکون کے ساتھ خطبہ سُننا واجب ہے اور دینوی کاموں کے لئے خطبہ چھوڑ کر چل دینا جائز نہیں ہے۔

ان آٹھ مثالوں پر اکتفاء کرتے ہوئے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ عقلی اور انتظامی اطاعت حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی آپ کی حیاتِ طیبہ میں انتہائی ضروری تھی اور یہ اطاعت آپ کی وفات کے بعد آپ کے خلفاء کی طرف منتقل ہوگئی ہے۔ عقلی اور انتظامی اطاعت

جیسا کہ آپ کی حیاتِ طیبہ میں آپ کی ضروری تھی، آپ کی وفات کے بعد آپ کے خلفاء کی بھی ضروری ہے اور ہر سربراہِ مملکت کی ضروری ہے۔

دو قسم کے احکام دنیاء اسلام میں دو قسم کے قانون ہو سکتے ہیں ایک الٰہی قانون اور دوسرے وہ قانون جو شوریٰ اور اجتہاد سے وقتاً فوقتاً بنائے جاتے ہیں۔ ان دونوں کے موجود ہوتے ہوئے بسا اوقات لوگ ان کی بناء پر آپس میں خود فیصلے نہیں کر سکتے۔ فریقین میں سے ایک یا دونوں، اکثر غلطی سے یا خود غرضی اور شرارت سے قانون کے ٹھیک منشاء پر اتفاق نہیں کر پاتے یا جھوٹ بول کر یا دھوکہ دیکر صورت معاملہ کو کچھ کا کچھ کر دکھلاتے ہیں۔ اور یوں دوسرے کا حق مارنا چاہتے ہیں۔ اس قسم کی تمام حالتوں میں لازم ہوتا ہے کہ باہمی جھگڑوں کو چکانے کے لئے قانون کے ساتھ اولوالامر یعنی حکام بھی ضرور ہوا کریں۔ اور یہ حاکم ہمیشہ زندہ اشخاص ہی ہونے چاہئیں۔ قبروں نے ان جھگڑوں کا فیصلہ کبھی کرایا ہے نہ کرا سکتی ہیں۔

یہ حاکم بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک ماتحت حکام (ابتدائی عدالتیں) جن کے فیصلہ کی اپیل ہو سکتی ہے۔ دوسرے اعلیٰ حکام جن کا فیصلہ آخری ہوتا ہے۔ آخری فیصلے کی اپیل کا کوئی حق باقی نہیں رہنا چاہیئے ــــ ورنہ مقدمات شیطان کی آنت کی طرح دراز تر ہوتے جائیں گے۔ اور پشتہا پشت تک جاری رہیں گے۔ اور امن و امان اور ملکی و قومی انتظام کے قیام کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی۔ ہمیں اپنے باہمی جھگڑوں میں فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ (۴/۶۵) جو کچھ ان کے باہمی جھگڑے ہوں۔ اعلیٰ حاکم کے آخری فیصلہ کے سامنے کسی تنگی کو محسوس کئے بغیر کشادہ دلی کے ساتھ سر تسلیم خم کر دینا لازم ہے۔ سورۂ نساء میں ارشاد ہوتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا
بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ

اَنْ یَّتَحَاکَمُوْا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ
یَّکْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَیُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّهُمْ
ضَلٰلًاۢ بَعِیْدًا ۝ (۴/۶۰) ۔ اے پیغمبر! آپ نے ان
لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس پر بھی
ایمان لائے ہیں جو آپ پر نازل کیا گیا ہے اور اس پر بھی جو
آپ سے پہلے نازل کیا گیا (یعنی توراۃ و انجیل پر بھی)
(لیکن وہ اپنا کسی حکومت کے ماتحت ہونا دکھلا کر حکام کے
انتظام میں خلل ڈالتے ہیں اور فساد کی نیت سے) طاغوت یعنی
سرکشوں کے سامنے اپنے مقدمات لے جانا چاہتے ہیں (تاکہ امن
کی حکومت کی مخالفت کریں) حالانکہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ
وہ طاغوت یعنی سرکشوں کو نہ مانیں اور شیطان تو یہی چاہتا
ہے کہ انہیں دور کی گمراہی میں مبتلا کر دے۔

وہ ان الٰہی کتابوں کے ماننے والے نہیں ہیں۔ الٰہی کتابیں تو امن و
امان، نظم و ضبط اور اطاعت و فرماں برداری کا سبق دیتی ہیں، بدنظمی
فتنہ و فساد اور انار کی ہرگز ہرگز روا نہیں رکھتیں۔

وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ (۲/۲۰۵)

اللہ کسی صورت میں فساد کو پسند نہیں کرتا۔

یہ لوگ اپنے اس دعوے میں جھوٹے ہیں کہ وہ قرآنِ کریم یا توراۃ
و انجیل پر ایمان رکھتے ہیں۔

قرآن مجید نے اس اطاعت کے بیش از بیش نمونے پیش کئے
ہیں اور رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی کی اطاعت (بحیثیت
حاکم اعلیٰ) کا عملی نمونہ شروع کر کے دکھلا دیا ہے۔ آپ کی یہ اطاعت وحی
کی اطاعت نہیں ہے بلکہ عقلی اور انتظامی اطاعت ہے اور آپ کے بعد
اسے آپ کے خلفاء، جانشینوں اور حکام کی طرف منتقل ہونا ہے۔ اسطرح

حق تعالےٰ نے آپ کی اور آپ کے جانشینوں کی اطاعت کی تاکید فرمائی ہے۔

مدینہ منورہ میں عدالتوں کا قیام

جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو مدینہ منورہ میں حکومت حاصل ہوئی تو حق تعالےٰ نے لوگوں کے جھگڑے چکانے کے لئے اور حق داروں کو ان کے حق پہنچانے کے لئے عدالتیں قائم کرائیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ حکام کی اطاعت سکھانی ضروری تھی۔ اس لئے مدنی سورتوں میں حق تعالیٰ نے اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کے پاک کلمات بار بار ارشاد فرمائے ہیں۔ ان سورتوں کا پتہ ان کے مضامین سے صاف لگ سکتا ہے، تائیدی دلائل اسکے علاوہ ہیں۔

سورۂ نساء اور سورۂ نور میں اسلامی عدالتوں کا صراحۃً بیان ہے۔ سورہ نساء میں فرمایا ہے

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَھْلِھَا وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ ط اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمْ بِہٖ ط اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیْعًا بَصِیْرًا۔ (۴/۵۸)۔ بلا شبہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتوں کے جو مستحق ہوں انہیں اُن کی امانتیں حوالہ کرو۔ اور جب لوگوں کے درمیان فیصلے کرنے لگو تو عدل وانصاف کیساتھ فیصلے کرو۔ اللہ تمہیں کتنی اچھی بات کی نصیحت فرماتا ہے یقیناً اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

یہ حکم دیکر آگے (۴/۵۹) میں قانون الٰہی کے ساتھ دو قسم کے حکام، اعلیٰ اور ادنیٰ مقرر فرمائے ہیں۔

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ج فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ

بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ۝

(۴/۵۹) - اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے میں سے حکام مملکت کی اطاعت کرو۔ تو اگر تم میں کسی چیز میں (اولی حکام کے ساتھ) کوئی جھگڑا ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔ اگر تم اللہ پر اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی بہتر ہے اور انجام کے اعتبار سے احسن ہے۔

اس آیت میں اللہ اور رسول کی اطاعت میں صریح فرق دکھلانے کے لئے اَطِیْعُوْا کا لفظ ظاہراً بھی دو دفعہ لایا گیا ہے۔ اللہ والے اَطِیْعُوْا میں صرف اللہ ہی کا ذکر ہے۔ اور رسول کو اُولُوالْاَمْرِ (ماتحت حکام مملکت) والے اَطِیْعُوْا کے ساتھ مِلا کر انہیں کے ساتھ شامل کر دیا ہے کیونکہ دونوں اطاعتیں الگ الگ ہیں۔ ایک اطاعت (پہلی اللہ کی) وحی کی اطاعت ہے اور دوسری اطاعت (پچھلی یعنی اُولُوالامْرِ والی) اطاعت عقلی اور انتظامی اطاعت ہے

اللہ تعالیٰ دُنیا میں خود عدالت نہیں لگاتا

اللہ تعالیٰ جو ہمیشہ یکساں حی قیوم ہے کبھی بھی لوگوں کے سامنے آکر اور کرسئ عدالت پر بیٹھ کر مقدمات کے فیصلے نہیں کیا کرتا۔ اس کے فیصلے اس کے احکام ہیں۔ جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے اور رسول اللہ کے زمانے میں اور آج تک بھی تبلیغ وحی سے ہی ہوتے رہے ہیں۔ حق تعالیٰ کبھی اس دُنیا میں ججوں کی طرح سامنے نہیں آیا کرتا۔ پس حق تعالیٰ کی اطاعت تو وہی ہے جو ہمیشہ یکساں چلی آئی ہے۔ مگر مخلوق کے جج مرنے والے ہیں۔ وہ زندگی اور موت میں یکساں اطاعت کے لائق نہیں ہو سکتے۔ جس طرح اُولُوالْاَمْرِ سے مراد زندہ حاکم ہیں۔ یہ نہیں کہ بہر صورت ان کے افعال و اقوال کی ہمیشہ کے لئے تقلید کی جائے۔ یہی حال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا بھی ہے جو اُولُوالْاَمْرِ والے اَطِیْعُوْا ہی میں داخل ہیں۔

اس آیۂ مبارکہ میں اَلرَّسُوْلِ سے مراد کوئی ایسا قانونِ روایات ہرگز ہرگز نہیں جو ہمیشہ کے لئے اصول بنا لیا جائے جیسا کہ اہلِ حدیث کا خیال ہے۔ اہلِ حدیث فرماتے ہیں کہ یہاں رسول سے مُراد حدیثیں ہیں۔ ان کے نزدیک مذکورہ بالا آیت (۴/۵۹) کا مطلب حسب ذیل ہے۔

"اے ایمان والو! اطاعت کرو، قرآن کی، اور اطاعت کرو حدیث کی، اور اپنے میں سے حاکموں کی، پھر اگر تمہارا (ان حاکموں کے ساتھ) جھگڑا ہو تو اس مقدمہ کو قرآن اور حدیث کی طرف موڑ دو۔"

اگر آیت کا مطلب یہ ہے تو اب قرآن و حدیث دونوں کی موجودگی میں فرض کرو۔ کہ زید و بکر کے درمیان کسی معاملے میں جھگڑا ہو گیا۔ جس کا وہ خود قرآن و حدیث کے ساتھ فیصلہ نہیں کر سکتے یا خودغرضی یا شرارت کے سبب سے اپنا اپنا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اور اس لئے وہ قرآن و حدیث کے ہوتے ہوئے آپس میں اتفاق نہیں کر سکتے۔ ایسی حالت میں محض قرآن اور حدیث کی کتابیں ان کا جھگڑا چکانے میں کافی نہیں ہو سکتیں۔ ضرور ہے کہ وہ اپنا مقدمہ کسی حاکم کی طرف لے جائیں ـــــــ اب فرض کرو کہ وہ اپنے کسی صاحبِ امر کی طرف اپنا مقدمہ لے بھی گئے۔ لیکن وہ اس حاکم کے فیصلے پر بھی راضی نہ ہوئے۔ اس صورت میں بقول اہلِ حدیث انہیں لازم ہوگا۔ کہ وہ اپنا مقدمہ پھر قرآن و حدیث ہی کی طرف موڑیں۔ اس طرح انہیں یہ حضراتِ اہلِ حدیث پھر قرآن و حدیث کی طرف ہی لوٹا رہے ہیں۔ حالانکہ وہ نہ صاحبِ امر کی طرف جانے سے پہلے قرآن و حدیث سے جھگڑا ختم کرا سکے تھے نہ اب کرا سکیں گے۔ لہٰذا یہ واضح ہے کہ ایسے اشخاص کے جھگڑے چکانے کے لئے قرآن و حدیث بلکہ کوئی قانون بھی زندہ حکام کے بغیر نہ پہلے

کافی تھا اور نہ اب کافی ہو سکتا ہے۔

سو جس قانون کے ہوتے ہوئے انہیں اُولُو الْاَمْر کیطرف جانے کی پہلے ضرورت پڑی تھی۔ اب اُولُو الْاَمْرِ کے بعد (یعنی اُولُو الْاَمْرِ مِنْکُمْ کے فیصلے پر رضامند اور مطمئن نہ ہونے کی صورت میں) پھر ایسے شخصوں کا چارہ کار اسی قانون کو ٹھہرانا (جس سے وہ پہلے ہی فیصلہ نہیں کرا سکے) بالکل غلط ہے۔ اس سے یہی مقصود ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیشہ لڑتے جھگڑتے رہیں اور ان کا آخری فیصلہ کر دینے والا کوئی زندہ حاکم نہ ہو۔ (جس کے فیصلہ کی کوئی اپیل نہ ہو۔ اور انہیں اس پر قانوناً راضی ہونا پڑے۔ خواہ غلط شہادتوں کی بدولت غلط فیصلہ ہی کیوں نہ ہو چکا ہو)

اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اس آیت کریمہ (۴/۵۹) میں رسول سے مراد حدیثیں ہرگز نہیں ہیں۔ بلکہ زندہ رسول مراد ہے۔ اور اس کے بعد آپ کے نائب یعنی مرکزی حکمران۔ ورنہ اس آیت کا حکم (وفاتِ رسول کے بعد) رسول کے ساتھ ہی غیر مؤثر ہو جائے گا۔

انتظامی اطاعت کے قرآنی احکام

انتظامی طور پر منتظمین اور حکام کی اطاعت انتہائی ضروری ہے۔ ورنہ نظم و نسق کو چلانا اور اسے قائم رکھنا مشکل ہو جائے اور معاشرے کا امن ہی رخصت ہو جائے۔ قرآن کریم نے اسکو بڑی اہمیت دی ہے۔ چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔

(۱) یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِیْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ وَ اِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ

وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ط وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ (۵۸/۱۱) اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں میں کھل کر بیٹھو تو کھل کر بیٹھ جاؤ۔ اللہ تمہارے لئے کشادگی کر دے گا۔ اور جب کہا جائے کہ اُٹھ کھڑے ہو تو اٹھ جایا کرو۔ اللہ تم میں سے ان لوگوں کے درجے جو ایمان لائے جنہیں علم دیا گیا بلند کر دے گا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خوب واقف ہے۔

دیکھئے اس آیتِ کریمہ میں کس شد و مد کے ساتھ میر مجلس کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ میر مجلس خواہ ہمیں ذلیل کرنے کے لئے ہماری توہین کرنے کے لئے ہمیں مجلس سے اُٹھ جانے کا حکم ہی کیوں نہ دے رہا ہو۔ لیکن ہمارے لئے اس کی اطاعت فرض ہے۔ یہی حال تمام محکموں کا ہے۔ انتظام میں مخل ہونا فساد پیدا کرنا ہے اور اللہ تعالےٰ فساد کو پسند نہیں فرماتے (۲/۲۰۵)

(۲) اگر کسی کے گھر پر اس کی ملاقات یا کسی اور ضروری کام کے لئے جائیں اور سلام کریں۔ لیکن وہ شخص کہدے کہ مجھے اس وقت فرصت نہیں ہے۔ اس وقت آپ واپس چلے جائیں۔ دوسرے کسی وقت آئیں تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ فوراً واپس ہو جاؤ۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ج وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ط وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝ (۲۴/۲۷-۲۸) — اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اپنے

گھروں کے علاوہ دوسروں کے گھروں میں جب تک اجازت نہ
لے لو اور گھر والوں کو (اجازت لینے کے لئے) سلام نہ کر لو
اندر نہ چلے جایا کرو۔ یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ امید ہے کہ
تم نصیحت حاصل کرو گے۔ پھر اگر ان گھروں میں تم کسی (مرد)
کو نہ پاؤ تو اندر نہ چلے جاؤ۔ جب تک تمہیں اس کی اجازت
نہ دی جائے اور اگر تم سے کہا جائے کہ لوٹ جاؤ۔ تو لوٹ جاؤ
یہی بات تمہارے لئے پاکیزہ تر ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے
ہو اللہ خوب جانتا ہے۔

اپنے گھر میں آنے کے لئے اجازت دینے کا اختیار صاحب خانہ کو ہوتا ہے۔ اگر ہم اس کے اس حکم کو نہ مانیں تو اس کے اختیار میں خلل ڈالنے والے مفسد ہوں گے۔ یہاں حق تعالیٰ نے صاحب خانہ کے حکم کو اپنا حکم بنا دیا ہے۔ حالانکہ صاحب خانہ وحی سے نہیں کہتا اور بالکل ممکن ہے۔ کہ صاحب خانہ کا ایسا کہنا غرور و تکبر یا محض ستانے کے لئے ہو۔ مگر ہمارے لئے حق تعالیٰ اس کی اطاعت کو فرض قرار دیتا ہے۔

نہیں نہیں، صرف ہمارے لئے ہی نہیں بلکہ خود نبی اکرم کیلئے بھی اس حکم کا ماننا فرض ہے۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کئی باتوں میں مومنوں کی اطاعت فرماتے تھے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۭ لَوْ يُطِيْعُكُمْ
فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ (۴۹) اور جان رکھو
کہ تم میں اللہ کا رسول موجود ہے۔ اگر وہ (شوریٰ کے علاوہ بھی)
بہت سی باتوں میں تمہاری اطاعت کرتا تو تم تکلیف میں
پڑ جاتے۔

یہاں سے فرمانا جارہا ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم بہت سی باتوں میں تمہاری اطاعت نہیں کرتا۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ بعض باتوں میں وہ تمہارا کہنا مان لیتا ہے۔ یہی حکم اپنے اپنے وقت میں خلفاء اور حکام کے لئے ہے۔ سب خدا کے مطیع ہیں اور ہم سب کو مل جل کر نیکی کا کام بجالانا لازم ہے ۔۔۔

اطاعت رسُول کی عملی شکل قرآن کریم کے الفاظ میں

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں حکومت اور مملکت قائم فرمالی۔ عدالتیں قائم کردی گئیں۔ اور دشمنوں کے حملوں کی متفقہ روک تھام کی ضرورت ہوئی۔ ایسے زمانہ میں اَطِیعُوا الرَّسُولَ کا عالی شان اور معقول فرمان نازل ہوا بلاشبہ امور جامعہ میں

اِذَا کَانُوْا مَعَہٗ عَلٰی اَمْرٍ جَامِعٍ (۲۵/۶۲)

جب مسلمان آنحضورؐ کے ساتھ کسی اجتماعی معاملہ میں ہوں۔

اطاعت کی خوبی دکھلانا اور اس کی تاکید فرمانا نہایت ہی ضروری تھا۔ اطاعت رسول کے تمام احکام انہی ایام میں نازل ہوئے ہیں مدنی سورتیں اس کی شاہد عدل ہیں۔ اتنی ہی بات فیصلہ کردینے کے لئے کافی ہے۔ اس اطاعت کے یہ معنے ہرگز نہیں کہ رسول کے ساتھ عابدانہ تعلق پیدا کرو اور اُسے پوپ کی طرح اپنا رب بنا لو۔ اس اطاعت کے صرف یہی معنے ہیں کہ (حکم کے لحاظ سے) اصل اطاعت خُدا کے ساتھ رکھو۔

مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِہٖ ط اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ط یَقُصُّ الْحَقَّ وَ ھُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ (۶/۵۷)۔ وہ چیز (یعنی عذابِ الٰہی) میرے پاس تو نہیں جس کی تم جلدی مچا رہے ہو۔ حکم اللہ ہی کے لئے ہے۔ وہی حق بیان کرتا ہے اور

وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

اور۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۲/۴۰) حکم تو اللہ ہی کے لئے ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اصل دین قیم یہی ہے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔

بہر حال اصل ایمان خدا کے ساتھ رکھیں اور اس کے رسول کے ساتھ مل کر اس کی معیت میں جہاد کریں۔ یعنی جان سے مال سے ہر طرح سے جان توڑ کوشش کریں۔ چنانچہ قرآن مجید کے نزول کے آخری ایام میں اس کی تفسیر فرمادی اور ارشاد فرمادیا کہ

وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ۝ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝ لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۫ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (۹/۸۶-۸۸) جب کوئی سورت نازل کی جاتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ساتھ مل کر جہاد کرو تو ان میں سے مقدور والے لوگ آپ سے اجازتیں مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے اللہ کے رسول! ہمیں چھوڑ دیجئے ہم پیچھے بیٹھنے والوں کیساتھ رہ جائیں۔ انہیں یہ بات بڑی پسند ہے کہ وہ پیچھے رہ جانے والی عورتوں کے ساتھ رہ جائیں۔ ان کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے تو وہ بات کو سمجھتے نہیں۔ لیکن رسول اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں۔ وہ اپنے جان اور مال سے جہاد کرتے

(جان توڑ کوشش کرتے) ہیں۔ انہی لوگوں کے لئے بھلائیاں ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهٖ کے پاک الفاظ تفسیر کے طور پر ہی آئے ہیں

تفسیر القرآن بالقرآن

تفسیر القرآن بالقرآن ہی قرآن کے شایانِ شان تفسیر ہوتی ہے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ جب قرآن کی تفسیر تصریف آیات کے ذریعہ سے خود قرآن کریم سے کی جائے تو وہ کسقدر عالی پایہ کی ہوتی ہے۔ یہی تفسیر، تفسیر کی اصل شان دکھلاتی ہے۔ تفسیر وہ نہیں ہوتی کہ قرآن تو یہ فرمائے کہ "ظالم لوگ رسول کو مسحور یعنی سحر زدہ کہتے ہیں

وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝ (۲۵/۸)

اور ظالم لوگ کہتے ہیں کہ تم تو ایک ایسے شخص کی پیروی کر رہے ہو جس پر جادو کیا گیا ہے۔

یعنی وہ بکواس کرتے ہیں۔ جھوٹ بولتے ہیں کہ آپ پر جادو کر دیا گیا ہے اور ادعائی تفسیر (روائتی تفسیر) کہے کہ ہاں سُحِرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (رسول پر جادو کر دیا گیا تھا) معاذ اللہ معاذ اللہ، اللہ کے رسول پر جادو ہو گیا۔ یہ لوگ اس کا نام تفسیر رکھتے ہیں اور اسے اپنی طرف سے صحیح بنانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ شاید ان کے ہاں تفسیر اسی کو کہتے ہیں کہ جس میں ایسی بناوٹی باتیں بنانی پڑیں۔ استغفراللہ

علمائے کرام ایک طرف تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے دماغ کو مدت تک جادوگروں کے قبضے میں دے دیتے ہیں۔ اور حضورؐ کے دماغ کا مختل ہونا بھی مانتے ہیں۔ اور یہ بھی مانتے ہیں کہ جس عرصہ میں آپ پر جادو ہو گیا تھا۔ اس عرصے میں یادداشت تک بیکار ہو چکی تھی اور یہ بھی مانتے ہیں کہ آپ کی باتیں وحی خفی تھیں۔ جو جادو زدگی کے دوران بھی جاری تھی۔ تعجب یہ ہے کہ وحی اور جادو کی آمیزش کا تصور اہلِ روایات کے ہاں ہی

قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ جبکہ اہلِ حدیث کے اس عقیدہ سے یہ چیز نکھر کر عیاں ہو رہی ہے کہ آنحضورؐ کے جادو زدگی کے عرصہ میں لامحالہ وحی خفی بھی جادو زدہ ہی ماننی پڑتی ہے۔ حیرت اس امر پر ہے کہ اہلِ روایات یہ تو فرماتے ہیں کہ حضور پر جادو ہوا، یادداشت جاتی رہی۔ عقل مختل ہو گئی، مگر اسی عقل کے متعلق دوسری طرف یہ تسلیم نہیں کرتے کہ حضورؐ اپنی بشری عقل سے بھی کام لیتے تھے۔ اور وہ بشری عقل کے کام اس لائق ہوتے تھے۔ کہ ان کے مناسب ان کی اطاعت کی جائے۔

آنحضورؐ کے قائم کردہ نظام سے الگ رہ کر بھی لوگ مؤمن تھے

رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی حکومت ابتداءً مدینہ منورہ میں بہت کمزور تھی۔ اس وقت ضرورت تھی کہ نئے مسلمان جنکو کفار ستاتے تھے۔ اس حکومت (مدینہ منورہ) میں ہجرت کر آئیں اور اس طرح خود بھی محفوظ ہو جائیں۔ اور اس حکومت کی تقویت کا باعث بھی بنیں۔ مل جل کر کام کرنے میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ باوجود اس کے بہت سے مسلمان ایسے بھی تھے۔ جنہوں نے اپنے اپنے علاقے اور اپنے اپنے قبائل میں اپنے اپنے انتظامات کر لئے تھے۔ یہ لوگ چونکہ علیحدہ انتظام رکھتے تھے اس لئے نہ وہ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کر کے آئے اور نہ ان احکام سے فائدہ اُٹھا سکے جو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اپنی نو قائم شدہ حکومت میں روزمرہ جاری فرماتے تھے۔ حالانکہ وہ اس حالت میں بھی وحی الٰہی یعنی قرآنی احکام سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ لیکن نام نہاد وحی خفی سے بالکل بے تعلق اور بے بہرہ تھے۔ مگر اس علیحدگی کے باوجود وہ ایمان اور دین سے خارج نہیں ہو گئے تھے۔ چنانچہ حق تعالےٰ فرماتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ
وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا

أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَ
لَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُمْ مِنْ وَلَايَتِهِمْ مِنْ شَيْءٍ
حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا ۚ وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ
فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ
مِيثَاقٌ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ (۸/۷۲)

یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جان توڑ کوشش کی اور جنہوں نے ان لوگوں کو جگہ دی اور مدد کی یہ لوگ ایک دوسرے کے سرپرست اور مددگار ہیں اور وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر ہجرت نہیں کی۔ تمہارے لئے ان کی سرپرستی اور مددگاری سے کوئی سروکار نہیں۔ جب تک وہ ہجرت نہ کرلیں اور اگر وہ تم سے دین میں مدد مانگیں تو تم پر ان کی مدد کرنا لازم ہے۔ مگر اس قوم کے مقابلہ پر نہیں کہ تم میں اور ان میں کوئی (صلح کا) معاہدہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو دیکھنے والا ہے۔

اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مؤمن دیندار مسلمان جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے انتظام اور سرپرستی سے باہر تھے۔ اپنے مقدمے حضورؐ کے پاس نہیں لاتے ہوں گے۔ روز مرہ آپ جو احکام مدینہ منورہ میں نافذ فرمایا کرتے تھے۔ اُن پر بھی عمل نہیں کر سکتے تھے مگر اس سے وہ کافر نہیں بن جاتے تھے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنے مقدمات لانے کی فرضیت صرف ان مؤمنوں کے لئے ہے جو آنحضورؐ کے نظام میں داخل تھے۔ اور مدینہ منورہ میں قیام پذیر تھے۔ لیکن جو لوگ آنحضرت کی انتظامی سرپرستی سے باہر تھے وہ اس کے فوائد اور اس کی برکتوں سے بھی محروم تھے۔۔۔
لیکن اس کے برعکس جو لوگ ایک انتظام ریاست (مملکت) میں رہنا دکھلا کر پھر دغا کریں۔ اپنے مقدمات رسولِ مقبول کے پاس نہ لائیں

اور آپ کے فیصلے کو آخری اور قطعی تسلیم نہ کریں۔ اور بدامنی پھیلائیں وہ یقیناً انتہائی بدذات اور قابل مؤاخذہ ہیں، اسی لئے قرآن نے انہیں مجرم قرار دیا ہے۔

جو اسلامی نظام میں رہ کر آپکو آخری حکم نہ مانیں

رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی حکومت میں رہتے ہوئے اگر آپ کو کوئی آخری حَکَم تسلیم نہیں کرتا تو وہ ہرگز مؤمن نہیں ہے۔ مدینہ منورہ میں دو طرح کے لوگ تھے ایک تو وہ جو بظاہر ایمان کا دعویٰ کرتے تھے۔ پکے منافق۔ وہ کہتے تھے کہ ہم قرآن مجید کو اور پچھلی کتابوں (تورات و انجیل) کو بھی مانتے ہیں۔ لیکن مدینہ کی اصلاح اور عوام کے جھگڑے چکانے کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو عدالتیں قائم فرمائی تھیں ان کی طرف نہیں آتے تھے۔ انصاف اور عدل سے بھاگتے تھے۔ اور اپنے مقدمے سرکشوں اور کافروں کی طرف لے جاتے تھے۔ (تاکہ من مانے فیصلے کرا سکیں)

يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ ۝ (۵/۴)
چاہتے ہیں کہ اپنے مقدمے فیصلے کے لئے سرکشوں کی طرف لے جائیں۔

اور اس بُری حرکت سے نقصان اٹھا کر بہانے بناتے تھے۔

إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا ۝ (۵/۴) ہمارا ارادہ تو اس سے محض حسن معاملہ اور باہم یک جہتی پیدا کرنے کا تھا۔

اس پر بھی شیطنت سے باز نہیں آتے اور معافی نہیں مانگتے تھے۔ ایسے لوگ جب تک حاکم وقت (رسولِ مقبول) کی اطاعت کر کے نہ دکھاتے تورات، انجیل اور قرآن کے مومن قرار نہیں پا سکتے تھے۔ حق تعالیٰ نے انہی منافقوں کے بارے میں فرمایا ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا

شَجَرَ بَيۡنَهُمۡ ثُمَّ لَا يَجِدُوۡا فِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيۡتَ وَيُسَلِّمُوۡا تَسۡلِيۡمًا ۝ (۵ ۴/۱۵)۔ ان کی یہ حرکتیں صحیح نہیں) بخدا یہ اپنے زعم اور دعوے کے مطابق (قرآن مجید اور دیگر الہٰی کتابوں کے) مؤمن نہیں قرار پاسکتے۔ جب تک تجھے اپنے باہمی جھگڑوں اور الجھنوں اور تنازعات میں حَکَم (یعنی آخری فیصلہ دینے والا) نہ بنائیں۔ پھر تیرے فیصلہ سے اپنے سینوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں۔ اور تسلیم کرلیویں جو تسلیم کرنے کا حق ہے۔

اس مبارک اور نورانی آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مؤمن کیلئے لازم ہے کہ اپنے حاکم اعلیٰ کے آخری فیصلے کو جی چرانے کے بغیر تسلیم کرلیا جائے تسلیم کیا ہے؟ اس فیصلہ پر راضی ہوجانا۔ اور اس کے لئے اپنے آپ کو سونپ دینا۔ تسلیم کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اگرچہ وہ فیصلہ واقعہ کے برخلاف بھی ہو تو بھی اس کی واقعیت پر ایمان لایا جائے۔ اور خلافِ واقع کو واقعی اعتقاد کرلیا جائے

حدیث سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ بخاری اور مسلم میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا: میں بھی ایک آدمی ہوں۔ اور البتہ میرے پاس مدعی اور مدعا علیہ آتے ہیں۔ سو شاید بعض شخص دوسرے بعض سے زیادہ فصیح و بلیغ یعنی زیادہ چرب زبان اور خوش تقریر ہو تو میں گمان کرلوں کہ وہی سچا ہے اور اس کے حق میں فیصلہ کردیتا ہوں۔ سو جس کو میں اس طرح کسی مسلمان کا حق (غلط طور پر) دلوادوں تو وہ اس کے حق میں دوزخ کا ایک ٹکڑا ہے۔ چاہے وہ اسے اٹھا لیوے اور چاہے چھوڑ دے۔

اس سچی حدیث سے مہر نیمروز کی طرح روشن ہوجاتا ہے کہ کسی فریق مقدمہ کی فصاحت و بلاغت اور چرب زبانی سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اثر پذیر ہوکر خلافِ واقعہ فیصلہ دے سکتے تھے۔ پس وہ نقصان رسیدہ

شخص جسکو خلافِ واقعہ فیصلہ ملا ہے۔ کس طرح اس خلاف واقعہ فیصلہ کو صحیح سمجھ سکتا ہے (اور اس پر ایمان لا سکتا ہے) وہ صرف یہی کہہ سکتا ہے کہ میں اسے کھلے دل سے تسلیم کر لیتا ہوں۔ اگرچہ یہ فیصلہ واقعہ کے لحاظ سے صحیح نہیں ہے۔ پس تسلیم کرنے کے معنے یہ تو ہرگز نہیں ہیں کہ اس فیصلہ کے واقعہ کے مطابق صحیح ہونے کا بھی اعتقاد کر لیا جائے۔ منتخب اللغات میں تسلیم کے معنی لکھے ہیں:۔

رہانیدن، سپردن، گردن نہادن بہ حکم، وسلام کردن ـــــــ

اس سے صاف کھل جاتا ہے کہ اعلیٰ حاکم کے حکم پر گردن رکھ دینا تسلیم ہے نہ یہ کہ اس پر خدا کے حکم کی طرح اعتقاد بھی کر لینا لازم ہے۔

حضرتِ داؤدؑ صحیح فیصلہ نہ دے سکے

حضرت داؤدؑ نے ایک مقدمہ کا صحیح فیصلہ نہیں دیا۔ صحیح فیصلہ حضرت سلیمانؑ نے دیا۔ قرآن پاک میں حضرت داؤد علیہ السلام کے ایک مقدمہ کا ذکر آتا ہے۔ کسی قوم کی بکریاں رات کے وقت کسی کے کھیت میں چر گئیں۔ اس مقدمہ کا صحیح فیصلہ حضرت داؤد علیہ السلام نہ دے سکے۔ حق تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو جو انہی کے بیٹے تھے صحیح فیصلہ پر پایا۔

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِى الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۝ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا (۲۱/۷۹)

اور سلیمانؑ اور داؤدؑ کا ذکر کرو۔ جب وہ اس کھیت کے بارہ میں فیصلے دے رہے تھے۔ جس میں ایک قوم کی بکریاں چر گئی تھیں اور ہم ان کے فیصلے کو دیکھ رہے تھے۔ تو ہم نے مقدمہ کی سمجھ سلیمانؑ کو دی اور ہم نے ہر ایک کو (داؤدؑ کو بھی اور سلیمانؑ کو بھی) حکومت اور علم عطا فرمایا تھا۔

پس بتقاضائے بشریت صحیح فیصلہ نہ دے سکنا رسولوں اور نبیوں کا کوئی

قصور نہیں ہے۔ ضعیف انسان ہونا اور غیب نہ جاننا آدمیوں کا کوئی جرم نہیں ہے اور ایسی غلطیاں جو بشریت کے تقاضے سے وقوع پذیر ہوں کسی کا کوئی ظلم نہیں ہے۔ نہ اس میں کسی کا کوئی قصور ہے۔

منافقوں کے متعلق صحابہ کے دو گروہ

مختصراً یہ بات پہلے بھی گزر چکی ہے کہ مدینہ منورہ میں عہد رسالت مآب میں ایسے منافق بھی تھے جو کفار کے ساتھ ملے جلے رہتے تھے اور ان سے الگ نہیں ہوتے تھے۔ یہ لوگ کفار کے ساتھ مل ملا کر اہل اسلام کے مقابلہ میں کفار کو مدد بھی دیتے تھے۔ لیکن مسلمانوں کے قابو میں آتے تو کہتے کہ ہم تو مسلمان ہیں۔ کفار کے جبر سے چلے آئے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے ان سے الگ نہیں ہونا چاہتے تھے۔ ایسے لوگوں کے متعلق رسول اللہ کے تابعداروں (صحابہؓ کرام) میں اختلاف ہوا۔ دو پارٹیاں بن گئیں۔ ایک پارٹی کہتی تھی کہ ان کو عین حالتِ جنگ میں پاکر قتل نہ کرنا۔ اپنے آپ کو ہلاک کرنا ہے۔ یہ مؤمن نہیں ہیں۔ یہ کافروں کے ساتھ آئے ہیں۔ لہٰذا کافر ہیں۔ ان کو زندہ چھوڑ دینا اپنے لئے خطرہ مول لینا ہے۔ لہٰذا ان کو قتل ہی کر دینا مناسب ہے۔ دوسری پارٹی کہتی تھی کہ ان کو معاف کر دو۔ یہ لوگ اپنے ماضی پر شرمندہ تو ہیں اور مشرکین کے ساتھ آنے کو غلط تو سمجھتے ہیں۔ جب ہی تو کہہ رہے ہیں کہ ہم مشرکین کے جبر کی وجہ سے آ گئے ہیں۔ شاید انہیں ہمارے اس سلوک سے ہدایت ہی مل جائے۔ خود رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم جو سراپا رحمت تھے۔ اس دوسری پارٹی ہی کے ہم خیال تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح انہیں ہدایت مل جائے۔ اللہ تعالے فرماتے ہیں۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا (۴/۸۸) مسلمانو! منافقین کے سلسلہ میں تمہارے دو گروہ کیوں بن گئے۔ اللہ نے تو ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے انہیں اوندھا کر دیا تھا۔ یہ لوگ قطعاً گمراہ اور منافق ہیں۔)

یعنی جب یہ منافق ایسے کرتوت کرتے ہیں اور اپنے آپ پر خود رحم نہیں کرتے اور دوسروں کے قتل سے نہیں ٹلتے تو ان کی طرفداری کے کیا معنے؟ یہ بھی ویسے ہی حربی (دشمن) ہیں جیسے اور مشرکین۔ حق تعالےٰ نے اس فرمان سے پہلی پارٹی کے موقف کی تائید و تصدیق فرمائی۔ کہ جب ان منافقوں کی ایسی ایسی حرکتیں ہیں تو اس سچی پارٹی سے مخالفت کر کے اپنے میں دو پارٹیاں کیوں بناتے ہو۔ پھر دوسری پارٹی کو جو ان کی ہدایت کے متوقع تھے بلکہ ان کی ہدایت کی تمنا رکھتے تھے دھمکایا کہ:-

اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ (۴/۸۸)

یعنی کیا تم یہ ارادہ رکھتے ہو کہ انہیں سیدھے راستہ پر لے آؤ جنہیں اللہ نے ان کے کرتوتوں کے سبب بے راہ ٹھہرا دیا ہے اور اپنے رسول کو خاص کر کے الگ حکم دیا

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝ (۴/۸۸)

جس کو اسکے کرتوتوں کے باعث اللہ گمراہ ٹھہرا دے۔ تو اے پیغمبر! آپ اس کے لئے ہرگز ہرگز کوئی راستہ نہیں پا سکیں گے۔

خود رسولِ اکرمؐ دوسری پارٹی کے ساتھ

حاصل یہ ہے کہ بعض منافقین کے بارے میں اہل الرائے صحابہؓ کی دو پارٹیاں ہو گئی تھیں اور رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی رائے مبارک بھی دوسری پارٹی کے موافق تھی کہ ان کو معاف کر دیا جائے۔ لیکن حق تعالےٰ نے وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا (اور اللہ نے ان کے کرتوتوں کے سبب انہیں اوندھا کر دیا ہے) فرما کہ پہلی پارٹی کی تصدیق فرما دی اور رسولِ اکرمؐ والی پارٹی کی آیت کے اگلے حصہ میں غلطی ظاہر فرما دی۔

اگر اس معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیر جانبدار ہوتے یا علیحدہ اپنی کوئی تیسری رائے رکھتے تو حق تعالیٰ اہل الرائے مؤمنین کی تین

پارٹیاں بن جانا فرماتا نہ کہ دو۔ حق تعالیٰ نے اپنے رسول کو یہ فرما کر کہ جس کو اللہ گمراہ قرار دیدے، (اے پیغمبر!) آپ اس کے لئے کوئی راستہ نہیں پائیں گے۔ صاف واضح کر دیا ہے کہ حضور اکرم اسی پارٹی کے ہم رائے تھے جس کا خیال تھا کہ اس طرح وہ منافق ہدایت پر آجائیں گے۔ پس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے اگرچہ رحم وکرم اور عفو ودرگذر کا پہلو لئے ہوئے تھی مگر صحیح نہ تھی اور یہ محال ہے کہ حق تعالیٰ ایسا اعتقاد رکھنا سکھائے کہ کسی کی غلطی کو غلطی جان کر بھی یہ عقیدہ رکھا کرو کہ وہ صحیح ہے۔ ہاں یہ سکھلانا لازم ہے کہ دو عملی پھیلا کر بدنظمی نہ پیدا کرو۔ اگر مذکورہ بالا معاملے میں حق تعالیٰ کے فیصلہ نازل فرمانے سے پہلے اختلاف رائے کے وقت میں ہی کوئی جنگ واقع ہو جاتی اور اسمیں وہ منافق اسی حالت میں پائے جاتے تو ان کے معاملے میں باوجود اختلاف رائے کے رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے غلط حکم پر ہی عمل کرنا لازم تھا۔ اپنی مخالف رائے پر چلنا قطعاً حرام ہوتا اور یاد رہے کہ اختلاف رائے رکھنا اور بات ہے اور جرنیلوں، کمانڈروں، حاکموں، منصفوں اور مصلحوں کی اطاعت سے نکل کر دُو عملی پھیلانا اور بات ہے۔ اوّل الذکر (یعنی اختلاف رائے) بغرض تعمیر صحیح ہے۔ اور مؤخر الذکر (نافرمانی) میں چونکہ تخریب ہی تخریب ہے اس لئے غلط ہے۔ کیونکہ جس بشر کا بغلطی کر سکنا ممکن ہے۔ اس کے ساتھ معقول اور صحیح طور پر اختلاف رائے کرنے سے کوئی دانا مانع نہیں ہو سکتا۔ لیکن اختلاف رائے کو اس حد تک بڑھانا کہ عملی معاملات میں حاکم اعلیٰ کی موجودگی کے باوجود دو پارٹیاں اور دو جتھے الگ الگ بن جائیں جس سے دو عملی کا خوف ہو، کسی صورت میں معقول نہیں قرار پا سکتا۔ اور اسی لئے حق تعالیٰ نے معقول اور صحیح اختلاف رائے سے نہیں روکا۔ مگر دو جتھے بن جانے کو پسند نہیں فرمایا۔ جیسا کہ حکم کیا ہے کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ان منافقوں کے بارے میں دُو جتھے بن رہے ہو؟ البتہ یہ ضرور ہے کہ دُو پارٹیاں بننے کا الزام زیادہ تر اسی پارٹی پر لگ سکتا ہے جس نے غلط ہو کر

دوسری پارٹی بنالی ہو۔ اور ایک کے دو کر دیئے ہوں۔ صحابہؓ کی دو پارٹیاں بن جانے سے یہ امر بھی مہر نیمروز کی طرح روشن ہو جاتا ہے کہ محض عہدۂ رسالت پر قائم ہونا ہی ہر اختلاف کو مٹانے کے لئے کافی نہیں تھا۔ ورنہ رسول اکرمؐ کے عہدۂ رسالت پر قائم ہونے کے باوجود صحابہؓ کی دو پارٹیاں نہ بن سکتیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال بہر صورت اختلاف کو مٹا نہیں سکتے تھے۔

اختلافات کو مٹانا قرآنی آیات یا شوریٰ سے ممکن تھا جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی معاملے میں کسی کا اختلاف ہوتا تو وہ شوریٰ وغیرہ عقلی ذرائع پر ہی چھوڑا جاتا تھا۔ اور یا قرآن مجید آ کر فیصلہ کرتا تھا۔ منافقوں کے بارے میں دو پارٹیاں بن جانے کے معاملہ میں بھی قرآن نے ہی آکر فیصلہ کیا۔ اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا صرف عہدۂ رسالت پر متعین ہونا ہی تمام اختلافات کے مٹا دینے کے لئے کافی ہوتا تو قرآن مجید کے نازل ہونے کی کوئی ضرورت باقی نہ رہتی۔ رسول کا عہدۂ رسالت پر قائم کیا جانا اس لئے تھا کہ ان کے ذریعہ سے وحی الٰہی پہنچائی جائے نہ کہ ان کی محدود بشری عقل کی کوششوں کو بھی وحی الٰہی بنا دیا جائے۔ ان لوگوں کے نزدیک شاید انسانی عقل وفہم کی کچھ بھی قدر نہیں اور اسی لئے یہ لوگ حضورؐ کو انسانی عقل وفہم سے کام لینے والا قرار نہیں دے سکتے۔

اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى۔ (۵۳/۵۴)

کیا انسان کی ہر آرزو کبھی پوری ہوئی ہے؟

کفار چاہتے تھے کہ رسولوں کے ساتھ بشریت نہ لگی رہے۔ بلکہ وہ خواہش رکھتے تھے کہ خود ہم کو بھی وحی ہوا کرے تاکہ کوئی شبہ باقی نہ رہے مگر حق تعالیٰ نہیں چاہتا تھا کہ ان کی اہواء کا اتباع کر کے صحیفۂ فطرت اور عقل کی اہمیت کو ضائع کر دے۔

آنحضرتؐ کیساتھ ایک عورت کا مجادلہ :۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ

اختلاف ہونے کی صورت میں قرآن مجید کا حکم بننا کئی جگہ ثابت ہے۔ ایک عورت کو اس کے خاوند نے ماں کہہ دیا۔ لوگ اس فضول حرکت کو طلاق قرار دیتے تھے۔ وہ عورت اس عام (فضول) رسم کی اصلاح چاہنے کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ چونکہ عربوں کا یہ عام دستور تھا کہ ایسا کہدینے سے ان کے ہاں عورت پر طلاق پڑ جاتی تھی۔ لہذا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی عام عرب دستور کے مطابق اسے یہی جواب دیا اور حضورؐ کا اس کے ساتھ اتفاق رائے نہ ہوا۔ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جھگڑتی اور سوال وجواب کرتی رہی۔ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مایوس ہو کر اللہ کے حضور میں شکایت کی۔ وہ تو اپنے بندوں کے آڑے وقت میں کام آنے والا ہے ہی۔ اس نے اس عورت کے قول کو سن لیا اور اس کے حق میں فیصلہ دیدیا (۵۸/۱-۲) یہ سورت آج تک سورۂ مجادلہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (اپنے حقوق کے لئے) جھگڑنے کا حق ملا ہوا ہے۔ ہمارے نزدیک تو یہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی عزت اور شان ہے

مگر بندہ پرست (اللہ کو چھوڑ کر رسول اللہ کی پوجا کرنے والے) اسے رسول اللہ کی ہتک سمجھتے ہیں لیکن حق تعالیٰ نے اس مجادلہ کو قرآن کریم میں شامل کر کے رسول مقبول کی حقیقی شان کو اظہر من الشمس کر دیا ہے اور الوہیت و رسالت کے مقامات کو الگ الگ نکھار کر رکھدیا۔

منتہائے سوال حق تعالےٰ ہے

منتہائے سوال، رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ حق تعالیٰ ہیں۔

مذکورہ عورت کے مجادلہ (۵۸/۱) سے ثابت ہے کہ اگر رسولؐ منتہائے سوال ہوتا تو اس عورت کا کیا حق تھا کہ وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ دے دینے کے بعد رسول کے ساتھ مجادلہ کرتی اور رسول اسے نہ روکتا۔ کہ تیرا کوئی حق نہیں کہ

میرے فیصلہ دیدینے کے بعد پھر بار بار مجھ سے سوال وجواب کرے۔ کیونکہ میں منتہائے سوال ہوں اور میرے فیصلے پر تجھے حق اعتراض نہیں اور حق تعالےٰ بھی اس عورت کو روکتے کہ خبردار! تجھے میرے رسول کے ساتھ جھگڑا کرنے کا کیا حق ہے۔ یا اللہ تعالیٰ کم ازکم اس عورت پر ناراضگی کا اظہار فرماتے۔ لیکن بجائے کسی خفگی کے اظہار کے یہاں تو حق تعالیٰ نے فیصلہ خلافِ رائے رسول خود عورت کے حق میں دیدیا۔ حقیقت یہ ہے کہ لفظ رسول کا مقام ہی یہی ہے جو آیات مجادلہ (۵۸/۱-۱) میں دکھایا گیا ہے۔

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۚ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ۝ اَلَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآئِهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ؕ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔیْ وَلَدْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَیَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝ (۵۸/۱-۲) اللہ نے اس عورت کی بات سُن لی ہے جو (اے پیغمبر!) تم سے اپنے شوہر کے بارے میں جھگڑ رہی ہے اور اللہ سے شکایت کر رہی ہے اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سُن رہا تھا۔ یقیناً اللہ سُننے والا، دیکھنے والا ہے۔ تم میں سے جو لوگ اپنی عورتوں سے ظہار کر لیتے (انہیں ماں کہدیتے) ہیں۔ وہ ان کی مائیں نہیں بن جاتیں۔ ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے انہیں جنم دیا ہے (البتہ) وہ ایک بیہودہ اور غلط بات کہتے ہیں اور اللہ بڑا معاف کرنے والا بخشش کرنے والا ہے۔

اہلِ روایت کی بنیادی لغزش یا غلطی ہی یہی ہے کہ اللہ کے رسول کو خود اللہ تعالیٰ کے مقام پر لا کھڑا کرتے ہیں آپ کی شان سمجھتے ہیں۔

اس واقعہ سے ارشادِ الٰہی

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (۴/۶۵)۔ تو تیرے رب کی قسم وہ مؤمن نہیں ہوں گے جب تک اپنے باہمی اختلافات میں تجھے (اے پیغمبر) حکم نہ بنالیں۔ پھر اپنے دلوں میں آپ کے فیصلہ سے کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں۔ اور پوری طرح اسے تسلیم کرلیں۔

کا مطلب اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مجادلہ والی عورت نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو نہ صرف یہ کہ تسلیم نہیں کیا بلکہ آپ کے فیصلہ کے بعد دل میں تنگی بھی محسوس کی اور بارگاہِ الٰہی میں شکایت بھی کی اور حق تعالےٰ نے اس کی شکایت سن لی اور شکایت کا ازالہ فرمایا۔ سوال یہ ہے کہ یہ عورت کیا مؤمن نہیں رہی تھی۔ اگر ایسا ہے تو خدا نے اس کی تائید کیوں فرمائی۔

اختلافات کا فیصلہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے

اس مذکورہ بالا واقعہ سے بھی سورج کی طرح روشن ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اختلاف رائے کے وقت حق تعالیٰ کی طرف شکایت کی جاتی تھی اور حق تعالیٰ (اپنے الفاظ میں) بزبانِ رسول فرماتا تھا۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ڰ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ۝ (۴۲/۱۰)۔ اور جس بات میں بھی تم اختلاف کرتے ہو تو اس کا فیصلہ اللہ ہی کی طرف ہے۔ وہی اللہ میرا رب ہے۔ اسی پر میرا بھروسہ ہے اور اسی کی طرف میں رجوع ہوتا ہوں۔

پھر بزبانِ رسول ہی ارشاد فرمایا۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِىْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِىْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ط (۶/۱۱۴) - کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور حکم تلاش کروں۔ حالانکہ وہی تو ہے جس نے تمہاری طرف یہ کتاب مفصل کر کے نازل فرمائی ہے۔

ہاں باہمی مشاجرات اور انتظامی معاملات میں قرآنی بلکہ عقلی فیصلہ بھی رسولؑ یا اعلیٰ حاکموں کے ذریعے ہی کرایا جا سکتا ہے۔ لیکن اعتقادیات کا معاملہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہی تعلق رکھتا ہے۔ جب تک خدا کا حکم یا اس کا منشاء نہ ثابت ہو جائے کسی اعلیٰ حاکم کا فیصلہ کر دینا بھی اعتقاد کیلئے کافی نہیں۔

نبی اور رسول بھی اصحاب امر سے فیصلے کراتے تھے

اگر کسی شخص کا کسی نبی یا رسول سے کسی معاملہ میں اختلاف کیوجہ سے کوئی مقدمہ ہو جائے تو خود رسول ہی اپنے آپ کو بری کر لینے کا حق نہیں رکھتا۔ اللہ کے رسول اوّل المومنین ہوتے ہیں۔ وہ بھی مومنین کے لئے جو احکام ہیں ان میں داخل ہوتے ہیں۔ بلکہ دوسرے مومنین سے ان پر زیادہ (قانونی) ذمہ داریاں اور سختیاں ڈالی جاتی ہیں۔ ان سے رعائتیں نہیں کی جاتیں۔ رسولوں کو (جب ان کی اپنی حکومت نہ ہو) تو اپنا فیصلہ اُولُو الْاَمر اور اعلیٰ حکام سے ہی کرانا ہوتا تھا۔ جس حکومت میں وہ رہتے تھے انہیں اس کے قانون پر چلنا اور نیک رعیت بننا ہوتا تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو (پہلے تو بلا وجہ قید خانہ میں ڈالدیا گیا اور پھر جب) شاہِ مصر نے بغیر کسی مقدمہ چلانے کے قید خانہ سے نکالنا چاہا تو انہوں نے اس پر بھی اپنے مقدمہ کو بادشاہ کے حضور میں ہی پیش کرنا ضروری سمجھا۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِىْ بِهٖ ج فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِىْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ط اِنَّ رَبِّىْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ۔ (۱۲/۵۰)

بادشاہ نے کہا، اسے (یوسف کو) میرے پاس لاؤ۔ تو جب قاصد یوسفؑ کے پاس آیا تو یوسفؑ نے کہا۔ اپنے آقا کے پاس واپس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا قصہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے۔ میرا آقا ان کے مکر سے خوب واقف ہے۔

اور بادشاہ سے اپنی بریت کرائے بغیر قید خانہ سے نہ نکلے۔ اور اس طرح نیک غلام، نیک قیدی، نیک نوکر بن کے دکھلایا اور بحالتِ غلامی اپنے آقا اور بحالتِ قیدی اپنے داروغہ اور بحیثیت ملازمت اپنے بادشاہ کی ٹھیک ٹھیک اطاعت فرمائی۔

روایتیں سبیل المؤمنین نہیں ہوسکتیں

قرآن کریم نے سبیل المؤمنین کی پیروی کو ضروری قرار دیا ہے۔ علمائے حدیث سبیل المؤمنین سے روایات مراد لے کر احادیث کی اطاعت کو ضروری قرار دے لیتے ہیں۔ حالانکہ سبیل المؤمنین سے روایات مراد لینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ سبیل المؤمنین والی آیت (۴/۱۱۵) سے پچھلی آیت میں لوگوں کو اس سے ممانعت فرمائی گئی ہے کہ وہ الگ الگ سرگوشیاں نہ کریں۔ الگ الگ سرگوشیاں کرنا محفل میں دوسرے موجود لوگوں کی دل آزاری کا باعث ہوتا ہے کہ شاید ہمارے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں۔ یا کوئی ایسی بات ہے جو ہم سے چھپانا چاہتے ہیں۔

لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ۝ (۴/۱۱۴)۔ اکثر سرگوشیوں میں کوئی بھلائی نہیں سوائے اُس شخص کے جو صدقہ کا یا کسی نیک بات کا یا لوگوں کے درمیان اصلاح کا حکم کرنے۔ اور جو شخص یہ کرتا ہے خدا

کی رضا جوئی کے لئے تو ہم اسے جلدی ہی بڑا اجر عطا فرمائیں گے۔
الگ سرگوشیاں ممنوع ہیں۔ جو بات ہو سب کے سامنے رکھ دو۔ اور اسکے متعلق سب کی رائے لے لو۔ یہ اس آیت کا حاصل ہے۔ اس کی تفسیر و تشریح دوسری آیت سے فرمادی گئی ہے۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔ (۳/۱۵۹) تو اے پیغمبر ان سے درگذر کیجئے اور ان کیلئے استغفار فرمائیے اور ان سے معاملات میں مشورہ فرمائیے۔

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ۔ (۴۲/۳۸)۔ اور مسلمانوں کے تمام معاملات ان کے باہمی مشورہ سے طے ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے تمام معاملات باہمی مشورہ سے طے کرتے ہیں آیت نمبر (۴/۱۱۴) میں دراصل اسی مشورۂ باہمی کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ پھر اس سے اگلی آیت یعنی (۴/۱۱۵) میں اسی اسلامی طریقہ کو جس پہ تمام مسلمانوں کو کاربند رہنا چاہیئے۔ سبیل المؤمنین بتایا گیا ہے اور اس کی مخالفت سے لوگوں کو روکا گیا ہے۔ وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا۔ (۴/۱۱۵)

جو شخص رسول کی مخالفت کرے اس کے بعد کہ اس کے لئے ہدایت واضح ہو چکی ہے اور مؤمنوں کے راستہ کے سوا کسی اور راہ کا اتباع کرے تو ہم اسے اُدھر ہی پھیر دیں گے۔ جدھر وہ پھر رہا ہے اور اسے جہنم میں ڈال دیں گے۔ اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔

اس آیت میں مسلمانوں کو اس ہدایت پر چلنے کی تاکید فرمائی جا رہی ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ کی طرف سے لائے تھے اور نیز سبیل المؤمنین (شوریٰ کے طریقِ کار) پر چلنا سکھا رہے ہیں۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی وحی الٰہی اور سبیل المؤمنین (یعنی وَشَاوِرْهُمْ فِي

الْاَمْرِ (۳/۱۵۹) کے حکم الٰہی کے مطابق وحی اور شوریٰ دونوں پر چلتے تھے۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ رسول کے لئے تو صرف وحی الٰہی کی پیروی ہی ضروری ہو۔ اور ہمارے لئے رسول سے الگ کوئی اور سبیل المؤمنین بھی ہو۔ یعنی رسول کے لئے کچھ اور دین ہو اور ہمارے لئے کچھ اور، اور بعد میں آنے والے خود ہی روایتیں تراشیں اور انہیں سبیل المؤمنین ٹھہرا لیں۔

اِطاعت، رسول اور مؤمنین کیلئے ایک ہے

پس اِطاعتِ الٰہی کرنے میں ہمارے لئے اور رسول اللہ کے لئے ایک ہی قواعد ہیں (۴/۱۱۵) آیت اوپر گذر چکی ہے) سبیل المؤمنین کی مخالفت کرتے میں جو وعید مذکور ہے وہ سب کیلئے یکساں ہے ـــــ قرآن مجید ایسے دلائل سے بھرا پڑا ہے۔ مگر لوگوں کے نزدیک قرآن کریم کی تعلیمات نہ اسلاف کے قرآنی یا غیر قرآنی اعمال کے لئے کوئی کسوٹی یا حاکم ہے کہ اس کے معیار سے ان کو جانچا جا سکے اور نہ اخلاف کے لئے بلا شرکت کسی اور کتاب (مثلاً بخاری و مسلم وغیرہ) کے واجب الاتباع جانتے ہیں۔ ہم ان کے ان خیالات سے متفق نہیں ہو سکتے۔ ہمارے نزدیک اعتقادات میں سوائے قرآنی مجید کے نہ تو کوئی سلف ہی استقلال رکھتا ہے اور نہ کوئی خلف، حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید جس قدر بے دلیل اسلاف پرستی کا دشمن ہے دُنیا کی کوئی کتاب اس سلسلے میں قرآن مجید کی مثل نہیں ہے۔

بابِ چہارم

انبیاء علیہم السلام سے اِجتہادی غلطیاں ہوسکتی تھیں

بلاشبہ ہر رسول پہلا شخص ہوتا ہے جو اشاعتِ اسلام کی بنیاد رکھتا ہے۔ اور عام قاعدہ ہے کہ جو شخص کسی کام کی بنیاد ڈالتا ہے اس کا حوصلہ، ہمت، اِستقلال، پختگیٔ عزم و ارادہ، نیک نیتی، خیر خواہی، ہمدردی عام انسانوں سے بہت زیادہ اور مثالی ہوا کرتی ہے۔ اور جو نیک اشخاص اس کے ساتھ ابتداءً شامل ہوتے ہیں۔ ان میں سے بھی اکثر کا یہی حال ہوتا ہے۔ وہ غلطیاں جن سے عقل و فہم، محبت، نیک نیتی، خیر خواہی اور سچی توبہ بچالیتی ہے۔ ان سے نسبتاً کم ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ معصوم عن الخطا ہوتے ہیں۔ اور ان سے کوئی غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔ ان صفات میں تمام رسول بھی یکساں نہیں ہوتے اور ان کی کوششیں بھی یکساں بارآور نہیں ہوتیں۔ حضرت لوط علیہ السلام کے ساتھ صرف ان کا اپنا گھر ہی مسلمان بنا تھا۔

فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ ۝ (۵۱/۳۶)

ہم نے وہاں مسلمانوں کا صرف ایک گھر پایا ہے۔

اپنے گھر والوں میں سے بھی بیوی پیچھے رہ گئی تھی۔

فَأَنجَيْنَاهُ وَأَهْلَهُ إِلَّا امْرَأَتَهُ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ ۝ (۷/۸۳)۔ تو ہم نے لوط اور اس کے گھر والوں کو بچا لیا۔ البتہ اس کی بیوی نہیں بچی۔ وہ باقی ماندہ ہلاک ہونیوالوں میں سے ہوگئی۔

حضرت نوحؑ نے مدت دراز تک دن رات جان توڑ کوششیں کیں لیکن

فَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ۔ (۱۱/۴۰)

تھوڑے سے آدمیوں کے سوا ان کے ساتھ کوئی ایمان نہیں لایا۔

حتیٰ کہ ان کی بیوی بھی اس معاملہ میں ان کی ہم خیال نہ ہوئی۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ۚ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ۔ (۶۶/۱۰) — کفار کے لئے اللہ نے ایک مثال پیش کی ہے۔ یعنی زوجہ نوحؑ اور زوجہ لوطؑ کی مثال۔ یہ دونوں ہمارے بندوں میں سے دو نیک بندوں کے نکاح میں تھیں۔ لیکن دونوں نے شوہروں سے خیانت کی تو وہ اللہ کے عذاب سے انہیں کچھ بھی کام نہ آسکے اور دونوں بیویوں سے کہدیا گیا کہ جہنم میں داخل ہونے والوں کے ساتھ تم بھی داخل ہو جاؤ۔

حضرت نوح علیہ السلام کا ایک لڑکا ان کی اپنی آنکھوں کے سامنے غرق ہوگیا

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ۔ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ڹ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۚ اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ۔ (۱۱/۴۵-۴۶) — اور نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا، پس کہا، پروردگار! میرا بیٹا میرے اہل میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ تو حق تعالےٰ نے فرمایا کہ

اے نوحؑ تیرا بیٹا تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ اس کے اعمال نیک نہیں ہیں۔ (ہمارے ہاں خون اور نسل کو نہیں بلکہ عمل کو دیکھا جاتا ہے) تو ایسی بات کا مجھ سے سوال نہ کر جس کا تجھے کوئی علم نہیں ہے۔ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تو جاہلوں میں سے نہ ہو جا۔

پس کوششوں کی کامیابی اور چیز ہے۔ اور کسی کو معصوم عن الخطا بنا دیا جانا اور چیز ہے۔

انبیاء علیہم السلام خطا اجتہادی سے معصوم نہیں تھے

رسولوں کو بلاشبہ اپنی وحی پر بڑا یقین ہونا لازم ہے۔ مگر ساتھ ہی عام اصول کے مطابق یہ بھی لازم ہے کہ رسولوں کی ذمہ داری اور جواب دہی بھی بہت بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔

جیسے کہ خود رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کا قول سورۂ یونس میں مذکور ہے۔

اِنِّیٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۱۰/۱۵) اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو میں بھی بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

انبیاء علیہم السلام کے سہو اور خطائیں قرآن مجید میں متعدد مذکور ہیں۔ اگرچہ

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۙ لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ ۝ (۲۱/۲۶-۲۷) ۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے۔ خدا کی ذات اس سے پاک ہے (جنہیں وہ اس کے بیٹے بتا رہے ہیں وہ اس کے بیٹے نہیں) بلکہ وہ اس کے معزز و مکرم بندے ہیں۔ وہ بات کرنے میں اس سے سبقت نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم کے مطابق ہی عمل کرتے ہیں۔

قرآن کی اس شہادت کے مطابق یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء کرام کا

یہ پاکیزہ گروہ عمداً غلطی کرنے سے مبرّا تھا۔ لیکن قرآن مجید سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انبیاء علیہم السّلام سے سہو، لغزش اور خطائیں بالکل سرزد ہی نہیں ہوتی تھیں۔ حضرت یونس علیہ السلام کا قوم سے الگ ہو جانا۔

وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۝ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ۝ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ ۝ (۳۷/۱۳۹-۱۴۲)

اور یقیناً یونسؑ بھی رسولوں میں سے تھے۔ جب وہ بھاگ کر بھری ہوئی کشتی کی طرف گئے۔ قرعہ ڈالا تو وہ خود ہی خطاکاروں میں سے نکلے۔ چنانچہ مچھلی نے ان کا لقمہ بنالیا اور وہ پشیمان تھے۔

حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹے کے لئے سفارش اور دعاء کرنا اور حق تعالےٰ کی طرف سے متنبہ کیا جانا

اِنِّىْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (۱۱/۴۶)

میں تجھے نصیحت کرتا ہوں (اے نوح!) کہ تو جاہلوں میں سے نہ بن۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا بکریوں کے مقدمہ میں صحیح فیصلہ نہ دے سکنا۔

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِى الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۝ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۝

(۲۱/۷۸-۷۹)۔ اور داؤد اور سلیمان کے واقعہ کو یاد کرو۔ جب وہ کھیت کے مقدمہ میں فیصلہ دے رہے تھے۔ جب کھیت میں قوم کی بکریاں چر گئی تھیں۔ اور ہم ان کے فیصلہ کو دیکھ رہے تھے۔ تو ہم نے مقدمہ کے فیصلے کی سمجھ سلیمان کو عطا فرمائی۔ اور سب کو (داؤدؑ کو اور سلیمانؑ کو) ہم نے حکومت اور علم عطا فرمایا تھا۔

وغیرہ آیاتِ کریمہ سے صاف صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ حق تعالیٰ کے انبیاء و رسل، بشریت کے تقاضوں سے ہرگز مبرّا نہیں تھے۔ اور اُن سے بھی سہو و نسیان اور

خطائیں سرزد ہو جاتی تھیں۔ لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ جس مجموعۂ کلام میں احتمالِ خطا ہو وہ وحی نہیں ہو سکتا۔ چونکہ سہو و خطا سے مبرّا صرف وحی الٰہی ہے۔ پس حجت بھی یہی ہے۔ اس لئے اب وحی الٰہی کی محبت ہی پیدا کرنی چاہیئے تاکہ ہمارا شوق و ایمان بھی بڑھے اور اعلیٰ کام انجام دے۔ وحی کی محبت کا کام وحی کی محبت ہی سے ہو گا۔ اگر غیر وحی کو جا لیں کر کے وحی، یا وحی کے ہم معنے اور ہم پلّہ قرار دے لیا جائے تو وحی کی خاص محبت ہی جاتی رہے گی۔

رائے، راوی، اجماع اور اسلاف پرستی

یہی وجہ ہے کہ اب اگرچہ مکمل صورت میں وہی وحی موجود ہے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔ مگر اس کا شوق، محبت اور پیار یہ رہ گیا ہے کہ اہل قرآن ایک قسم کی گالی بن گئی ہے۔ کسی کو اہل قرآن کہدینا اسے گمراہ اور بد فطرت کہنے کے مرادف ہے اور اہل حدیث کا نام فخر سے لیا جاتا ہے۔ اجماع اور سلف و خلف کی آراء سے بلکہ بخاری کے کوئی ایک باب باندھ دینے سے قرآن کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ایک ایک درویش اور مولوی کی مرضی قرآن پر قاضی بنی ہوئی ہے۔ قرآن کو محض اس کی روانی اور اسی کے منشاء اور اسی کے رنگ میں نہیں دیکھا جاتا۔ ... بعض لوگ مغالطہ دیتے ہیں کہ چونکہ رسولوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم اور حکم ملا ہوتا ہے۔ اس لئے ان کا فہم کبھی غلطی نہیں کرتا۔ ہماری گذارش یہ ہے کہ دوسرے محسنین (نیکوکاروں) کو بھی اسی طرح خدائے تعالیٰ کی طرف سے علم و حکم ملا ہوتا ہے۔ (یعنی ان لوگوں کو جو نبی نہ ہونے کے باوجود احکام خداوندی کے ساتھ فیصلے کرتے ہیں) تو کیا وہ بھی حکم و علم کے مل جانے سے معصوم عن الخطا ہو جاتے ہیں؟ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور حضرت یوسف علیہ السلام کو نبوت سے پہلے ہی حکم و علم عطا کر دیا گیا تھا تو کیا وہ اسی حال میں معصوم عن الخطاء ہو گئے تھے دیکھئے ($\frac{۱۲}{۲۲}$ اور $\frac{۲۸}{۱۴}$) نیز حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے متعلق اوپر گذر چکا ہے کہ حق تعالیٰ نے دونوں کو علم و حکم عطا

فرمایا ہوا تھا لیکن بکریوں کے مقدمہ میں اس کے باوجود حضرت داؤد صحیح فیصلہ نہیں دے سکے۔ اور حضرت سلیمان نے صحیح فیصلہ کیا۔ ملاحظہ ہو (۲۱/۷۹)

افسوس ہے کہ رسولوں کو بشر نہیں سمجھا جاتا۔ اور ان کے لئے جو انعام قرآن میں بیان ہوئے ہیں ان کے معنے ما فوق البشر حالت کے کرتے ہیں۔ کیا بلقیس ملکۂ سبا کیلئے قرآنِ کریم میں

اُوْتِیَتْ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ ۔ (۲۷/۲۳)

اسے ہر طرح کی چیزیں دی گئی تھیں۔

کے معنے تو بشری حالت (یعنی بشری احاطۂ اقتدار) کے ہیں اور حضرت داؤد وسلیمان علیہما السلام کے لئے جب قرآن اُوْتِیْنَا مِنْ کُلِّ شَیْءٍ (۲۷/۱۶) کے الفاظ استعمال کرے تو اس کے معنی فوق البشر حیثیت کے کئے جائیں گے؟ اور کیا جب آلِ فرعون کا ایک مردِ مؤمن

اِتَّبِعُوْنِ اَھْدِکُمْ سَبِیْلَ الرَّشَادِ (۴۰/۳۸)

تم میری پیروی کرو میں تمہیں نیکی کی راہ دکھاؤں گا۔

کہے تو کچھ اور مطلب ہوتا ہے۔ اور رسول اِتَّبِعُوْنِی فرمائیں یعنی

اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ (۳/۳۱)

اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبت فرمائیگا

کہیں تو اس کا مطلب کچھ اور ہونا چاہیئے۔ مطلب یہ کہ جب آلِ فرعون کے مردِ مؤمن کے یہ کہنے سے کہ میری اتباع کرو۔ اس کی ذاتی اتباع مراد نہیں تھی، بلکہ اس ضابطہ کی اتباع مراد تھی جس کی وہ خود اتباع کرتا تھا تو اسی طرح رسولوں کے یہ کہنے سے کہ "میری اتباع کرو" کیوں اس ضابطہ کی اتباع مراد نہیں جس کی رسولِ اکرم خود اتباع کرتے تھے۔ افسوس!!

فَمَا لِھٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا یَکَادُوْنَ یَفْقَھُوْنَ حَدِیْثًا (۴/۷۸)

اس قوم کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ بات کو سمجھنے کے قریب ہی نہیں آتی۔

حکم وعلم بہت بڑی چیز ہے جس طرح آنکھیں بہت بڑی نعمت ہیں۔

مگر با وجود آنکھوں کے آدمی گڑھے میں گر پڑتا ہے تو کیا اس سے آنکھوں کا نعمت ہونا جاتا رہتا ہے۔ (یا اس سے بشری تقاضوں کا اظہار ہوتا ہے؟) اسی طرح کیا رسولوں کی غلطیاں (سہو و نسیان اور خطا) کرنے سے اُنکے انعامات بے حقیقت ہو جاتے ہیں؟ افسوس ہے کہ یہ لوگ جب کسی کو بڑھاتے ہیں تو آسمان پر چڑھا دیتے ہیں اور جب گراتے ہیں تو خدائے حکیم و رحیم کی عاقل مخلوق بھی بنانا گوارہ نہیں کرتے۔ صراطِ مستقیم کا نام ہی نام ہے لیکن اس سے کام لینا معلوم نہیں۔

انبیاء سے اِجتہادی غلطی ممکن ہے

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حق تعالےٰ اپنی وحی انبیاء پر نازل کرتا ہے اور وہ وحی انبیاء کے ذریعہ سے دیگر لوگوں تک پہنچتی ہے۔ لیکن ایک تو وحیٔ الٰہی کو حاصل کرنا، دوسرے اس وحی الٰہی کو دوسروں تک پہنچانا، اور تیسرے اس وحی کی تشریح و تفسیر کرنا۔ یہ تینوں کام الگ الگ ہیں جہاں تک پہلے دونوں کاموں کا تعلق ہے اس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہو سکتا۔ لیکن جہاں تک تیسرے کام کا تعلق ہے یعنی وحی الٰہی کی تشریح اور تفسیر کرنا۔ تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رسول اس میں پورا پورا تدبّر و تفکر کرتا ہے۔ لیکن تدبر و تفکر انسانی فہم کا کام ہے اور بشری فہم لغزش بھی کر جاتا ہے یقیناً آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم قرآن کریم پر تدبر فرماتے تھے۔ لیکن بعض مرتبہ وحی الٰہی کی تشریح میں آپ سے اجتہادی غلطی بھی ہو جاتی تھی۔ آیۂ مبارکہ ہے

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (۹/۸۰)

اے پیغمبر! آپ ان منافقین کے لئے استغفار کریں یا استغفار نہ کریں (بیکار ہے) اگر آپ ان کے لئے ستر مرتبہ بھی استغفار کریں گے تو اللہ ان کی ہرگز مغفرت نہیں فرمائے گا۔

اس آیتِ کریمہ کے فہم میں حسبِ روایاتِ بخاری و بقول مفسرین رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا فہم حقیقت سے دور نکل گیا تھا۔ اور حضرت عمرؓ کا فہم صحیح تھا۔ آخر قرآن نے بھی حضرت عمرؓ کے فہم کی تصدیق فرمائی، اسی لئے حق تعالےٰ فرماتا ہے کہ

قُلْ إِنْ ضَلَلْتُ فَإِنَّمَا أَضِلُّ عَلَىٰ نَفْسِي ۖ وَإِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوحِي إِلَيَّ رَبِّي ۚ إِنَّهُ سَمِيعٌ قَرِيبٌ ۝ (۳۴/۵۰)۔ اے پیغمبر! کہدو کہ اگر میں بھول جاؤں تو میں اپنے نفس کیوجہ سے بھولتا ہوں اور اگر میں ہدایت پاؤں تو اس وحی کے سبب سے ہے جو میرا رب میری طرف کرتا ہے۔ سچ مچ وہ سننے والا قریب ہے۔

اور نیز فرمایا کہ اے رسول! مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ۖ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ ۚ وَأَرْسَلْنَاكَ لِلنَّاسِ رَسُولًا ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ۝ (۴/۷۹)۔ اے پیغمبر! جو کچھ بھلائی تمہیں پہنچتی ہے تو وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اور جو بُرائی تمہیں پہنچتی ہے تو وہ تمہارے نفس کی طرف سے ہے۔ اور ہم نے آپ کو پوری نوعِ انسانی کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اس پر اللہ ہی گواہ کافی ہے۔

کیا حق تعالیٰ رسول اللہ کی تمام اغلاط کی تصحیح فرما دیتے ہیں

حضرات علمائے کرام کی طرف سے یہ بات تسلیم کر لینے کے بعد کہ حضرات انبیاء کرام سے اجتہادی غلطیاں اور سہو و نسیان ہو سکتا ہے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ رسول سے اگر بشری

کمزوری کی بناء پر کبھی اِجتہادی غلطی سرزد ہو جائے یا وہ بھول چوک کا مرتکب ہو جائے تو حق تعالیٰ اس کی اصلاح فرما دیتے ہیں اور ان غلطیوں کو نکال دیتے ہیں۔ لہٰذا وہ غلطیاں باقی نہیں رہتیں۔ اس بنا پر انبیاء کے اقوال وافعال شرعی حجت ہیں۔ اور یہ کہ جس بات کی حق تعالیٰ نے اصلاح نہیں فرمائی جس بھول چوک کی حق تعالیٰ نے تصحیح نہیں فرمائی وہ لازماً صحیح اور درست ہونی چاہیئے اس لئے قابلِ اتباع اور لائق اطاعت بھی ہونی چاہیئے نیز یہ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی پُوری زندگی مسلمانوں کے لئے اسوۂ حسنہ یعنی قابلِ اتباع جب ہی ہو سکتی ہے جبکہ اس کی صحت کا کوئی انتظام کیا جائے اور صحت کا انتظام یہی ہو سکتا ہے کہ تبقاضائے بشریت اگر آپ سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو حق تعالیٰ اس کی اصلاح فرما دیں۔

اس بیان میں حضرات علمائے کرام کی طرف سے دو دعوے فرمائے گئے ہیں۔ پہلا دعویٰ یہ ہے کہ رسولؐ اگر تبقاضائے بشریت کبھی کوئی غلطی کرتا ہے۔ تو حق تعالیٰ ضرور اس کی غلطی کی اصلاح فرما دیتے ہیں۔ جہاں تک ہمارے علم کا تعلق ہے۔ قرآن نے کہیں ایسا وعدہ نہیں فرمایا کہ اے پیغمبر اگر کبھی تو غلطی کرے گا۔ تو ہم ضرور ہی اس کی اصلاح فرما دیں گے۔ قرآن کریم میں بیشک آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو بعض غلطیوں پر تنبیہ فرمائی گئی ہے اور بعض غلطیوں کی اصلاح بھی فرمائی گئی ہے لیکن قرآنِ کریم نے تو دوسرے انسانوں (غیر انبیاء) کی غلطیوں پر بھی بہت سی تنبیہیں فرمائی ہیں اور دسیوں غلطیوں کی اِصلاح فرمائی ہے۔ پُورا قرآن علمائے بنی اسرائیل، احبار و رہبان کی بداعمالیوں پر تنبیہات سے بھرا ہوا ہے۔ اور کفار ومشرکین کے اعمال پر گرفت اور صحیح طریقہ کی نشاندہی سے بھرا ہوا ہے تو کیا یہ سمجھا جائے کہ بنی اسرائیل کے احبار و رہبان اور علماء کے جن اعمال پر تنبیہ فرما دی گئی ہے ان کے علاوہ انکے دیگر اعمال لازماً صحیح ہیں۔ کیونکہ ان پر کوئی تنبیہ نہیں آئی یا عرب کے کفار ومشرکین کے جن اعمال کی تغلیط نہیں کی گئی وہ لازماً صحیح ہیں۔

اسی طرح قرآن کریم میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اور خود صحابۂ کرام کی بعض غلطیوں پر تنبیہ فرمائی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ تحریم میں ازواج مطہرات کے متعلق اور غزوۂ احد اور غزوۂ حنین میں صحابۂ کرام کے متعلق تنبیہی آیات آئی ہیں۔ اور ان کی غلطیوں کی اصلاح فرمائی گئی ہے۔ تو کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ ازواج مطہرات اور صحابۂ کرام کے باقی تمام اعمال لازماً صحیح ہیں؟ کیونکہ قرآن نے ان کے ایمان کو دوسروں کے لئے معیار بنایا ہے کہ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (۲/۱۷) اور ان کے طرز عمل کی پیروی نہ کرنے والوں کو جہنمی بتایا ہے۔

وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ (۴/۱۴)

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف غلطیاں ہی نہیں نکالتا بلکہ قرآنی دستور العمل میں آپ کی حیات طیبہ کی تمام ضروری باتیں بھی درج کرتا ہے۔ اگر غلطیوں کے بتانے سے باقی باتیں صحیح سمجھی جا سکتی ہیں تو صحیح باتوں کے بتانے سے باقی باتیں ضرور غلط تسلیم کی جانی چاہئیں۔ حالاں کہ ہر دو قسم کی باتیں قرآن پاک میں صرف اسی حد تک لائی گئی ہیں جو وحی والے دستور العمل میں لانی ضروری تھیں باقی باتوں کو عقلی دائرہ ہی میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ جنہیں عقلی طور پر غلط یا درست یا بے ضرر قرار دیا جا سکتا ہے نہ کہ سب کی سب کے متعلق یہ فیصلہ صادر کر دیا جائے کہ وہ سب غلط ہیں یا سب صحیح ہیں۔ رہ گیا اسوۂ حسنہ تو اس کے متعلق ہم آیندہ بحث کریں گے۔

قرآن کریم میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تعیین کے ساتھ بیان کئے بغیر اپنے ذنب (لغزش، خطا) سے استغفار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ ۔ (۴۰/۵۵، ۴۷/۱۹)

اور اے پیغمبر! اپنی لغزش اور غلطی سے استغفار کیجئے۔

مبہم لغزشیں ان لغزشوں کے علاوہ ہیں جن کا تذکرہ صراحت کے ساتھ قرآن

یں کر دیا گیا ہے۔ جن لغزشوں کا مبہم تذکرہ کیا گیا ہے اور ان کی اصلاح نہیں فرمائی گئی ان کے متعلق کیا کہا جائے گا؟

بہت سے انبیاء نے سوختنی قربانیاں کی ہیں۔ خدا نے ان کی غلطی نہیں بتائی۔

اَلَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ عَہِدَ اِلَیْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰی یَاْتِیَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْکُلُہُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَکُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِیْ بِالْبَیِّنٰتِ وَبِالَّذِیْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْہُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۔ (۳/۱۸۳)۔

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کہا کہ اللہ نے ہم سے عہد لیا ہوا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک وہ ایسی قربانیاں لے کر نہ آئے جسے آگ کھا لیتی ہو (یعنی سوختنی قربانیاں) اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے کہ مجھ سے پہلے بہت سے رسول واضح نشانیاں لے کر آچکے ہیں اور وہ نشان لے کر بھی آچکے ہیں جو تم بتا رہے ہو تو تم نے انہیں قتل کیوں کر دیا اگر تم سچے ہو۔

چنانچہ دو آدم کے بیٹوں (دو انسانوں) کا واقعہ خود قرآن نے بیان کر دیا ہے۔

وَاتْلُ عَلَیْہِمْ نَبَاَ ابْنَیْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِہِمَا وَلَمْ یُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ

اور اے پیغمبر! ان کو آدم کے دو بیٹوں (دو انسانوں) کا سچا حال سنا دیجئے۔ جب ان دونوں نے قربانی پیش کی تو ایک کی قربانی قبول ہو گئی۔ اور دوسرے کی قربانی قبول نہ ہوئی۔

اہلِ روایات کا بیان ہے کہ ایک کی قربانی قبول ہو جانے کا علم اسی طرح ہوا تھا کہ ایک کی قربانی کو آگ نے جلا دیا۔ اور دوسرے کی قربانی کو آگ نے

نہیں جلایا۔ بہرحال یہ سوختنی قربانیاں ہزارہا سال تک ہوتی رہیں اور انبیاء و رسل بھی یہ قربانیاں پیش کرتے رہے۔ اور حق تعالیٰ نے ان کو ان کی غلطی نہیں بتائی۔ ہزاروں سالوں کے بعد اس فضول ہون کی رسم کو قرآن نے آکر دُور کیا۔ کسی نبی کے تمام کے تمام اختیاری کاموں کی اصلاح خدا نے ہرگز ہرگز اپنے ذمہ نہیں لی۔

حضرت یونس علیہ السلام سے ایک غلطی سرزد ہوئی۔ حق تعالیٰ نے خود سے ان کی غلطی کی کوئی اصلاح نہیں فرمائی۔ انہوں نے دعاء کی، حق تعالیٰ کو ان پر رحم آیا ورنہ وہ مچھلی کے پیٹ ہی میں فوت ہو کر خدا کے حضور میں پیش ہو جاتے۔

فَلَوْلَا اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ. لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِهٖۤ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ٥ (۳۷/۱۴۳-۱۴۴) — اگر وہ خدا کے حضور عاجزی نہ کرتے اور دعا کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو وہ ضرور مچھلی ہی کے پیٹ میں اس دن تک رہتے جب سب اٹھائے جائیں گے (یعنی قیامت کے دن تک)

اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ پر ان کی اصلاح ان کی زندگی ہی میں لازم نہ تھی۔

معاذاللہ معاذاللہ! بفرض محال اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے شرک سرزد ہو جاتا تو اس صورت میں حق تعالیٰ پر یہ لازم نہیں تھا کہ انہیں جہنم تک پہنچنے نہ دے۔ اس سے پہلے ہی پہلے جبراً ان کی اصلاح فرما دے۔ بلکہ حق تعالیٰ اس صورت میں فرماتے ہیں کہ تو جہنم میں ڈال دیا جاتا۔

ذٰلِكَ مِمَّاۤ اَوْحٰۤى اِلَیْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِیْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝ (۱۷/۳۹) — اے پیغمبر! یہ ان حکمت کی

باتوں میں سے ہے جو آپ کے پروردگار نے آپ کی طرف وحی فرمائی ہے اور اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بنا لینا کہ تم جہنم میں ملامت کئے ہوئے دھتکارے ہوئے بنا کر ڈال دیئے جاؤ۔

نیز قرآن کریم کے مطابق اگر رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم (خاکم بدہن) کفار کی طرف جھک جاتے تو حق تعالٰے فرماتے ہیں کہ اس وقت ہم تجھے زندگی اور موت کا دگنا عذاب چکھاتے

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ۝ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۝ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ۝ (۱۷-۷۳-۷۵)۔ اور بے شک ممکن تھا کہ وہ آپ کو اس سے بہکا دیں جو ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے تاکہ آپ اس وحی کے علاوہ کا ہم پر بہتان لگا دیں۔ اس بہکانے کی صورت میں وہ آپکو اپنا عزیز ترین دوست بنا لیتے۔ اور اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو آپ قریب قریب ان کی طرف تھوڑا سا جھکنے ہی لگے تھے۔ ایسا ہوتا تو ہم آپ کو زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی دوگنی سزا کا مزا چکھا دیتے اور ہمارے خلاف آپ کسی کو اپنا مددگار نہ پاتے۔

اس صورت میں پہلے ہی خصوصی طور پر رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو کفار کی طرف جھکنے سے روک نہیں لیا کہ اس کی نوبت ہی نہ آئی کہ آپ قریب قریب ان کی طرف جھکنے کے قریب ہو جائیں۔

اگر خدا نخواستہ خدا نخواستہ رسول کریمؐ اپنے کسی قول کو جو خدا نے نہ فرمایا ہوتا اُسے خدا کا قول بتاتے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ خدا ہی کا

قول ہے (وہ وحی خفی ہے یا وحی غیر متلو مگر ہے وحی) تو حق تعالٰے فرماتے ہیں کہ ہم رسول کو قتل کر دیتے۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ۝ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ۝ فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ۝ (۶۹ / ۴۴-۴۷) ۔ اور اگر وہ (یعنی پیغمبر) ہمارے ذمے کچھ (اپنی) بناوٹی باتیں لگاتا تو ہم اسے اس کے دائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے اور پھر اس کی رگ گردن کاٹ ڈالتے پھر تم میں سے کوئی بھی ہمیں اس سے روکنے والا نہ ہوتا۔

یہ نہیں فرمایا کہ ہم زندگی ہی میں اسے ایسا نہ کرنے دیتے اور جبراً اسے اس سے روک دیتے۔ وغیرہ وغیرہ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے اقوال بھی ہوتے تھے۔ جو خدا کے اقوال یعنی وحی نہیں ہوتے تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان اقوال کو اپنے اقوال ہی فرماتے تھے۔ اللہ کی طرف منسوب نہیں فرماتے تھے۔ وعید اس بات پر کی جارہی ہے کہ وہ اگر ان اقوال کو خدا کے اقوال کہدیتے تو ہم ان کی رگِ گردن قطع کر دیتے۔ اقوال کے وجود کا انکار نہیں ہے۔

اجتہادی سہو قرآن میں بیان کردہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اجتہادی غلطیوں کے علاوہ بھی بہت سی غلطیاں اور سہو ہمارے علماء کرام خود بھی تسلیم کرتے ہیں۔ دوسرے انبیاء کرام کی بشری کمزوریوں کے نمونے بھی خود قرآنِ کریم میں جابجا بیان ہوئے ہیں اور یہ بات آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہے کہ جو بات غلط ہوتی ہے وہ وحی سے یا کسی ایسے طریق سے جو وحیٔ الٰہی کا ہم معنی ہو ملی ہوئی نہیں ہوسکتی۔ پس یقیناً رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ایسی باتیں بھی تھیں جو حضورؐ کے اپنے بشری اور محدود فہم و اختیار کا نتیجہ تھیں۔ بعض لوگ

حقیقت پر پردہ ڈالنے اور واقعہ کو چھپانے کے لئے کہدیا کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے غلطیاں تو ہو جاتی تھیں مگر وہ غلطیاں دینی مسائل میں نہیں ہوتی تھیں۔ غیر دینی چیزوں میں ہو سکتی تھیں۔ اس پر بڑے ادب کے ساتھ گذارش ہے کہ اگر وہ غلطیاں دینی مسئلوں میں نہیں تھیں تو حق تعالے کو اپنے قرآن میں آیتیں اتار کر تنبیہیں نازل فرمانے کی کونسی ضرورت پڑ گئی تھی؟ غیر دینی باتوں کی دین میں کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔ قرآن ایک خالص دینی کتاب ہے۔ اس میں ان باتوں پر تنبیہ کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا تعلق خالصتہً دین سے تھا جبھی تو قرآن کو ان کا نوٹس لینا پڑا۔

کیا خدا کی حلال کردہ چیزوں کو اپنی بیویوں کی رضامندی کیلئے حرام کر لینا اور پھر اس پر قسم کھا لینا مطلقاً کوئی دینی مسئلہ نہیں تھا؟

یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ ج تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِکَ ط وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

(۶۶/۱) اے نبی! آپ ان چیزوں کو جنہیں اللہ نے آپ کے لئے حلال کیا ہے کیوں حرام کرنے لگے ہیں۔ آپ اپنی بیویوں کی خوشنودیاں چاہتے ہیں۔ اور اللہ بڑا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

یا کیا ظہار کی بد رسم کی مخالفت چاہنے والی عورت کے ساتھ جھگڑا ہونا کسی دینی مسئلہ سے بالکل لا تعلق تھا؟

قَدْ سَمِعَ اللّٰہُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُکَ فِیْ زَوْجِھَا وَتَشْتَکِیْ اِلَی اللّٰہِ ق وَاللّٰہُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَکُمَا ط

(۵۸/۱) خدا نے اس عورت کی بات سن لی ہے جو (اے نبی!) آپ سے اپنے شوہر کے بارہ میں جھگڑ رہی تھی اور اللہ سے شکایت

کہہ رہی تھی اور اللہ تم دونوں کی گفتگو کو سن رہا تھا۔

مفسرین کے بقول حضرت زینبؓ سے نکاح کے سلسلہ میں رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم لوگوں سے ڈرتے تھے۔ حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ آپ اسی سے ڈرتے وَ تَخْشَی النَّاسَ وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰہُ (۳۳/۳۷) ـــــ مفسرین کہتے ہیں کہ اسی لئے حق تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ اے نبی اللہ سے ڈر اِتَّقِ اللّٰہَ (۳۳/۱)۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ غیر خدا کا خوف کوئی دینی مسئلہ نہیں تھا بلکہ کوئی گھریلو مسئلہ تھا، اس پر بھی اگر یہی کہا جاتا رہے کہ دینی باتوں میں کوئی غلطی یا سہو نہیں ہوتا تھا تو ہمارے پاس اس ضد کا کوئی علاج نہیں ہے۔

بھول چوک خاصۂ بشریت ہے

اس میں بھی کوئی کلام نہیں ہے کہ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم بھولنے والے بشر تھے۔ اور بھولنے والے آدمؑ کی اولاد تھے اور یہ ظاہر ہے کہ بھولنے والا ضرور غلطیاں کرتا ہے۔ غلطی، مناسب موقعہ پر مناسب بات کے بھول جانے ہی کو کہتے ہیں۔ تکلیفیں بھی بالعموم غلطیوں ہی کا نتیجہ ہوتی ہیں، سورۂ نساء میں ہے

مَا اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (۴/۷۹)

جو مصیبت آپ پر آئی وہ آپ کے نفس کی وجہ سے ہے۔

اور یہ قطعاً مسلّم ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو بالضرور تکلیفیں تو پہنچ جاتی تھیں۔ تکلیفوں غلطیوں اور سہو و خطا سے صرف وہی بچ سکتا ہے جو غیب داں ہو۔ رسولِ اکرم بحکم خدا ارشاد فرماتے ہیں کہ

وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚ (۷/۱۸۸)

اگر میں غیب جانتا ہوتا تو بہت سی بھلائی اکٹھی کر لیتا اور
مجھے کوئی برائی نہ پہنچتی۔
حاصل یہ ہے کہ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سہو و نسیان اور غلطیوں
اور تکلیفوں سے ہرگز مبرّا نہیں تھے۔ البتہ

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ
وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝ (۲۱/۲۶-۲۷)۔ بلکہ وہ (یعنی انبیاء)
عزت والے بندے ہیں۔ وہ اس سے بات کرنے میں سبقت
نہیں کرتے اور وہ اسی کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔

کے مطابق آپ کے سہو اور غلطی میں ارادۂ خطا کو دخل تک نہیں
تھا۔ عمداً آپ کوئی غلطی نہیں کرتے تھے، اس کا واقعی امکان بھی
نہیں تھا۔ کہ آپ ارادۃً کوئی غلط کام کریں اور آپ سے عمداً کوئی
غلطی سرزد ہو۔

بشری جذبات بھی خاصۂ بشریت ہیں

پھر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ (۱۸/۱۱۰)
اے پیغمبر! کہہ دیجئے کہ میں تمہارے جیسا ہی ایک انسان ہوں،
(فرق یہ ہے کہ) مجھ پر وحی آتی ہے۔

کے مطابق بشر ہونے کے سبب بشری جذبات بھی رکھتے تھے
چنانچہ غم اور غصے سے مبرّا نہ تھے۔ اور ظاہر ہے کہ جو باتیں جذبات
کے تحت واقع ہوں، وحی الٰہی سے ہرگز نہیں ہو سکتیں۔ حتیٰ کہ
خود حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ مسلم میں حضرت عائشہ
رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا کہ "الٰہی! میں بشر ہوں، سو جس مسلم کو میں لعنت کروں یا

بُرا بھلا کہوں تو تو میرے اس کہنے کو اس کے لئے پاکیزگی اور اجر کا باعث بنا دے۔" اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایسی باتیں بھی کرتے تھے جن سے آخر پچھتاتے تھے اور استغفار بھی کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس قسم کی باتیں وحی الٰہی سے نہیں ہو سکتیں۔

کفار کہتے تھے کہ اس رسول نے قرآن مجید کو اپنی طرف سے بنا لیا ہے۔ اس کے جواب میں آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ میرا تو اپنی طرف سے کوئی بات کرنا ممکن ہی نہیں (یعنی میری تو تمام باتیں وحی ہوتی ہیں۔ کچھ وحی جلی اور باقی وحی خفی۔ میری اپنی طرف سے کوئی بات ہوتی ہی نہیں) بلکہ انکے جواب میں آپ نے یہ فرمایا کہ بشریت کے لحاظ سے جو کام میرے لئے ممکن ہو سکتا ہے وہ تمہارے لئے بھی ممکن ہے سو اگر میں نے یہ قرآن اپنی طاقت، عقل فہم و اختیار سے بنا لیا ہے تو یہ چیزیں تو میری مانند تمہارے پاس بھی موجود ہیں تم سب مِلکر اس کی مانند بنا لاؤ۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿۱۷/۸۸﴾۔ اے پیغمبر! کہدیجئے کہ اگر تمام انسان اور جن جمع ہو جائیں کہ اس قرآن جیسی کوئی کتاب لے آئیں تو وہ اس کے مثل نہیں لا سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہو جائیں۔

پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس طاقت، عقل، فہم و اختیار کے کام جو دوسرے انسان بھی کر سکتے تھے ہرگز وحی الٰہی یا وحی کے ہم معنے نہیں ہو سکتے۔

قرآن کریم خود بنا لینا آنحضرتؐ کیلئے بھی ممکن نہیں تھا۔ اس سے

یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کے پاس جو چیز حضورؐ کی اپنی طاقت عقل، فہم و اختیار سے بڑھ کر تھی وہ صرف قرآنِ مجید اور کتابِ حمید ہی تھی۔ ورنہ قرآنِ کریم کے علاوہ کسی اور چیز کے متعلق بھی ضرور ایسا ہی دعویٰ ہوتا۔ بالفاظ دیگر اگر حضورؐ کے اقوال مبارکہ بھی وحی ہی کے تصرف سے ہوتے تو یہ دعویٰ بھی کیا جاتا کہ قرآن کے علاوہ کوئی حدیث یعنی وحی خفی ہی بنالاؤ۔ لیکن اقوال رسول کے متعلق کوئی ایسا چیلنج ہرگز نہیں دیا گیا۔ اور دیا بھی کیسے جا سکتا تھا جبکہ لوگوں نے بغیر چیلنج ہی کے وضعی احادیث کے ڈھیر لگا دیئے ہیں۔

اسوۂ حسنہ کہا جاتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیّبہ کو چونکہ تمام مسلمانوں کے لئے "اسوۂ حسنہ" (قابلِ تقلید نمونہ) قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ آپ کی زندگی بے داغ ہو اور آپ سے خطائیں اور غلطیاں سرزد نہ ہوں اور اگر تقاضائے بشریت سے کبھی کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو فوراً اس کی اصلاح کر دی جائے۔ اس لئے آپ سے اگر کوئی غلطی یا لغزش سرزد ہو جاتی تھی تو وحی جلی یعنی قرآن سے اس کی لازمی اصلاح کر دی جاتی تھی۔ اسی وجہ سے آپ کے ارشادات و اقدامات جن کی وحی جلی سے اصلاح نہیں کی گئی۔ اور ان پر خاموشی اختیار فرمالی گئی وہ دین میں حجت ہیں۔ اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے مناسب ہے کہ اس کی حقیقت بھی واضح کر دی جائے ——— یہ بات آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہے کہ ہمیں اسی کام کے کرنے کا حکم ہو سکتا ہے جو ہم اپنے اختیار سے کرتے ہیں۔ اسی طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بھی اپنی انسانی استطاعت اور اختیار کے مطابق ہی مامور ہو سکتے ہیں۔ مجبوری کی باتوں میں جنہیں کوئی کر ہی نہ سکتا ہو کسی کو متابعت و پیروی

کا حکم دینے کے کوئی معنی نہیں۔ وحی الٰہی انسان کے اختیاری دخل کے بغیر صرف تصرف الٰہی سے ہوتی ہے۔ اور وہ خدا کا کام ہے جسے وہ خود ہی کرتا ہے۔ اور اگر وحی کا ہونا ضروری ہے تو بالضرور وحی کا کوئی صحیح دستور العمل خود خدا نے اپنے تصرف خاص سے دُنیا میں پہنچایا ہوا ہے۔ اب اس بے اختیاری کام میں کسی رسول کو یہ حکم نہیں دیا جا سکتا کہ ضرورت پڑے تو مجھ سے اختیاری طور پر وحی حاصل کر لیا کرو۔

اسی طرح رسول کی پیروی بھی انہی کاموں میں کی جا سکتی ہے جو ہمارے اختیار اور طاقت میں ہوں اور کوئی شخص ہمارے لئے اسی صورت میں نمونہ کہلا سکتا ہے کہ ہم اس کی پوری پوری پیروی کر سکیں اور اپنے اختیاری کاموں میں ہو بہو اس کے مثل بن سکیں۔ اور جب ہم اس کے مثل بن جائیں گے تو خود بھی آگے کو بالتّبع ویسا ہی نمونہ ہوں گے باوجود اس کے ہم اس وقت بھی ویسے ہی بشر اور غلط کار اور غیر معصوم ہی رہیں گے۔ بے اختیاری کے کاموں میں رسول کریم ہرگز ہمارے لئے نمونہ نہیں ہو سکتے۔ مثلاً ہمیں یہ حکم نہیں مل سکتا کہ جس طرح حق تعالیٰ اپنے رسول کو وحی فرماتے ہیں تم بھی وحی حاصل کر لیا کرو۔ پس رسول کے نمونہ ہونے کے یہی معنے ہو سکتے ہیں کہ جس طرح وہ نیک نیتی سے حق کی پیروی کرتا ہے۔ تم بھی کرو۔ جس طرح وہ اپنی غلطی (سہو و نسیان) کو معلوم کر کے اس پر جما نہیں رہتا بلکہ فوراً اس سے الگ ہو جاتا ہے۔ اور استغفار کرتا ہے۔ تم بھی غلطی سے فوراً ہٹ جایا کرو۔ جس طرح وہ اپنی غلطی (سہو) کو آئندہ کے لئے سند نہیں بناتا اور حق کی پیروی کی ہی تاکید کرتا ہے۔ اسی طرح تم بھی کیا کرو۔ داناؤں کا اسوۂ حسنہ یہی ہوتا ہے۔ نہ یہ کہ خود تو اپنے تمام اختیاری کاموں میں بشریت کی حد سے بڑھ کر معصوم عن الخطا بن جائیں اور دوسروں کے متعلق کہیں کہ تمہارا معصوم

عن الخطا ہونا محال ہے۔ اور پھر نمونہ کی پیروی سکھلا کر اسی محال کا حکم بھی دیں۔ حاشا و کلا ـــــ معصوم شخص یہ تو کہہ سکتا ہے کہ جس طرح میں تمہاری کمزوریوں کے مطابق حکم کرتا ہوں اس پر چلو۔ لیکن ایک معصوم عن الخطا (بے غلط) شخص (بشرطیکہ کوئی ہو) ان لوگوں کو جن کا معصوم عن الخطا ہونا محال ہے۔ کبھی نہیں کہہ سکتا کہ تم میری مانند بنجاؤ۔ یہ بحث ہم نے عقلی طور پر حل کر دی ہے۔ ورنہ اسوۂ حسنہ والی آیت میں یہ کہیں نہیں فرمایا گیا کہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم تمہارے لئے ہمیشہ کے واسطے ہر بات میں معصوم عن الخطا (یعنی بے سہو) نمونہ ہیں۔ بلکہ جنگِ احزاب کے ابتلاؤں میں رسول کریم سے ثابت قدمی کا وعظ کرا کے اور بعض لوگوں کی بزدلی دکھلا کے ساتھ ہی فرمایا ہے کہ تمہارے لئے اللہ کے رسول کی اِستقامت ایک نمونہ تھا جس پر کاربند ہونا چاہیئے تھا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳/۲۱)

دوسری جگہ ایسے ہی الفاظ حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھ والوں کے متعلق بھی آئے ہیں کہ تمہارے لئے ان میں ایک نمونہ ہو چکا ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ (۶۰/۴)۔ تم لوگوں کے لئے ابراہیمؑ اور ان کے ساتھی صحابہ کرام میں ایک اچھا نمونہ ہے۔

اس کے ایک آیت بعد مزید فرمایا کہ

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ (۶۰/۶)۔ انہی لوگوں (ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں) کے طرزِ عمل میں تمہارے لئے اور ہر اُس شخص

کے لئے اچھا نمونہ ہے جو اللہ اور روزِ آخر کا امیدوار ہو (اور ان پر ایمان رکھتا ہو)

تو کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھی صحابۂ کرام سب کے سب اس بیان کی وجہ سے معصوم عن الخطا (بے سہو اور بے غلط) بن گئے۔ یعنی کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھی سہو و نسیان سے مبرا بتائے گئے ہیں اور کیا حق تعالیٰ نے یہ ذمہ داری قبول فرمالی تھی کہ اگر ان صحابہ سے کبھی بتقاضائے بشریت کوئی غلطی سرزد ہوگئی تو میں ضرور ہی اس کی اصلاح اور درستگی کردوں گا تاکہ ان کے تمام اعمال و اقوال کو دین میں اسوہ قرار دیا جاسکے۔ ہمارا خیال ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔

بابِ پنجم

اہلِ حدیث کے بعض دلائل کا تجزیہ

حضرات علمائے اہلِ حدیث کا ارشاد ہے کہ " قرآن و حدیث کی مثال یوں سمجھنی چاہیئے کہ جیسے قانون سازی لیجسلیٹو کونسل کا کام ہے اور قانون کی تشریح و تفسیر ہائی کورٹ کا کام ہے۔ چنانچہ جس قانونی دفعہ پر ہائی کورٹ کسی صورت میں فیصلہ کردے تو وہ فیصلہ تمام صوبہ کے لئے مثل قانون کے نافذ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح قانون سازی قرآن کریم کا کام ہے۔ اور قانون کی تشریح و تفسیر حدیث نبوی کا کام ہے۔ جب حدیث نبوی کسی قرآنی فیصلہ کی تشریح و تفسیر کردے تو وہ مثل قانون کے نافذ ہو جاتی ہے اور اسے قانونی حیثیت حاصل ہو

جاتی ہے" لبقول ان کے حدیث نبوی کے ان احکام کو حق تعالیٰ نے بھی احکام الٰہیہ میں شمار کیا ہے۔ وہ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ:

(۱) سورۂ نساء میں ہے

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ۔ (۴/۷۷) اے نبی! آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کہا گیا تھا کہ جنگ سے ہاتھ بند رکھو اور نمازیں پڑھتے رہو۔

وغیرہ۔ اس آیت میں جو کُفُّوْا (جنگ سے ہاتھ بند رکھو) کا حکم ہے وہ قرآنی احکام میں کہیں نہیں ملتا۔ لیکن قرآنِ کریم اس حکم کو واجب الاتباع قرار دے کر مسلمانوں کو الزام لگا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ابتداءِ اسلام میں مسلمانوں کو جنگ سے ہاتھ بند رکھنے کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی دیا ہوگا۔ قرآنِ کریم، حضورؐ کے اس حکم کو (حدیثِ رسول کو) وحی الٰہی کا حکم قرار دیکر مسلمانوں کو الزام دے رہا ہے۔

(۲) نیز سورۂ بقرہ میں ہے:۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا۔ (۲/۱۴۳) اور ہم نے تو اس قبلہ کو جس پر آپ اس سے پہلے تھے محض وجہ آزمائش بنایا تھا۔

یعنی اے نبی جس قبلہ یعنی بیت المقدس پر آپ تھے ہم نے اسے اس لئے مقرر کیا تھا کہ پیروی کرنے والوں کو اتباع نہ کرنے والوں سے جدا کر دیں۔ اس آیت میں جَعَلْنَا (ہم نے بنایا تھا) کا مفعول بہ اَلْقِبْلَةَ کو بنایا گیا ہے اور بنانے کو فعل الٰہی بتایا گیا ہے (ہم نے بنایا تھا) حالانکہ قرآن کریم میں بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا حکم شروع سے آخر تک کہیں نہیں ہے کہ اسے اس آیت کا محکی عنہ بنایا جا سکے۔ لامحالہ یہی کہنا

پڑے گا کہ حق تعالےٰ نے تو نہیں لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو یہ حکم دیا ہوگا کہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو معلوم ہوا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم وحی خفی سے جو حکم دیں وہ حکم الٰہی کے برابر ہوتا ہے اور وہ دین میں حجت شرعی ہے۔

(۳) قرآنِ کریم میں ارشادِ الٰہی ہے

سَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ (۵۶/۴)

اور اپنے عظیم پروردگار کے نام کی تسبیح کیا کرو۔

اور

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى ۝ (۸۷/۱)

اور اپنے اعلیٰ پروردگار کے نام کی تسبیح کیا کرو۔

پہلی آیت کی نسبت حضورؐ نے فرمایا کہ اس پر رکوع میں عمل کرو۔ اور دوسری آیت کی بابت فرمایا، اس پر سجدہ میں عمل کرو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ ہم رکوع میں سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمُ کہتے ہیں اور سجدہ میں سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى کہتے ہیں۔ مقام غور ہے کہ اس ارشادِ نبوی سے کیا مفہوم ہوا۔ اس کا یہی مفہوم ہوا ناکہ مختلف مواقع اور محلوں میں سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع اور ایک محل کو متعین فرما دیا ہے۔

(۴) قرآنِ کریم نے خنزیر کی حرمت صراحت کے ساتھ بیان فرما دی ہے مگر کتے بلی کی حرمت قرآنِ کریم نے کہیں بیان نہیں فرمائی ان سب کی حرمت ایسے ہی دوسرے حرام جانوروں کی حرمت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے۔ اور پوری اُمت نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کو احکام الٰہیہ کی طرح قبول کیا ہے اور متفقہ طور پر سب نے ہی ان کو حرام مانا ہے اگر آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کے احکام کو مثل احکام الٰہیہ کے نہ مانا جائے تو کیا ان تمام جانوروں کو حلال کہہ دیا جائے؟"

علمائے اہلِ حدیث گے ان ارشادات کے جواب میں ہم بڑے ادب کے ساتھ عرض کریں گے کہ یہ مفروضہ صحیح نہیں ہے کہ جس بات کو نقل کیا جائے وہ قرآن میں بلفظہٖ موجود ہونی چاہیئے۔ قرآن کریم میں جن باتوں کو نقل کیا گیا اور ان کا بلفظہٖ قرآن میں تذکرہ نہیں ہے۔ تو یقیناً" اس کے معنی اور مفہوم کا تذکرہ (باختلافِ الفاظ) قرآن کریم میں ضرور موجود ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت ہم ایک مثال سے کرتے ہیں کہ سورۂ انعام میں ہے۔

وَاِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْھُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِہٖ ؕ وَاِمَّا یُنْسِیَنَّکَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّکْرٰی مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۔ (۶/۶۸) ——— اور اے پیغمبر! جب آپ ان لوگوں کو دیکھیں جو ہماری آیتوں میں خوض (نکتہ چینی) کرتے ہیں تو آپ ان سے اعراض کیجئے حتیٰ کہ وہ کسی دوسری بات میں اس کے علاوہ مشغول ہو جائیں، اور اگر آپ کو شیطان بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ظالم لوگوں کے ساتھ آپ نہ بیٹھئے۔

قرآنِ کریم کی اس آیت کریمہ سے قرآن اور غیر قرآن کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ یہ تو ہم نے ضمناً کہدیا۔ دراصل ہم یہ عرض کر رہے تھے کہ اسی حکم کے حوالہ سے سورۂ نساء میں پھر یہی حکم دوبارہ دیا گیا ہے۔

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَیْکُمْ فِی الْکِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰہِ یُکْفَرُ بِھَا وَیُسْتَھْزَاُ بِھَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَھُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِہٖٓ ۡ ۖ

اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ۝ (۴/۱۴۰) ۔ اور اللہ نے کتاب (قرآن) میں تم پر یہ حکم نازل کیا ہوا ہے کہ جب تم انہیں (کفار و مشرکین کو) سنو کہ اللہ کی آیتوں کے ساتھ کفر اور استہزاء کیا جا رہا ہے تو تم ان کے ساتھ نہ بیٹھو حتیٰ کہ وہ اس کے سوا کسی دوسری بات میں مشغول ہو جائیں (اگر تم ان کے ساتھ بیٹھے رہے تو) اب تم انہی جیسے شمار ہو گے۔ یقیناً اللہ منافقوں اور کافروں کو سب کو جہنم میں اکٹھا کرنے والا ہے۔

اس دوسری (سورۂ نساء کی) آیت میں سورۂ انعام کی پچھلی آیت کا صراحت کے ساتھ حوالہ دیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ "اللہ نے قرآن میں یہ حکم تم پر نازل کیا ہوا ہے۔" لیکن دونوں آیتوں کے الفاظ میں بڑا فرق ہے۔ البتہ منشاء اور مفہوم ایک ہے۔ لہٰذا حق تعالیٰ کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ جس حکم کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کے الفاظ بھی بعینہٖ وہی ہوں جو حوالہ میں نقل کئے گئے ہیں۔ البتہ منشاو مفہوم وہی ہونا چاہیئے۔

اسی طرح دیکھئے سورۂ توبہ میں حق تعالےٰ کا ارشاد ہے کہ

وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ۝ (۹/۸۶) اور جب کوئی سورت نازل کی جاتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ساتھ مل کر جہاد کرو تو جو ان میں سے مقدرت والے ہیں وہ آپ سے اجازتیں طلب کرنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں چھوڑ دیجئے ہم بیٹھنے والوں کے ساتھ پیچھے رہ جائیں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم میں ایسی سورتیں بھی نازل ہوئی

ہیں۔ جن میں یہ حکم تھا کہ اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَجَاھِدُوْا مَعَ رَسُوْلِہٖ۔ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ساتھ مل کر جہاد کرو) لیکن قرآن کریم میں واقعہ یہ ہے کہ سورۂ توبہ کی اس آیت (پ ۱۰/ ۸۶) کے سوا کہیں بھی کسی بھی سورت میں یہ الفاظ نہیں آئے۔ البتہ اس مطلب اور مفہوم کی بے شمار آیتیں موجود ہیں۔ یہ دو مثالیں ہم نے ایسی پیش کی ہیں جن میں باقاعدہ طور پر قرآن نے تصریح کر رکھی ہے کہ "قرآن میں یہ نازل ہو چکا ہے" یا "اس حکم کی متضمن کوئی سورت نازل ہو چکی ہے"۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ جس حکم کا حوالہ دیا جائے اس حکم کے بعینہ الفاظ کا قرآن میں ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ اس کے منشا اور مفہوم کا وجود ضروری ہے۔

اب اہلحدیث حضرات کی پہلی مثال کو لیجئے، کہا جاتا ہے کہ سورۂ نساء میں جو

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (پ ۵/ ۷۷)۔ اے پیغمبر! آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو (جنگ سے) روکو اور نمازیں پڑھتے رہو۔

اس آیت میں "ہاتھ بند رکھو" کے الفاظ ہیں۔ یہ الفاظ قرآن کی کسی اور سورت میں نہیں آئے۔ واقعی بعینہ یہی الفاظ تو قرآن کریم میں کہیں اور نہیں آئے مگر اس مفہوم کی آیات سے قرآن بھرا پڑا ہے۔ بہت سی آیات میں کفار سے درگذر کرنے اور ان کو معاف کر دینے کا حکم دیا گیا ہے۔

فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (پ ۱/ ۱۰۹)

تو معاف کر دو اور درگذر کرو حتیٰ کہ اللہ اپنا حکم لے آئے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ (اپنے ہاتھوں کو روکو) کا حکم بالفاظِ متبادل صاف موجود ہے۔ لہٰذا کوئی ضرورت نہیں کہ اسے حکم نبوی سے تسلیم کر کے وحی خفی کا دروازہ کھولا جائے۔

پھر سورۂ ھود میں ارشادِ الٰہی ہے۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ۭ اِنَّا عٰمِلُوْنَ

وَانْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۔ (۱۱/۱۲۱-۱۲۲) ۔۔۔۔ اے پیغمبر! جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان سے کہدیجئے کہ تم اپنی جگہ عمل کرتے رہو، ہم اپنی جگہ عمل کر رہے ہیں۔ حکم الٰہی کا انتظار کرو ہم بھی اس کے منتظر ہیں۔

(نتیجہ خود سامنے آجائے گا)

یہی بات الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ قرآن میں مزید تین مقامات پر آئی ہے۔ ملاحظہ ہو (۶/۱۳۵، ۱۱/۹۳ اور ۳۹/۳۹) نیز سورۃ انعام میں ہے

قُلِ انْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۔ (۶/۱۵۸) ۔ اے پیغمبر! کہدیجئے کہ (تھوڑا) انتظار کرو، ہم بھی انتظار کر رہے ہیں۔

یہی مفہوم قرآن کریم میں اور جگہوں پر بھی آیا ہے ملاحظہ فرمایئے (۷/۷۱، ۱۰/۲۰، ۱۰/۱۰۲، ۱۱/۱۲۲) پھر سورۃ کافرون میں یہ بتا کر کہ تم اس خدائے واحد کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں کرتا ہوں اور میں تمہارے ان معبودوں کی عبادت نہیں کر سکتا، فرمایا گیا ہے۔

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۔ (۱۰۹/۶)

تم اپنے دین پر خوش میں اپنے دین پر خوش۔

ان تمام آیات کا منشاء و مفہوم وہی ہے جو كُفُّوْا اَيْدِيَكُمْ (اپنے ہاتھوں کو روکو) کا ہے۔ مکہ معظمہ میں جنگ و جدال کی اجازت نہیں تھی۔ کفار و مشرکین کے ساتھ صبر، ضبط، تحمل، بردباری اور رواداری برتنے کا حکم تھا، وہ پیہم جبر و تشدد سے کام لیتے تھے۔ اور مسلمان صبر و ضبط اور رواداری سے کام لیتے رہے، حتیٰ کہ مسلمانوں کو ہجرت کر کے مدینہ منورہ آنا پڑا۔ اور وہاں آکر انہوں نے اپنی ایک چھوٹی سی مملکت قائم کر لی اس کے بعد مسلمانوں کو ہاتھ کھولنے اور کفار و مشرکین کو جواب دینے کی اجازت دی گئی۔

واقعہ یہ ہے کہ وحی خفی کا نظریہ صرف روایات و احادیث کو منوانے کے لئے ایجاد کیا گیا ہے اور اسی کو سہارا دینے کے لئے اعتراضات

کئے جاتے ہیں کہ فلاں حوالہ قرآن سے دکھاؤ، فلاں محکی عنہ قرآن سے دکھاؤ۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ جب ان سے کہا جائے کہ کیا آپ اس کا حوالہ اپنی وحی خفی سے دکھا سکتے ہیں تو بجائے اس کے کہ خدا کے نازل کردہ جو الفاظ ہم سے مانگے جاتے ہیں وہ دکھلائے جائیں یا ان کے متبادل الفاظ ہی دکھائیں۔ اٹکل پچو باتیں کرنی شروع کر دیتے ہیں کہ قرآن نے یوں نقل فرمایا ہے تو لامحالہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمادیا ہوگا یا پھر زمانۂ رسالت سے دو سو سال بعد کے کسی راوی کے الفاظ پیش کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔

قرآن کریم دلیل قاطع ہے

قرآن مجید میں صرف رسولوں اور انبیاء کے افعال و اقوال کے، اور الٰہی کتابوں کے احکام و تعلیمات ہی کے حوالے نہیں ہیں بلکہ مؤمن آل فرعون، زوجۂ فرعون اور سورۂ یٰسین والے شہید اور ام موسیٰ اور مریم بنت عمران جیسے نیکوکاروں کے اقوال و افعال کا بھی ذکر ہے۔ علاوہ بریں قرآن مجید میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کے اہل کتاب، مؤمنوں اور خود رسول اکرم کے اقوال و افعال کا بھی حکایۃً ذکر ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے لئے کسی علیحدہ نوشتہ کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف قرآن کریم ہی میں یہ تمام چیزیں مل جاتی ہیں کہ وہ تمام ضروریات کا مجموعہ ہے۔

جواب ۲۷ لہٰذا اگر قرآن کی عام ہدایات کے ماتحت (جن کی مثالیں ہم نے پیش کردی ہیں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی کَفَّوْا اَیْدِیَکُمْ کے الفاظ کے ساتھ حکم دیا ہو۔ اور اسے قرآن نے نقل کر دیا ہو۔ تو اس میں کیا قباحت ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم قرآنی ہدایات کی مطابق تو دیا تھا۔

تعلیمِ الٰہی جو انسانی جبلّت میں موجود ہے۔ جواب ۳

حق تعالےٰ کا ارشاد ہے
وَلَا یَاْبَ کَاتِبٌ اَنْ یَّکْتُبَ کَمَا عَلَّمَہُ اللّٰہُ (۲/۲۸۲)۔ اور چاہیئے کہ کاتب لکھنے سے انکار نہ کرے۔ جیسے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے لکھنا سکھایا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر منشی کو اللہ تعالیٰ نے ہی لکھنا سکھایا ہے۔

پھر فرمایا

تُعَلِّمُوْنَھُنَّ مِمَّا عَلَّمَکُمُ اللّٰہُ ۰ (۵/۴)۔ جس طرح اللہ نے تمہیں سکھایا ہے تم شکاری جانوروں کو شکار پکڑ رکھنا سکھاتے ہو۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جو لوگ شکاری کتوں، بازوں وغیرہ شکاری جانوروں کو سدھاتے اور سکھاتے ہیں۔ ان کو بھی (شکاری جانوروں کو سدھانا) خود اللہ تعالےٰ نے ہی سکھایا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ تعلیم اللہ تعالےٰ نے انسان کی جبلّت میں رکھدی ہوئی ہے۔ ورنہ نہ وہ ہر کاتب کو لکھنا پڑھنا ہی خود آکر سکھاتا ہے۔ اور نہ شکاریوں کو کتے سدھانے کی تعلیم ایک ایک کو الگ الگ دیتا ہے۔

پھر ارشاد فرمایا۔ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ؕ وَیُعَلِّمُکُمُ اللّٰہُ ۰ (۲/۲۸۲)۔

پھر فرمایا۔ اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا ۰ (۸/۲۹) یعنی اللہ کی مخالفت سے بچو، اللہ تمہیں بچنے کی تعلیم دیتا ہے ——— اور ——— اگر تم اللہ کی مخالفت سے بچو گے تو اللہ تمہارے لئے حق و باطل میں فرق کرنے کی قوت عطا فرمادے گا۔

پھر فرمایا:۔ مَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰہِ یَھْدِ قَلْبَہٗ ۰ (۶۴/۱۱)۔ جو کوئی ایمان لائے گا۔ اللہ اس کے قلب کو رہنمائی کرے گا۔

وغیر ذلک من الآیات ـــ ایسی تمام آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالےٰ جبلّی تعلیم کے ذریعہ بھی علم و فرقان و ہدایت دیا کرتا ہے۔ پس ایسی تمام نسبتوں سے کسی شخص کی باتوں کا قرآن مجید جیسا واجب الاعتقاد وحی ہونا ثابت

نہیں ہوتا۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ قرآنی تصدیق سے پہلے جو بات ظن ہی ظن ہوتی ہے۔ جب قرآن اس کی تصدیق کر دے تو قرآنی تصدیق سے وہ ظن غالب کے درجہ سے نکل کر یقینی ہوجاتی ہے۔ جب خدا نے ہی فرمادیا

اِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ اَنَّھَا لَکُمْ وَ
تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَۃِ تَکُوْنُ لَکُمْ (۸)

جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں جماعتوں میں سے ایک تمہارے حصہ میں آئے گی اور تم بھی تمنائیں کر رہے تھے کہ جو جماعت کمزور ہو وہ تمہارے حصہ میں آجائے۔

کہ جو کچھ تمہارے دل میں آیا تھا اور جس کی تم تمنائیں کر رہے تھے اس کا میں ہی وعدہ کر رہا تھا۔ اور اب میں بذریعہ قرآن، تمہیں علم یقینی عطا کر رہا ہوں۔ تو اب اس کے صحیح وعدۂ الٰہی ہونے میں کوئی تردد نہیں رہا۔ بعینہ اسی طرح کہا جا سکتا ہے کہ کُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ کا حکم جبلی تعلیم کے ذریعہ سے مسلمانوں کو عطا فرمایا گیا تھا۔ کیونکہ مسلمان اس زمانہ میں یعنی آنحضر صلے اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی مکی زندگی میں نہایت کمزور تھے اور وہ کفار کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ایسے حالات میں ہر جاہل سے جاہل آدمی جان سکتا ہے کہ ہمیں صبر وضبط، تحمل، بردباری اور رواداری کا معاملہ کرنا چاہیئے۔ اس جبلی حکم کی بعد میں قرآن کریم نے تصدیق و توثیق فرما کر اسے یقینی اور قطعی بنا دیا۔

عجیب و غریب لطیفہ علمائے حدیث کا دعویٰ ہے کہ قرآن مجید کیطرح حدیثی وحی بھی آہستہ آہستہ نازل ہوا کرتی تھی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اپنے اقوال وافعال ان وحیوں کے بعد ان کی مطابقت میں سرزد ہوتے تھے۔ لیکن جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ رسول اللہ کے ہر قول وفعل سے پہلے قرآن مجید سے خارج ان حدیثی

وحیوں کو پیش کرو جن کی بناء پر حضورؐ کے وہ اقوال و افعال واقع ہوتے تھے تو جواب میں سکوت اختیار فرما لیتے ہیں۔ مگر اللہ کی کتاب کو کافی سمجھنے والوں سے محکی عنہ پوچھتے ہیں۔ کیا یہ ایک لطیفہ نہیں؟ (مثلاً ہم اہلحدیث حضرات سے پوچھتے ہیں کہ وہ حدیثی وحی پیش فرمائیں جس کے مطابق آنحضورؐ نے منافقوں کو جنگ سے پیچھے رہ جانے کی اجازت دیدی تھی، اور قرآنی وحی نے حدیثی وحی کی مخالفت کرتے ہوئے (۹/۴۳) آنحضورؐ کو تنبیہ فرمائی تھی کہ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (آپ نے انہیں کیوں اجازت دی ہے) کیا اس سوال کا اہل حدیث کے پاس کوئی جواب ممکن ہے؟ ہرگز نہیں۔ ان محترم بزرگوں کے لئے کوئی چارہ نہیں کہ (۳۶/۶۹) کی قرآنی وحی کو بصدقِ دل تسلیم کریں کہ آنحضورؐ کو قرآن کے سوا کسی بھی اور وحی کی تعلیم نہیں دی گئی تھی۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِيْ لَهٗ ۚ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۙ (۳۶/۶۹)۔ ہم نے اپنے نبی کو شعر و شاعری کی تعلیم نہیں دی۔ ہم نے تو اسے صرف اور صرف ذکر، یعنی قرآن مبین کی تعلیم دی ہے۔

ہم پوچھتے ہیں کہ کیا نفی اثبات کے حصر کے بعد بھی کسی وحی خفی کی تعلیم کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟ اسی طرح سورۂ انعام میں انتہائی حصر کیساتھ فرمایا ہے کہ

قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ۭ قُلِ اللّٰهُ ۣ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۣ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ۭ (۶/۱۹)۔ ان سے پوچھو کس کی گواہی سب سے بڑھ کر ہے؟ کہو میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے کہ صرف یہ قرآن میری طرف بذریعۂ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ تمہیں بھی اس کے ذریعہ متنبہ کردوں اور قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کو بھی۔

سورۂ الرحمٰن میں بھی اسی چیز کی تائید موجود ہے

اَلرَّحۡمٰنُ ۔ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ۔ (۵۵: ۱-۲)

رحمٰن نے قرآن ہی کی تعلیم دی۔

کیا حضرات علمائے اہلِ حدیث بتا سکتے ہیں کہ کہیں خدا نے اَلرَّحۡمٰنُ۔ عَلَّمَ الرِّوَایَات یا عَلَّمَ بِالۡوَحۡیِ الۡخَفِیِّ بھی فرمایا ہے؟ ۔ پھر ایک اور لطیفہ ملاحظہ فرمائیں کہ جب بقول اہلِ حدیث قرآن بھی وحی ہے اور حدیث بھی وحی ہے تو حدیثوں کو وہ روایتیں کیوں کہتے ہیں، آیتیں کیوں نہیں کہتے؟ زیادہ سے زیادہ انہیں غیر متلو آیات کہدیا کریں۔ اپنے دعویٰ کا کچھ تو پاس کریں۔ مزہ تو اس میں ہے کہ جس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ یہ قرآن کی آیت ہے۔ اسی طرح یہ بھی کہیں کہ یہ بخاری شریف کی آیت ہے۔ حیرت ہے کہ بخاری شریف کے تیس پارے تو بنا لئے مگر حدیثوں کو آیتیں نہ بنا سکے۔ سبحان اللہ کیا رعب ہے قرآن کا۔

حدیثوں کو قرآن کی تفسیر کہنے والے مسائل کا قرآن سے ثبوت ہم سے مانگتے ہیں

کہتے ہیں کہ امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ

كُلُّ مَا حَكَمَ بِهٖ رَسُوۡلُ اللّٰهِ فَهُوَ مِمَّا فَهِمَهٗ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ ۔ (اتقان للسیوطیؒ)۔ جو فیصلے بھی حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمائے وہ سب کے سب وہ ہیں جو آپ نے قرآن ہی سے سمجھے ہیں۔

حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ نے زاد المعاد میں اسے مفصل بیان فرمایا ہے۔ لہٰذا تمام حدیثیں قرآن مجید ہی کا فہم یعنی تفسیر ہیں۔ اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ آیات کے کن الفاظ سے وہ فہم حاصل ہوتا ہے مثلاً کس آیت کے کن الفاظ سے حدیثوں نے کتا، بلا اور بندر وغیرہ حرام بتائے ہیں۔ تو ارشاد کرتے ہیں کہ پہلے تم بتاؤ کہ قرآن کی کس آیت سے کتا، بلا، بندر وغیرہ حرام ثابت ہوتے ہیں۔ یہ اس سے بھی بڑھ کر لطیفہ ہے

ایسے لطیفوں کے مورد و مصداق خود ہیں مگر ڈھٹائی سے مذاق دوسروں کا اڑاتے ہیں۔

ان حضرات کے حوالے طلب کرنے سے ہمارے مدعا پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ قرآن کریم اپنی اکملیت کے بے پناہ دعووں کے عین مطابق پورے دین اسلام کو محیط ہے۔ ہر مسئلہ اس میں موجود ہے، حلت، حرمت صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، امن، جہاد، نکاح، طلاق، موت، حیات، وراثت، قیامت وغیرہ ہر مسئلہ کی تفصیل اس میں موجود ہے۔ چنانچہ خود آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان مبارک سے کہلوا دیا گیا ہے۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِىْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِىْۤ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ (۶/۱۱۴) کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور حاکم تلاش کروں۔ جبکہ اس نے تمہاری طرف اپنا حکم نامہ ایک مفصل کتاب کی صورت میں نازل کر رکھا ہے۔

نیز فرمایا:۔

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (۲۹/۵۱)۔ اے رسول! کیا ان کے لئے یہ کتاب (قرآن مجید) کافی نہیں جو ان پر پڑھی جاتی ہے۔ بلاشبہ اس میں ماننے والوں کے لئے مکمل رحمت اور مفصل نصیحت موجود ہے۔

نیز فرمایا کہ ان کی پوری شریعت بھی اللہ تعالیٰ نے خود ہی بیان کر دی ہے

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِىْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰۤى ۔۔۔۔۔۔ (۴۲/۱۳)

اے ایمان والو! اللہ نے تمہارے لئے دین کی وہی شریعت نافذ کی ہے جو اس نے نوحؑ کو وصیت کی تھی یہ وہی شرع ہے جو اے رسول ہم نے آپ کی طرف وحی فرمائی ہے اور یہی شرع ہو جو ہم نے ابراہیمؑ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو وصیت فرمائی تھی۔

تشریع، کارِ الٰہی ہے اللہ کے علاوہ کوئی حقیقی شارع نہیں ہے

اس کے بعد مزید ملاحظہ فرمائیں کہ واضح کر دیا ہے کہ لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے شریک ٹھہرا لئے ہیں جو ان کے لئے دین کی شرع مقرر کرتے ہیں۔

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۴۲/۲۱)۔ کیا ان کیلئے کوئی اللہ کے شریک ہیں جو ان کے لئے دینی شریعت تجویز کرتے ہیں کہ جس کی اللہ نے کبھی اجازت نہیں دی (اور یہ اتنا ظلم عظیم ہے کہ) اگر گرفت کے متعلق قیامت کا فیصلہ نہ دیدیا گیا ہوتا تو ان کے درمیان بھی (آج ہی) فیصلہ کر دیا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر اللہ کو شارع ٹھہرانے والے ظالموں کے لئے دردناک عذاب ہے۔

نیز فرمایا

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ (۱۶/۸۹)۔ اے رسول! ہم نے آپ کی طرف ہر مسئلہ کو کھول کھول کر بیان کرنے والی کتاب نازل فرمائی ہے جو فرمانبرداروں کے لئے ہدایت، رحمت و بشارت ہے۔

اس آیت میں۔ تِبْيَانًا ، هُدًى ، رَحْمَةً وَبُشْرٰى چار اوصاف عطف معطوف کی ایک ہی صف میں کھڑے کر دیئے ہیں۔ اب اگر

یہ مانا جائے کہ قرآن مسائل کی تبیین نہیں کرتا تو ماننا پڑے گا کہ وہ نہ ہدایت ہے نہ رحمت اور نہ بشارت۔ العیاذ باللہ۔ افسوس ہے کہ اتنی بڑی وضاحت کے باوجود ہم سے سوالات کئے جاتے ہیں کہ قرآن میں وہ دکھاؤ، قرآن میں یہ دکھاؤ۔ اور جب دکھا دیا جاتا ہے تو مانتے نہیں۔

معاہد و ذمی کفّار کی مجلسیں اور مخالفانہ تجویزیں

کفار باوجودیکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ماتحت امن و امان سے زندگی بسر کر رہے تھے مگر اثم و عدوان و معصیتِ حاکم کی خفیہ کمیٹیاں کیا کرتے تھے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ ؗ (۵۸/۸)۔

اے پیغمبر! آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں (مخالفانہ) سرگوشیوں سے روکا گیا تھا۔ لیکن وہ پھر وہی کچھ کر رہے ہیں جس سے انہیں منع کیا گیا تھا۔ اور اثم و عدوان اور رسول کی معصیت اور نافرمانی پر متضمن (مخالفانہ) سرگوشیاں کرتے رہتے ہیں۔

انکو اس حرکت سے منع کیا گیا لیکن وہ اپنی شرارتوں سے باز نہیں آئے۔ اس کے متعلق علمائے اہلِ حدیث کی طرف سے سوالات کئے جاتے رہے ہیں کہ قرآن مجید میں ایسی کمیٹیوں سے پہلے کہاں منع کیا گیا ہے جس کا اس آیت میں حوالہ دیا گیا ہے کہ ـــــ "انہیں منع کیا گیا تھا اور پھر بھی وہ ویسی ہی حرکتیں کرتے ہیں" ـــــ ہمیں ان حضرات کے تغافل پر حیرت ہے۔ سورۂ نساء میں ایسی کمیٹیوں اور سرگوشیوں کی صاف ممانعت آچکی ہے۔ دیکھئے

لَا خَيْرَ فِىْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ؕ (۴/۱۱۴)

ان کی اکثر سرگوشیوں میں کوئی بھلائی نہیں ہے سوائے
ان لوگوں کی سرگوشیوں کے جو صدقہ کا، نیکی کا، یا لوگوں کے درمیان
صلح کرانے کا حکم دے۔

اب ہم دوسری مثال کو لیتے ہیں جس میں اعتراض کیا گیا تھا کہ سورۂ بقرہ میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ

(۲/۱۴۳)۔ اور نہیں بنایا تھا ہم نے اس قبلہ کو جس پر آپ چلے آتے
تھے مگر محض اس لئے کہ ہم جان لیں کہ کون رسول کا اتباع کرتا
ہے اور کون اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاتا ہے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت المقدس کو حق تعالیٰ نے قبلہ بنایا تھا۔ (وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا) لیکن قرآنِ کریم میں ہمیں کوئی ایسی آیت نہیں ملتی جس میں یہ حکم موجود ہو کہ بیت المقدس کو قبلہ بنایا تھا۔ چنانچہ حق تعالیٰ بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرنے کی نسبت اپنی طرف فرماتے ہیں۔ لہٰذا یہ ہمارے اس دعوے کی دلیل ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم جب کوئی حکم وحی خفی سے صادر فرمادیں۔ تو وہ خدا ہی کا حکم ہوتا ہے اور دین میں وحی جلی یعنی قرآن کی طرح حجت ہوتا ہے"۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا اور اسے اپنا قبلہ بنانے کے حکم کو حق تعالیٰ نے قرآن میں شامل نہیں فرمایا، کیونکہ قرآنِ کریم ایک غیر منسوخ دستور العمل ہے۔ اس میں کوئی ایسا حکم نہیں لایا گیا ہے جو اب منسوخ ہو چکا ہو۔ قرآنِ کریم کے تمام موجودہ احکام غیر منسوخ اور معمول بہا ہیں۔ اگر بیت المقدس کو قبلہ بنانے کے حکم والی آیت بھی قرآن میں نقل کر دی جاتی حالانکہ وہ حکم اب منسوخ ہو چکا ہے تو قرآنِ کریم کی یہ شان یعنی غیر منسوخ دستور العمل ہونے کی شان

جاتی رہتی۔

قبلہ کے سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ قرآن کریم نے یہ بات صاف کر دی ہے کہ جب تک کسی مسئلہ کے متعلق قرآن کریم میں کوئی حکم نازل نہ ہو جائے اس وقت تک آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم تھا کہ آپ پچھلی شریعتوں کی پیروی فرمائیں۔ چنانچہ بہت سے احکام میں آپ نے ملت ابراہیمی کے، توراۃ اور انجیل کے بعض احکام کی پیروی فرمائی ہے۔ چنانچہ سورۂ انعام میں انبیاء سابقین ابراہیمؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، نوحؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، ہارونؑ، زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ، الیاسؑ، اسماعیلؑ، الیسعؑ، یونسؑ اور لوطؑ وغیرہ علیہم الصلوۃ والسلام کا نام بنام تذکرہ فرما کر آخر میں فرمایا گیا

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ (۹۰/۶)

یہ وہ حضرات ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت عطا فرمائی تھی تو اے پیغمبر آپ بھی ان کی ہدایت کی پیروی فرمایئے۔

اس حکم کے مطابق بہت سے ان مسائل میں جنکے بارہ میں ابھی قرآن کریم میں کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ آپ پچھلی شریعتوں کے احکام پر عمل کرتے تھے۔ اس کی ایک مثال زنا کی سزا سے متعلق حکم کی پیش کی جاسکتی ہے کہ جب تک سورۂ نور میں زانی اور زانیہ کی سزا کہ ان کو سو کوڑے مارے جائیں نازل نہیں ہوئی تھی۔ آپ توراۃ کے حکم پر عمل فرماتے رہے کہ شادی شدہ زناکار کو سنگسار کر دیا جائے اور غیر شادی شدہ زناکار کو سو کوڑے مارے جائیں۔ لیکن جب سورۂ نور کا حکم نازل ہو گیا تو آپ نے توراۃ کے اس حکم پر عمل کرنا چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ سورۂ نور کا حکم نازل ہونے کے بعد آپ سے کسی کو سنگسار کرنا ثابت نہیں ہے۔ اسی طرح سورۂ بقرہ کی وہ آیات جن سے مسجد حرام کو قبلہ بنانے کا حکم صادر فرمایا گیا ہے جب تک نازل نہیں ہوئیں (یہ آیات مدینہ منورہ جانے کے کچھ عرصہ بعد نازل

ہوئی تھیں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے کیونکہ بیت المقدس کو بنی اسرائیل میں قبلہ کی حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ کتاب دانیال نبی باب ۶ درس ۱۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت دانیال کا قبلہ بیت المقدس تھا

حضرات! بیت المقدس کا قبلہ پہلے سے چلا آتا تھا جس کا ثبوت ہم نے کتاب دانیال نبی باب ۶ درس ۱۰ سے پیش کیا تھا مگر "خوئے بدرا بہانۂ بسیار" اس پر بعض لوگوں نے حضرت دانیال کے نبی ہونے سے ہی انکار کر دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ دانیال کا نبی ہونا ان کے نزدیک ثابت نہیں۔ خدانخواستہ اگر حضرت دانیال رسول نہ تھے تو کیا عام اہل کتاب میں سے بھی نہ تھے؟ ہماری غرض اس بیان سے صرف یہ تھی کہ بیت المقدس کے قبلہ کا رسول خدا سے پہلے چلا آنا ثابت کیا جائے۔ ہم نے یہ نہیں کہا تھا کہ بیت المقدس کا قبلہ ابتدائً حضرت دانیال کے لئے مقرر ہوا تھا۔ بلکہ یہ بتایا تھا کہ کتاب دانیال سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت دانیال اس قبلہ کی طرف منہ کر کے عبادت کرتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ ابتداً کسی اور رسول پر بھی حضرت دانیال سے پہلے یہ قبلہ مقرر ہوا ہو۔

اب ہم کتاب زبور سے مزید ثابت کرتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام بھی جنہوں نے بیت المقدس کی بنیاد رکھی تھی اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ چنانچہ پانچویں زبور میں فرماتے ہیں ۔۔ "خداوند! خونی اور دغاباز آدمی سے نفرت کرتا ہے۔ لیکن میں جو ہوں سو تیری رحمت کی کثرت سے تیرے گھر آؤں گا۔ اور تجھ ہی سے ڈر کر تیری مقدس ہیکل کی طرف تجھے سجدہ کروں گا۔ اے خداوند اپنی صداقت میں میرا رہبر ہو۔ میرے دشمنوں کے سبب سے میرے سامنے اپنی راہ کو سیدھا کر کہ ان کے منہ میں کچھ کھرائی نہیں۔ الخ

تیسرے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ:

رکوع، سجدہ کی دعائیں احادیث میں مختلف آئی ہیں اگر رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے عام حکم تسبیح کو نماز پر بھی لگا لیا تو کیا بُرا کیا۔ یہ ایک عقلی اجتہاد تھا اور عقلی اجتہادات قرآن کی آیات کریمہ سے آپ نے بیشمار فرمائے ہیں نیز عقلی اجتہاد سے اور بھی مناسب دعائیں نماز کے رکوع و سجود میں کی جا سکتی ہیں۔ اہلِ کتاب نے سجدہ میں ایک دعاء کی تھی قرآنِ کریم نے اس کی تعریف فرمائی ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۝ وَيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ۝ (۱۷ / ۱۰۸ - ۱۰۹)۔ بلاشبہ جن لوگوں کو اس سے پہلے علم دیا گیا تھا جب ان پر قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ اپنی ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں "پاک ہے ہمارے رب کی ذات، یقیناً ہمارے پروردگار کا وعدہ ہو کر رہتا ہے"۔

ہمارے نزدیک ان دعاؤں کی ایسی بندش نہیں ہے جیسی آپ کے نزدیک ہے۔ خود روایات سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ ایک دیندار بدو (اعرابی) کو رسولِ اکرم نے نماز میں نہایت فصیح و بلیغ اور پرسوز دُعاء پڑھتے دیکھا تو آپ نے نماز کے بعد اس سے پوچھا کہ یہ دُعا تم نے کہاں سے سیکھی؟ اس نے کہا کسی سے نہیں، دلی جوش سے خود بخود میری زبان پر آ گئی آپ نے اس کی تحسین فرمائی۔

چوتھا سوال یہ تھا کہ قرآنِ کریم نے خنزیر کی حرمت تو بیان فرما دی ہے مگر کتے بلی اور دوسرے محرمات کا بیان قرآن کریم نے نہیں کیا، کتے بلی وغیرہ کی حرمت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے وحی خفی سے فرمائی ہے اور پوری اُمت نے آنحضرت کے احکام کو احکام الٰہی کی طرح ہی قبول کیا ہے۔ لہٰذا اگر ارشادات نبوی قرآنِ کریم یعنی فرمانِ الٰہی کی طرح حجت نہیں ہوں گے تو ان

چیزوں کو حلال ماننا پڑیگا۔
اس کے جواب میں عرض ہے کہ حق تعالیٰ نے جب چند چیزوں کی حرمت کی تصریح فرمائی تو حرمت کی دو وجہیں بتائی ہیں۔ ایک تو رِجسٌ ہونا دوسرے فِسقٌ ہونا۔ سورۂ انعام میں ہے

قُل لَّا اَجِدُ فِیمَآ اُوحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطعَمُهٗٓ اِلَّآ اَن یَّکُونَ مَیتَةً اَو دَمًا مَّسفُوحًا اَو لَحمَ خِنزِیرٍ فَاِنَّهٗ رِجسٌ اَو فِسقًا اُهِلَّ لِغَیرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضطُرَّ غَیرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّکَ غَفُورٌ رَّحِیمٌ ۝ (پ ۶ ع ۱۲۵)۔ اے پیغمبر! آپ کہدیجئے کہ میں ان میں جو مجھ پر وحی کیا گیا ہے۔ کھانے والے پر کوئی چیز حرام نہیں پاتا جسے وہ کھائے سوائے مُردار، بہتے خون یا سور کے گوشت کے کیونکہ وہ ناپاک چیزیں ہیں (رجس) یا ناپاک جانور جس پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو (فسق) تو جو مجبور ہوکر کھالے جس کا باعث نہ سرکشی ہو نہ تجاوز تو بلاشبہ آپ کا پروردگار بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔

سورۂ مائدہ میں ہے

یٰٓاَیُّهَا الَّذِینَ اٰمَنُوٓا اِنَّمَا الخَمرُ وَالمَیسِرُ وَالاَنصَابُ وَالاَزلَامُ رِجسٌ مِّن عَمَلِ الشَّیطٰنِ فَاجتَنِبُوهُ لَعَلَّکُم تُفلِحُونَ ۝ (پ ۵ ع ۹) اے پیروانِ دعوتِ ایمانی، شراب، جوا، بت اور پانسے کے تیر، سب ناپاک چیزیں اور شیطانی عمل ہیں۔ ان سے بچو، توقع ہے کہ تم فلاح پا جاؤ گے۔

نیز سورۂ مائدہ ہی میں محرمات کی تفصیل دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَا اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ (۵/۳)۔ اے مسلمانو! تم پر مُردار، خون، سُور کا گوشت اور جس پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو اور جسے گلا گھونٹ کر مارا گیا ہو، جو چوٹ لگنے سے مر گیا ہو، اوپر سے گر کر مر گیا ہو، جانور نے سینگ مار دیا ہو اور اس سے مر گیا ہو۔ جسے درندے نے پھاڑ کھایا ہو، سوائے اس کے جسے تم ذبح کر لو، جو بتوں کے استھان پر ذبح کیا گیا ہو، اور یہ کہ تم پانسے کے تیروں سے تقسیم کرو۔ یہ سب چیزیں حرام کر دی گئی ہیں یہ تمام چیزیں فسق ہیں۔

نیز سورۂ انعام میں ہے

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ (۶/۱۲۱) اور جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ اسے نہ کھاؤ اور یقیناً اس کا کھانا فسق ہے۔

ملاحظہ فرمایئے حق تعالٰی نے حرمت کی دو وجہیں بتائی ہیں ایک رِجس ہونا، دوسرے فسق ہونا، سورۂ مائدہ میں حلال جانوروں کا ذکر فرما کر ارشاد ہوا ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا اُحِلَّ لَهُمْ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ (۵/۴)۔ اے پیغمبر! لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لئے کیا کچھ حلال کیا گیا ہے۔ آپ فرما دیجئے کہ تمہارے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں۔

آگے پھر دوبارہ فرمایا گیا ہے۔

اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ۔ (۵)۔ آج تمہارے
لئے پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔

غرض کہ پاکیزہ چیزوں کی حلّت دو مرتبہ بیان فرمائی گئی ہے۔ پہلی مرتبہ اس کے ساتھ شکاری جانوروں کے شکار کی حلّت بیان فرمائی ہے اور دوسری دفعہ اسکے ساتھ اہل کتاب کے کھانوں کی حلّت ظاہر فرمادی۔ یہ طرز بیان اپنے اندر ضرور کوئی حکمت رکھتا ہے۔ قرآن مجید میں آیات کے نظم و ربط سے بہت سے مسائل مستنبط ہوتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ حرمت کا انحصار رجس اور فسق پر ہے۔ اس لئے یہاں ساتھ ہی اس کا فیصلہ کر دینا بھی مناسب تھا کہ اگر کوئی حلال جانور جو خود تو رجس اور فسق نہیں ہے، کسی رجس یا فسق والے کے ہاتھ سے ذبح ہوا ہو۔ تو کیا اس جانور میں (ذبح کرنے والے کا فسق و رجس) متعدی طور پر سرایت کرے گا یا نہیں۔ اور اس جانور کو طیّبات ہونے سے نکال دے گا یا نہیں، اس شبہ کو دور کرنے کے لئے ہی پہلے فرمایا کہ طیبات ضرور حلال ہیں۔ ہاں اگر درندے انہیں کھالیں تو مَآ اَکَلَ السَّبُعُ کے مطابق وہ پہلے ہی حرام قرار پاچکے ہیں لیکن اگر شکاری جانور سدھائے ہوئے (تعلیم دیئے ہوئے) ہوں اور شکار کے وقت اپنا رجس ان میں نہ پہنچاتے ہوں تو طیّبات میں شکاری جانوروں کے خود رجس ہونے سے ان کا رجس، شکاروں میں سرایت نہیں کر جاتا۔ اسی طرح فرض کر دیا گیا ہے کہ طیبات ضرور حلال ہیں۔ ہاں اگر فاسق لوگ انہیں غیر خدا کے نام پر ذبح کریں تو ان کا فسق تو پہلے ہی ذکر کیا جاچکا ہے۔ لیکن اگر فاسق اہلِ کتاب غیر خدا کا نام نہ لیں تو محض ان کے ذبح کرنے سے ان طیبات میں ان کا فسق سرایت نہیں کر جاتا۔ قرآنِ پاک کا یہ حسن بیان صرف اس صورت میں ثابت ہو سکتا ہے کہ اگر اہل کتاب فاسق ہوں اور شکاری جانور رجس سمجھے جائیں۔ چونکہ اہل کتاب کا فسق ثابت ہے اس سے شکاری جانوروں کا خود رجس

ہونا بھی لازم آتا ہے اور رجس کو حق تعالیٰ نے حرام کیا ہے۔ پس ایک کُتّا ہی حرام نہیں بلکہ تمام ذی ناب (درندے) اور ذی مخلب (شکاری پرندے) بھی حرام ہیں۔ ہمارے نزدیک رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآنِ کریم سے اِجتہاد فرما کر ہی جوارح (شکاری جانوروں) کی حرمت معلوم کی ہے۔ اور حضورؐ کے اجتہاد کو ہم نے قرآن سے ثابت کر دیا ہے۔

علاوہ ازیں سورۂ مائدہ میں حق تعالےٰ نے صاف طور پر فرما دیا ہے کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ ۚ أُحِلَّتْ لَكُم بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ إِلَّا مَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ (۵/۱)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! عہدوں کو پورا کرو۔ تمہارے لئے تمام چار پائے چرنے والے مویشی حلال کر دیئے گئے ہیں بجز ان کے جن کے متعلق تمہیں سُنایا جائیگا۔

اس آیتِ کریمہ میں "بھیمۃ الانعام" کو حلال کئے جانے کا بیان کیا گیا ہے۔ بَهِيمَةُ تمام بے عقل اور بے زبان جانوروں کو کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ بول نہیں سکتے یا ان کی آواز میں ابہام ہوتا ہے اور اس وجہ سے بات سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس میں تمام جانور شامل ہیں خشکی کے ہوں یا دریائی لیکن صاحبِ محیط اور امام راغب دونوں نے لکھا ہے کہ درندے اور پرندے ان میں شامل نہیں ہوتے اور اَنْعَامٌ کے معنے عام طور پر مویشی کے کئے جاتے ہیں۔ عرب کے لوگ عام طور پر یہ لفظ اونٹ، بکری اور گائے کے لئے بولتے تھے۔ بعض نے ان میں بھیڑ اور دُنبہ کو بھی شامل کیا ہے۔ لیکن بعض نے اسے صرف اونٹوں کے لئے مخصوص قرار دیا ہے (تاج العروس) قرآنِ کریم نے اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکری چاروں کو اس میں شامل کیا ہے۔ (۶/۱۴۴-۱۴۵، ۳۹/۶) قرآنِ کریم میں نے

اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ (۵/۱، ۲۲/۳۰، ۲۸)
یعنی تمہارے لئے بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ حلال کئے گئے ہیں۔ بجز ان کے جن کے متعلق
قرآن کریم میں الگ حکم دیا گیا ہے۔ یہ حکم الگ اسی سورت میں دو آیات
آگے چل کر ہے جس میں مُردار، خون، خنزیر کا گوشت اور ہر وہ چیز جس
پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے، حرام قرار دیا گیا ہے (۵/۳) بَهِيْمَةُ
الْاَنْعَامِ، اضافۃ الصفۃ الی الموصوف کی مثال ہے۔ اصل میں یہ لفظ
الانعام البھیمۃ تھا یعنی گونگے چوپائے بہیمۃ الانعام میں وہ تمام جانور
شامل ہیں جو چرتے اور چگتے ہوں۔ سورۂ فاطر میں اَنْعَامٌ کو انسان اور
دواب سے الگ بتایا گیا ہے (۳۵/۲۸) اگرچہ دَوَابٌّ میں مجموعی طور پر تمام
جاندار آجاتے ہیں لیکن یہاں دَوَابٌّ کے معنے پیٹ کے بل رینگنے اور
چلنے والے جانور کے ہیں اور اَنْعَامٌ سے مراد چار پائے ہیں۔ سورۂ طٰہٰ
میں ہے کہ نباتات سے تم خود بھی کھاؤ اور اپنے اَنْعَام کو بھی کھلاؤ كُلُوْا
وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ (۲۰/۵۴، ۱۰/۲۴، ۳۲/۲۷، ۷۹/۳۳، ۸۰/۳۲) اس سے ظاہر ہے کہ اَنْعَام
چرنے اور چگنے والے جانور ہیں جنہیں تم چرا کر لاتے ہو (۱۶/۶) سورۂ نحل
میں ہے کہ تم اَنْعَام کا دودھ پیتے ہو (۱۶/۶۶) سورۂ المؤمنون میں ہے کہ تم ان کا
دودھ بھی پیتے ہو۔ اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد حاصل کرتے
ہو (۲۳/۲۱) ان کی اون کے کپڑے بناتے ہو (۱۶/۵) ان کی کھالوں سے خیمے
بناتے ہو (۱۶/۸) ان سے بار برداری کا کام لیتے ہو (۱۶/۷) ان میں بوجھ لادنے
کے کام میں آنے والے بھی ہیں اور سواری کے کام میں آنے والے بھی (۶/۱۴۲)
ان کی پیٹھ پر سوار ہوتے ہو (۴۳/۱۳) سورۂ یٰسٓ میں ان کے چند فوائد یکجا
بیان کر دیئے ہیں وہ سواری کے کام میں آتے ہیں، غذا کے کام میں آتے ہیں
ان کا دودھ پیتے ہیں۔ اور بھی فوائد حاصل کرتے ہیں (۳۶/۷۲-۷۳) اسی طرح
سورۂ مؤمن میں بھی یہی فوائد بتائے گئے ہیں (۴۰/۷۹-۸۰) سورۂ نحل میں ان کو شو

کو الگ بیان کیا گیا ہے جنہیں عرب کے لوگ صبح و شام چرلتے تھے (۱۶/۶) اور بوجھ اُٹھانے والے مویشیوں کا ذکر الگ ہے (۱۶/۷) گھوڑے، خچر اور گدھے کے متعلق ہے لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً (۱۶/۸) اسی طرح سورۂ آلِ عمران میں اَلْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ (۳/۱۴) الگ الگ آیا ہے۔ یعنی پلے ہوئے نشان زدہ گھوڑے اور مویشی۔ سورۂ مؤمن میں بتایا ہے کہ اَنْعَام سواری اور غذا کے کام آتے ہیں، ان ساری تصریحات سے ظاہر ہے کہ قرآن کی رو سے الانعام سے مراد چرنے اور چگنے والے مویشی ہیں، ان کا دودھ پیا جاتا ہے، سواری اور باربرداری کا کام بھی لیا جاتا ہے، ان کی اون سے کپڑے بنائے جاتے ہیں، کھالوں سے خیمے بنائے جاتے ہیں۔ یہ وجہِ زینت بھی ہوتے ہیں، اور ان سے خوراک کا کام بھی لیا جاتا ہے ــــ الانعام میں سے بجز ان کے جنہیں قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے سب کھانے کے لئے حلال ہیں۔ خنزیر چرنے چگنے والا حیوان ہے اس لئے بھیمۃ الانعام میں شامل ہے مگر اسے قرآن نے خاص طور پر حرام کر دیا ہے۔ اب ناظرین خود ہی انصاف فرمائیں کہ بلی، کتا، بچھو وغیرہ الانعام میں آتے ہیں یا نہیں۔ لہٰذا ان کی حرمت خود قرآن کریم سے ثابت ہے یا ان کی حرمت کے لئے ہمیں کسی وحی خفی کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے؟

باب ششم

وحیِ الٰہی اور اسکے نزول کے طریقے

ہم نے گذشتہ الواب میں بتایا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہونے کے وقت بھی پورے بشر ہی تھے۔ آپ اس وقت بھی ایک فانی (فوت ہونے والے) انسانی جذبات اور عقل و اختیار رکھنے والے اور انسانوں کے مثل ہی قرآنِ کریم کے محکوم دوسرے انسانوں ہی کی طرح اپنے اعمال کے جواب دِہ بھی تھے۔

وحی الٰہی حاکم تھی اور رسولِ خدا اپنے محدود بشری عقل و اختیار کیمطابق اس کے تابع تھے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح دوسرے نیک بشر ہو سکتے ہیں۔ اور جس طرح دوسرے نیک بشروں کا وحی کی متابعت کرنا ان کے فہم اور انکے افعال و اقوال کو وحی نہیں بنا دیتا۔ اسی طرح حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا اپنی بشری محدود عقل و اختیار کے مطابق وحی کی متابعت کرنا، اُن کے فہم اور ان کے اقوال و افعال کو بھی یقیناً وحی نہیں بنا سکتا۔ اور جس طرح دوسرے نیک لوگوں کی نیک باتوں کی تصدیق اگر وحی الٰہی خود کردے تو وہ نیک بات بعد از تصدیقِ وحی خود وحی میں ہی شامل ہو جاتی ہے۔ ورنہ اگر وحی کی تصدیق نہ ہو تو عقل و فہم کی حیثیت سے ہی اس کی اطاعت ہو سکتی ہے، اسی طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بشری محدود فہم و اختیار سے صادر شدہ اقوال و افعال کی اطاعت کا بھی حال ہے۔ عقلی اطاعت کو بھی ہم نے دین کا جزو ہی ثابت کیا ہے، مگر اسی حیثیت سے

جو عقل کا حق ہے نہ کہ وحی کی طرح ـــ اسی لئے ہم نے پہلے وحی اور عقل
میں تمیز کرکے بھی دکھادیا ہے۔ اور پھر یہ بھی ثابت کردیا ہے کہ وحی کی ضرورتوں
کے مطابق جس قدر علوم واحکام ضروری تھے وہ خود حق تعالےٰ نے اپنی رحمت
خاص سے ہمارے لئے صرف ایک قرآنی دستور العمل میں ہی جمع کردیئے
ہیں اور یوں ہمیں تمام وحیوں کی تلاش کی تکلیف مالا یطاق سے سبکدوش
(بے نیاز) کردیا ہے۔ اور قرآن کے سوا دیگر وحییں (یعنی سابقہ کتب سماوی)
اور اجتہادات بطور عقلی تحقیقات کے چھوڑ دی گئی ہیں۔ لیکن وحی والے
دستور العمل یعنی قرآن مجید وفرقان حمید کی طرح ان کا کوئی
استقلال باقی نہیں رکھا۔

ان تمام نکات پر ہم گذشتہ صفحات میں تفصیل سے بحث کرچکے
ہیں۔ وحی الٰہی کے متعلق چند ضروری باتیں جو گذشتہ پوری بحث میں نہیں
آسکیں۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان پر بھی مختصر روشنی ڈال دی جائے۔

وحی الٰہی کے تین طریقے

قرآن کریم نے وحی الٰہی کے تین طریقے بتائے ہیں۔

پہلی آیت ہے:۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ
وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا
يَشَآءُ ط (۴۲/۵۱)۔ اور کسی بشر کے لئے ممکن نہیں کہ اللہ اس سے (براہ راست)
بات کرے مگر (تین طریقوں سے) وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کے پیچھے
سے یا خدا کوئی پیامبر بھیجدیتا ہے کہ اللہ کے حکم سے جو وہ چاہتا ہے
پیغمبر کی طرف وحی کردیتا ہے۔

وحی خالصتہً ایک وہبی عطیہ ہے جو حق تعالیٰ کی طرف سے اس کے منتخب
بندوں ہی کو ملتا ہے۔ یہ اکتسابی شئے نہیں ہے اسے کوئی اپنے کسب وہنر

سے حاصل نہیں کر سکتا، اسی لئے کہتے ہیں کہ وحی مُنَزَّل مِنَ اللہ ہوتی ہے یعنی خدا کی طرف سے نازل شدہ۔ مطلب یہ کہ نبی اپنی سعی و کاوش سے مقام وحی تک نہیں پہنچتا بلکہ وحی خود اتر کر نبی تک پہنچتی ہے بالفاظ دیگر اس میں نبی کی داخلیت (Subjectivity) کو دخل نہیں ہوتا اس میں یکسر خارجیت (Objectivity) ہوتی ہے۔ مُنَزَّل مِن اللہ کہنے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ انسان اپنی سعی و کاوش سے طبعی دُنیا کے پوشیدہ حقائق کو منکشف (Discover) کر سکتا ہے۔ مگر حقائق وحی، صاحب وحی پر (Revealed) ہوتے ہیں۔ یعنی وحی کے ذریعہ حقیقت خود اپنے کو صاحب وحی پر منکشف کرتی ہے یہ اپنا ہاتھ بڑھا کر عروسِ حقیقت کا نقاب نہیں اُلٹتا اسی کو نزولِ وحی کہتے ہیں

فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ (۲/۹۷)۔ اسے جبرئیل امین نے تیرے قلب پر نازل کیا ہے۔

چونکہ وحی صرف انبیاء کرام ہی کو ملتی ہے اس لئے ہم بالکل نہیں سمجھ سکتے کہ اس کی ماہیت کیا ہوتی اور وہ کس طرح انبیاء کو ملتی ہے ہمیں صرف اس بات پر ایمان رکھنا چاہیئے کہ وہ ہر نبی کو منجانب اللہ ملتی ہے، البتہ ہم علم و بصیرت دلائل و براہین نیز وحی کے نتائج سے (Preymaticully) اس کی صداقت کو علی وجہ البصیرت دیکھ سکتے ہیں۔

قرآن کریم کی متذکرہ بالا آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی کی تین صورتیں ہوتی ہیں۔ اولؔ یہ کہ حق تعالیٰ صاحب وحی کی اپنی روح سے وہ بات کہلوائے جو اللہ کو وحی کرنی ہے۔ اس کے کئی نمونے قرآن میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً الحمد شریف اور

وَمَا اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ (۶/۱۰۴)۔ میں تم پر نگران نہیں۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِیْ حَكَمًا (۶/۱۱۴)۔ تو کیا میں اللہ کے سوا کسی کو اپنا حکم

تلاش کروں۔ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ (۴۲/۱۰) اور جس کسی چیز میں تم اختلاف کرو تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف ہے ـــــ فَفِرُّوٓا اِلَى اللّٰهِ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۵۱/۵۰)۔ تو اللہ کی طرف دوڑو، میں تمہارے لئے اس کی طرف سے کھلا ڈرانے والا ہوں۔

دوسری قسم مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ہے یعنی حق تعالیٰ اپنے تصرف سے مناسب اُمور فصل کے ذریعے سے خود ہی اپنا کلام نبی کو سنادے اور اسے معلوم ہو کہ پس پردہ خود حق تعالیٰ مجھ سے ہم کلام ہے۔ قرآن کریم کا زیادہ تر حصہ اسی طریقے سے نازل ہوا ہے۔ قرآن مجید کو پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا خود اپنے بندہ سے کلام کر رہا ہے۔ مثلاً وہ تمام آیات جو قُلْ اُتْلُ، اُذْكُرْ، اَلَمْ تَرَ، اَرَاَيْتَ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ، يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ وغیرہ الفاظ سے شروع ہوئی ہیں جن میں براہ راست آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ خطاب فرمایا گیا ہے۔

تیسری قسم یہ کہ کوئی ایلچی (یعنی فرشتہ) وحی لے کر حاضر ہو اور وہ خدا کے اذن سے جو وہ چاہے وحی کرے۔ اس کے نمونے قرآن کریم میں پہلی قسم سے زیادہ اور دوسری قسم سے کم پائے جاتے ہیں مثلاً وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ (۱۹/۶۴) اور ہم تو تیرے رب کے حکم کے بغیر نازل نہیں ہوتے ـــــ اور وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ (۳۷/۱۶۴)۔ اور ہم میں سے ہر ایک کا ایک معلوم مقام ہے۔ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (۱۷/۲۳) اور تیرے رب کا یہ فیصلہ ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

مولوی ثناء اللہ امرتسری نے اپنی تفسیر الہام الرحمٰن بتفسیر القرآن بالقرآن (عربی مطبوعہ امرتسر) میں اس تیسری وحی کی مثال میں پہلی آیت وَمَا نَتَنَزَّلُ (۱۹/۶۴) ہی دی ہے۔ ہمارے نزدیک قرآن مجید ان تینوں طریقوں سے نازل ہوا جسکی مثالیں بھی ہم نے دیدی ہیں۔ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ (۴۲/۵۲) میں كَذٰلِكَ کا اشارہ تینوں مذکورہ طریقوں کی طرف ہے۔

دوسری آیت :-

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنۢ بَعْدِهِۦ ۚ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْمَٰعِيلَ وَإِسْحَٰقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَٰرُونَ وَسُلَيْمَٰنَ ۚ وَءَاتَيْنَا دَاوُۥدَ زَبُورًا ... وَكَلَّمَ ٱللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا ﴿۴ / ۱۶۳-۱۶۴﴾ تحقیق ہم نے تیری طرف وحی کی جس طرح وحی کی نوحؑ اور اس کے بعد کے نبیوں کی طرف اور وحی کی ابراہیمؑ واسمٰعیلؑ اسحاقؑ ویعقوبؑ، اولاد یعقوبؑ اور عیسیٰؑ، ایوبؑ ویونسؑ اور ہارونؑ وسلیمانؑ کی طرف ــــ اور (جس طرح) دی ہم نے داؤدؑ کو زبور...

اور جس طرح کلام کیا اللہ نے موسیٰ کے ساتھ خصوصی طور پر۔

اس آیت میں بھی وحی کے تین طریقے ہی بیان کئے ہیں۔ ۱۔ اَوْحَيْنَا جس کے متعلق پہلی آیت میں فرمایا ہے کہ فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ کہ کسی فرشتے کو بھیجکر وحی پہنچاتا ہے ۲۔ دوسرا لفظ آتَيْنَا ہے جسکو پہلی آیت میں وَحْيًا فرمایا ہے (حضرت داؤد علیہ السلام کو زبور اسی طرح ملی تھی۔ اسی طرح رسول خدا کو سورۂ فاتحہ عطا ہوئی تھی) ۳۔ تیسرے كَلَّمَ اللّٰهُ مُوسَىٰ والا طریق جسے پہلی آیت میں مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ بتایا گیا ہے۔ پہلے رسولوں میں اس طریقے سے وحی کا شرف زیادہ تر حضرت موسیٰؑ کو ملا تھا، ارشاد الٰہی ہے

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۘ مِّنْهُم مَّن كَلَّمَ اللَّهُ ﴿۲ / ۲۵۳﴾ یہ جو رسول ہیں ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے ان میں سے بعض وہ ہیں جن سے اللہ نے (براہ راست) کلام کیا۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ والی وحی زیادہ فضیلت والی ہے۔ اس کی فضیلت بدیہی ہے ــــ اور جیسا کہ

ہم نے عرض کیا قرآن مجید کا اکثر حصہ اسی قسم کی وحی کی صورت میں نازل ہوا ہے۔ جو لوگ قرآن پاک کو پہلی آیت والی صرف تیسری وحی ہی قرار دیتے ہیں وہ قرآن مجید کا درجہ گھٹا رہے ہیں۔

ہمارے نزدیک ان تینوں قسم کی وحیوں کو اللہ تعالیٰ ہی بھیجتا ہے۔ اور ان تینوں میں واسطۂ تحریک وایصال جبریل' یا روح القدس یا روح الامین ہی ہوتا ہے ___ لیکن بالفرض جبریل صرف ایک ہی قسم کی وحی لانے والا ہو (جیسا کہ بعض علماء کہتے ہیں) تب بھی ہمارا استدلال اپنی جگہ قائم ہے۔ کیونکہ بذریعۂ جبریل قرآن مجید کو رسول کے دل پر اتارنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام[ع] قرآن مجید صرف اسی ایک ذریعے سے نازل ہوا ہے۔ باقی دو طریقوں سے اس کا کچھ حصہ بھی نازل نہیں ہوا۔ جس طرح قرآن مجید کو رمضان یا لیلۃ القدر میں اتارنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رمضان اور لیلۃ القدر کے علاوہ اور دنوں میں قرآن نازل ہی نہیں ہوا۔ خلاصہ یہ کہ قرآن مجید ان تینوں طریقوں ہی سے اتارا گیا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ان تین طریقوں کے سوا خدا تعالیٰ بشر سے کوئی کلام نہیں کرتا۔

دوسری اور تیسری قسم کی وحی کے سلسلہ میں احادیث سے بھی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ بخاری کے پہلے ہی باب میں ایک حدیث ہے کہ ایک صحابیؓ نے آپ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ پر وحی کیونکر آتی ہے؟ تو آپ نے فرمایا ___ کبھی تو گھنٹی کی آواز کی طرح وحی آتی ہے اور یہ مجھ پر زیادہ سخت ہوتی ہے اور پھر یہ حالت دور ہو جاتی ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے میں اسکو محفوظ کر لیتا ہوں۔ اور کبھی وہ فرشتہ میرے لئے انسان کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور مجھ سے باتیں کرتا ہے اور جو وہ کہتا ہے میں اسے محفوظ کر لیتا ہوں

ع علامہ شبیر احمد عثمانی سورۂ شوریٰ کی آیت ۵۱/۴۲ کے حاشیہ ۲/۱ (ب) میں فرشتے کے "نزول علی القلب والی وحی کے متعلق لکھتے ہیں کہ" شاید وحی قرآنی بکثرت اسی صورت میں آتی ہو" (یعنی تمام تر نہیں بلکہ بکثرت ___ از ناشر)

"گھنٹہ کی آواز کی طرح آواز آنا" کی تشریح لوگوں نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق کی ہے۔ لیکن ہم اس کا صاف اور صریح مطلب وہ سمجھتے ہیں جو عوام ہاتف غیب یا منادی غیب کے لفظ سے سمجھتے ہیں یعنی یہ کہ آواز سنائی دے لیکن کوئی صورت نظر نہ آئے۔ (اَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ) بانگ جرس کے ساتھ اس کی تشبیہ محض اس بات میں ہے کہ جس طرح دور سے جرس کی آواز سنائی دیتی ہے اور گھنٹی بجانے والا نظر نہیں آتا۔ اور اس کے متعینہ اشاروں سے آدمی بات کو کچھ سمجھ لیتا ہے حالانکہ جرس اور اس کے بجانے والی شکل آنکھوں سے اوجھل اور بہت دور ہوتی ہے زیادہ تر وحی اسی شکل میں آتی تھی اور اس وحی کی وجہ سے آپ پر جو کیفیت طاری ہوتی تھی وہ بڑی شدید ہوا کرتی تھی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ وحی نازل ہونے کی حالت میں میں نے آپ کو دیکھا کہ جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی تھی تو سخت سردی کے دنوں میں بھی جبینِ مبارک عرق آلود ہو جاتی تھی (بخاری بدء الوحی) صحابہؓ کا بیان ہے کہ اس حالت میں جسم مبارک بہت بھاری ہو جاتا تھا۔ سواری کے اونٹ بیٹھ جاتے تھے (مسند احمد عن عائشہ و مستدرک حاکم تفسیر سورۂ مزمل) حضرت زید ابن ثابتؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ پر وحی آئی اور میرا پاؤں زانوئے مبارک کے نیچے دبا ہوا تھا۔ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا کہ میرا پاؤں بوجھ سے پھٹ جائے گا۔ (بخاری و ترمذی تفسیر سورۂ نساء) یعلی ابن امیہؓ کا بیان ہے کہ سفر حج میں مجھے وحی کی حالت میں آپ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دیکھا کہ آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور آپ خراٹے لے رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں یہ حالت رفع ہو گئی (بخاری کتاب الحج و باب کیف نزل الوحی) عبادہؓ ابن صامت کہتے ہیں کہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ کو بے چینی ہوتی۔ چہرہ کا رنگ بدل جاتا۔ آپ سر جھکا لیتے۔ صحابہ جو آپ کے ساتھ بیٹھے ہوتے وہ بھی سر نیچے کر لیتے

وحی کے بعد آپ سر اٹھاتے (مسلم باب عرق النبی صلعم)

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی کے وقت کیا کیفیت طاری ہوتی تھی اسے تو ہم نہیں جان سکتے۔ لیکن اس حالت میں جو کچھ حضرات صحابہ نے دیکھا، سمجھا اور محسوس کرکے بیان کیا ہے اس سے ہم اتنا اندازہ کر سکتے ہیں کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تھی تو وہ آپکو ایسی حالت میں نہیں رہنے دیتی تھی کہ وہ اپنے ہوش وحواس اور عقل وفہم سے اسوقت کام لے سکتے ہوں وہ اس وقت صرف وحی کے کنٹرول میں ہوتے تھے۔ آنحضرت کی عقل وفہم کا کنٹرول اس وقت ختم ہو جاتا تھا۔ اسوقت اپنے ہوش وحواس اور عقل وفہم سے اس وحی میں نہ کچھ اضافہ فرما سکتے تھے اور نہ کوئی کمی۔ اس وقت آپ کو صرف وہی ملتا تھا جو خود خدا دینا چاہتا تھا۔ اس میں قطعاً انسانی جذبات کی یا انسانی تعقل وتفہیم کی آمیزش نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ صاحبِ وحی اسوقت اپنے عقل وشعور کے کنٹرول میں ہوتا ہی نہ تھا۔ بلکہ وہ سرتاپا وحی کے کنٹرول میں ہوتا تھا جو کچھ اس حالت میں آپ پر نازل ہوتا تھا وہ بہ تمام وکمال وہی ہوتا تھا جو آپ لوگوں تک پہنچا دیتے تھے۔ باقی رہا اپنی سوچ والا فہم وہ آپکو اس (وحی الٰہی کی) حالت سے نکل کر ہوتا تھا۔ اس میں ان کا غلطی کرنا بھی ممکن تھا۔ لیکن وحی کی حالت میں غلطی کا امکان نہیں تھا۔ کیونکہ اسوقت اپنا عقل وفہم، سوچ سمجھ وغیرہ سب معطل ہوتے تھے اور آپ مکمل وحی الٰہی کے کنٹرول میں ہوتے تھے۔ عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا ۝ إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا ۝ لِيَعْلَمَ أَن قَدْ أَبْلَغُوا رِسَالَاتِ رَبِّهِمْ وَأَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَأَحْصَىٰ كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ۝ (۲۷ / ۲۶ تا ۲۸)

وہ عالم الغیب ہے اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا، سوائے اس شخص کے جسے اس نے بطور رسول (وحی کے ذریعے غیبی حقائق سے

آگاہ کرنا) پسند کرلیا ہو۔ تو اس کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا ہے تاکہ وحی میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہونے پائے اور اس لئے بھی کہ وہ جان لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے اور (وحی کی حالت میں) وہ ان کے پورے ماحول کا احاطہ کئے ہوئے ہوتا ہے اور اس نے (وحی کے) ایک ایک حرف کو گنا ہوا ہوتا ہے۔

معصوم عن الخطا اور لاریب صرف ذاتِ باری اور اس کی مقدس کتاب قرآنِ کریم ہے جو آنحضورؐ کو بذریعہ وحی عطا ہوتی تھی اور دین میں وحیٔ خداوندی ہی حجت ہے۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِیَآءَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ۔ (پ ۸) اے مسلمانو! اس کی پیروی کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اور اس کے علاوہ دوسرے مددگاروں کا اتباع نہ کرو۔ تم بہت کم نصیحت مانتے ہو۔

محکمات ومتشابہات

قرآنِ کریم میں حسبِ بیان حق تعالیٰ دو قسم کی آیات ہیں، اوّل تو محکمات اور دوسری متشابہات یہ دونوں قسم کی آیتیں بذریعہ وحی پیغمبرِ اسلام پر یکساں طور سے نازل ہوئی ہیں۔ لیکن محکمات اپنے بیان میں واضح اور صاف ہیں۔ ان کا مطلب ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ البتہ متشابہات آیات ایسی ہیں جن کا مطلب قانونی الفاظ میں نہیں تشبیہی الفاظ میں ہے ان کا مطلب عموماً ہر زمانہ میں یکساں طور پر نہیں سمجھا جاتا۔ حتیٰ کہ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم بھی اس باب میں ہمارے ساتھ شریک ہیں۔ البتہ جوں جوں علم وعقل آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ حق تعالےٰ اپنی ان آیات متشابہات کو آہستہ آہستہ خود ہی محکمات بنا تا جا رہا ہے اور ان کا مطلب واضح ہوتا جا رہا ہے چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ

هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ (۳/۷)۔ اللہ ہی تو ہے جس نے آپ پر (اے پیغمبر) یہ کتاب نازل فرمائی ہے اس میں کچھ آیات محکمات ہیں اور وہی اصل مقصودِ کتاب ہیں۔ اور دوسری آیات متشابہات ہیں۔ تو جن کے دلوں میں کجی ہے وہ ان آیتوں کے پیچھے لگتے ہیں جو اس میں سے متشابہ ہیں فتنہ انگیزی کی غرض سے اور ان کا مطلب سمجھنے کے لئے لیکن اس کا مطلب اللہ کے سوا کوئی نہیں سمجھتا ــــ جو لوگ علم میں پختہ ہیں وہ یہی کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں۔ ساری آیتیں ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں اور عقلمندوں کے سوا کوئی نصیحت قبول نہیں کرتا۔

ان آیات کے مطابق متشابہات کا مطلب اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا البتہ اللہ تعالیٰ خود ہی اپنی متشابہ آیات کو جوں جوں انسانی علم و عقل ارتقائی منازل طے کرتا جاتا ہے۔ اور اس کی سطح بلند سے بلند تر ہوتی جاتی ہے خود ہی محکمات میں تبدیل کرتا جاتا ہے۔

وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْۤ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ (۲۲/۵۲)۔ اور ہم نے آپ سے پہلے کسی رسول اور نبی کو نہیں بھیجا مگر جب بھی (متشابہات کو سمجھنے کی کسی نے تمنا کی تو شیطان ان کی اس تمنا میں کچھ نہ کچھ القاء اور دخل اندازی کر دیتا اور کوئی غلط مطلب سمجھا

دیتا تو اللہ شیطان کی وسوسہ اندازی کو مٹا دیتا اور خود ہی اپنی آیات کو محکم بنا دیتا اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

یہ بات گذشتہ صفحات میں واضح کی جا چکی ہے کہ رسول اور نبی بشر ہوتے ہیں اور بشری جذبات اور انسانی تقاضوں سے مبرا نہیں ہوتے ان میں وہ بشری کمزوریاں ہوتی ہیں جو ہر انسان کا لازمی حصہ ہیں۔ اور انبیاء کا کمال اسی میں ہے کہ باوجود ان تمام بشری کمزوریوں کے اپنے آپ کو حتی الامکان کسی غلطی میں پڑ جانے سے بچائیں۔ انسانی جبلت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ ہر بات کو سمجھنا چاہتی ہے۔ آپ کسی سے کوئی بات کہیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیں کہ ابھی تم اس قابل نہیں ہو کہ اسے سمجھ سکو۔ لہٰذا تم اس پر غور و فکر نہ کرنا۔ تو کوئی انسان اپنی سعی و کاوش سے کبھی باز نہیں آئے گا۔ اور اسے ہر ممکن طریقہ سے سمجھنے کی کوشش کرے گا۔ ایک چھوٹا سا بچہ جو ابھی صرف گڈلیوں چلنا سیکھا ہے وہ گھر کی ہر چیز کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس کوشش میں روز نئی نئی چیزیں توڑتا ہے یہ انسانی جبلت کا تقاضا ہے نبی اور رسول انسانی جبلت کے تقاضوں سے تو مبرا نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ وہ متشابہات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چونکہ ابھی ان کے دور کی عقلی اور علمی سطح اس حد تک ترقی یافتہ نہیں ہوتی کہ وہ اس کی تہ کو پہنچ سکے اس لئے بات سمجھ میں نہیں آتی لیکن شیطان ان میں عقلی تکے بھڑانے پر اکساتا رہتا ہے۔ حق تعالیٰ ان وسوسہ اندازیوں کو یوں ختم کرتا ہے کہ علمی اور عقلی سطح کے بلند ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ان متشابہات کو محکمات میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔ مثلاً جس وقت قرآن نے فرمایا تھا۔

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً (۹۲:۱۰)

(اے فرعون) اب ہم تیری لاش کو بچا کر محفوظ کر دیں گے تاکہ تو بعد والوں کے لئے نشان عبرت بنے۔

اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ فرعون کی ممی شدہ لاش کسی زمانے

میں منظرِ عام پر آجائے گی اور قرآن کے یہ حیرت انگیز جملے کھلی آنکھوں تمام لوگوں کے لئے واضح آیۂ محکم بن جائیں گے۔ اسی طرح آج اور بھی بہت سی متشابہات، محکمات بن چکی ہیں اور باقی بنتی چلی جا رہی ہیں۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ؕ (۴۱/۵۳) ہم انہیں آفاق و انفس میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے حتیٰ کہ ان پر کھل جائیگا کہ قرآن ہر زمانے کیلئے حق ہے۔

یہ تشریح ہم نے آیت نمبر (۳/۷) کی عام تفسیر کے مطابق کی ہے۔ عام علماء مفسرین اسی تفسیر کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ پر وقف لازم (م) کا نشان بنا ہوا ہے جس کا تقاضا یہی ہے کہ جملہ یہاں ختم ہو گیا اور وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ میں واؤ استیناف کا ہے یعنی وہاں سے دوسرا جملہ شروع ہو رہا ہے اور نئی بات شروع ہو رہی ہے کہ جو لوگ علم میں رسوخ رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں (سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں) لیکن امام ابن تیمیہؒ نے اور ان کی طرح دوسرے بعض علماء نے وقف لازم کا انکار کیا ہے اور وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا کا عطف اللہ پر کیا ہے۔ جس کی بنا پر ترجمہ یوں ہوگا: "اور ان کا مطلب سوائے اللہ اور راسخون فی العلم کے کوئی نہیں جانتا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے۔ سب کی سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں" مگر ہمارا نقطۂ نظر اس تفسیر کے مطابق بھی پوری طرح ثابت ہوتا ہے کیونکہ جس طرح پہلی تفسیر کے مطابق اگر آیات متشابہات کو سوائے خدا تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا۔ تو ظاہر ہے کہ رسولؐ بھی نہیں جانتے اسی طرح دوسری تفسیر کو بھی اگر مان لیا جائے کہ "راسخون فی العلم" بھی اسے سمجھتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ خود رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم بھی راسخون فی العلم میں شامل ہیں۔ تو ان متشابہات کی فہم میں سے صرف رسول ہی کی خصوصیت نہ رہی، راسخون فی العلم بھی اس فہم میں آپ کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اور معلوم ہے کہ

راسخون فی العلم تو اہل کتاب میں بھی موجود تھے۔

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا۔ (۴/۱۶۲) لیکن اہلِ کتاب میں جو راسخون فی العلم ہیں اور مومن (راسخ العلم) سب اس پر بھی ایمان لاتے ہیں جو آپ پر نازل کیا گیا اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا تھا اور وہ نماز قائم کرنے والے ہیں زکوٰۃ دینے والے ہیں اور اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ ہم عنقریب انہیں بڑا اجر عطا فرمائیں گے۔

بہر حال اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ متشابہات کے معنے اور مطلب اگر دوسرے مسلمانوں کی طرح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم بھی نہیں سمجھتے تھے تو اس باب میں عام مسلمانوں کے ساتھ آپ کا برابر ہونا ثابت ہوتا ہے اور اگر دوسری تفسیر مان لی جائے۔ تب بھی آپ کے ساتھ راسخون فی العلم کا بھی ان آیات کے مطالب و معانی کو سمجھنا ثابت ہوتا ہے جس سے عام راسخون فی العلم کے ساتھ اس باب میں آپ کی مساوات ثابت ہوتی ہے جبکہ راسخون فی العلم کوئی ماورائی مخصوص و ممتاز درجہ نہیں ہے کیونکہ وہ اہل کتاب میں بھی پائے جاتے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام نے بیٹے کے حق میں دُعا فرمائی مگر تنبیہ الٰہی نازل ہو گئی

بیٹے کے متعلق حضرت نوح علیہ السلام کی فہم بھی صحیح نہیں تھی لڑکے کے غرق ہونے کے بعد اللہ تعالےٰ سے سوال کیا کہ میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور جب تک حق تعالےٰ نے خود ہی اپنی وحی سے اس کا مطلب نہ سمجھایا حضرت نوح علیہ السلام بیٹے کو اپنا اہل ہی سمجھتے رہے حالانکہ واقع فہم نوح کے خلاف

ہوا۔ یعنی لڑکا غرق ہوگیا اور حق تعالیٰ نے فہم نوحؑ کے خلاف فیصلہ صادر فرمایا
اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ (۱۱/۴۶)۔ وہ یقیناً تمہارے اہل میں سے نہیں ہے۔

پس رسولوں کی فہم بھی ایسی نہیں ہوتی کہ ضرور بہر صورت ہی جو نتیجہ وہ نکالیں۔ صحیح ہی ہو۔ اور جب حالت یہ ہے تو خود فیصلہ فرما لیا جائے کہ رسل وانبیاء کے اقوال کس طرح حجت ہو سکتے ہیں؟ حضرت نوحؑ نے جو فرمایا تھا کہ "اے میرے رب! میرا بیٹا میرے اہل میں سے ہے" کیا یہ وحی خفی تھی؟ اور کیا یہ قولِ رسول حجت تھا؟ کاش کہ اہلِ حدیث حضرات جو مختلف قسم کی سینکڑوں انسان پرستیوں کی دلدل سے نکل چکے ہیں۔ رسول پرستی[1] سے بھی دامن بچا کر سچے پکے موحد بن جائیں اور یہ چیز ان کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں کیونکہ رسول کو بشر تو وہ پہلے ہی تسلیم کر چکے ہیں۔

حروف مقطعات بھی وحی الٰہی ہیں

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر حروف مقطعات بھی نازل ہوتے تھے۔ سو جس طرح كٓهٰيٰعٓصٓ اور حٰمٓ عٓسٓقٓ وغیرہ آپکو ملتے تھے اسی طرح باقی قرآن بھی ملتا تھا۔ اور اگر کوئی تفسیر وفہم بھی ملتی تھی تو وہ بھی وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ؕ
(۲۵/۳۳) اور نہیں لاتے وہ آپکے پاس کوئی مثال مگر ہم لے آتے ہیں آپ کے پاس صحیح جواب اور بہترین توجیہہ۔
کے مطابق خدائی الفاظ کا جامہ پہن کر داخل قرآن ہو جاتا تھا۔ لیکن اگر بالفرض کوئی مضمون (بقول اہل حدیث) بغیر الفاظ کے بھی وحی ہوتا تھا۔ تو چونکہ وہ مضموناً قرآن تھا۔ اور چونکہ قرآن کی بے مثلیت کی تحدی کرنا اور اس کی حفاظت کا ذمہ لینا حق تعالیٰ کا کام ہے اسی لئے ضروری تھا کہ اس مضمون کو حق تعالیٰ اپنے ہی

---

[1] جو درحقیقت رواۃ پرستی اور روایت پرستی ہے۔

پسندیدہ اور روشن تر الفاظ کا جامہ پہنا کر کسی دوسرے موقعہ پر ہی سہی قرآن مجید میں شامل کر کے یقینی طور پر محفوظ اور ہر طرح سے بے مثل ویے نظیر اور واضح تر بنا دے۔ اور یوں حضورؐ کی تمام وحی کا ممتاز مجموعہ ہمارے پاس ہر وقت موجود رہے۔ مگر اہل حدیث حضرات تو ان حروف مقطعات کی وحی خفی والی تشریح بھی آج تک پیش نہ کر سکے۔ آہ وحی خفی پر ایمان رکھنے والے بیچارے اہلحدیث، خلاصہ یہ کہ اگر مقطعات کی تفسیر خارج از قرآن کسی وحی میں آئی تھی تو ظاہر ہے کہ حضورؐ نے وہ وحی چھپائی نہیں ہوگی۔ لہٰذا اسے پیش کیا جائے۔ مگر آج تک تمام علماء اس کے پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ قرآن مجید کے علاوہ حضور پر اور کوئی وحی نہیں آتی تھی۔ اب رہ گئی دو صورتیں یعنی ۱ یا تو حروف مقطعات کی تفسیر کوئی نہیں جانتا، نہ رسول نہ دوسرا کوئی اور شخص۔ اس صورت میں بھی ہمارا مدعا ثابت ہے کہ بشری کمزوری میں رسول وغیر رسول دونوں برابر ہیں ۲ یا یہ سمجھا جائے کہ تدبر فی القرآن سے حروف مقطعات کے معنیٰ ہر کوشش کرنے والا دریافت کر سکتا ہے۔ اس صورت میں بھی ہمارا استدلال برقرار رہتا ہے یعنی یہ کہ بشری حیثیت سے فہم القرآن کا حق جس طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ہے اسی طرح دوسروں کو بھی ہے، کیوں کہ دونوں کے فہم بشری ہیں، معصوم عن الخطاء نہیں ہیں۔

جیسا بتایا جا چکا ہے کہ یقیناً یقیناً "محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تمام باتیں وحی نہیں تھیں —— جیسا کہ

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (۹/۴۳)۔

اللہ آپکو معاف فرمائے آپ نے ان منافقین کو (تبوک سے

پیچھے رہ جانے کی) اجازت کیوں دیدی۔ جب تک آپ پر واضح نہ ہو جاتا کہ کون لوگ سچ بول رہے ہیں اور آپ جھوٹوں کو بھی نہ پہچان لیتے۔

اور

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ؁ اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ۭ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰۗـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ؀ (۵۸/۲-۱)

اللہ نے اس عورت کی بات سن لی ہے جو (اے پیغمبر!) آپ سے اپنے شوہر کے بارہ میں جھگڑ رہی ہے اور اللہ سے شکایت کر رہی ہے اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا ہے۔ یقیناً اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔ تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کر لیتے ہیں (انہیں ماں کہدیتے ہیں) وہ ان کی مائیں نہیں ہیں۔ ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے انہیں جنم دیا ہے۔ البتہ یقیناً وہ ایک ناپسندیدہ بات اور جھوٹی بات کہہ گذرتے ہیں اور یقیناً اللہ معاف فرمانے والا بخشش فرمانے والا ہے۔

ان دونوں آیاتِ کریمہ سے ثابت ہے کہ حضورؐ کا ہر قول وحی سے نہیں ہوتا تھا تو اس صورت میں جب وحی کرنا خدا کا کام ہے تو وحی کو غیر وحی سے ممتاز اور جدا کر دینا بھی خدا ہی کا کام ہونا لازم ہے اور ظاہر ہے کہ جس وحی کو حق تعالیٰ جدا کر کے ہمیں دے گا، اسے انسانی الفاظ میں رکھ کر نہیں دے گا۔ بلکہ اسے اپنی ترتیب دیئے ہوئے اپنے الفاظ میں ہی ہمیں بخشے گا۔ یہ کام حق تعالیٰ نے صرف قرآن مجید کی صورت میں

ہی ہمارے لئے کر دیا ہے اور ہم پر یہ بار مطلقاً نہیں ہے کہ ہم سونگھ سونگھ کر وحی کو غیر وحی سے جدا کرتے پھریں۔ اور سب کچھ کرنے کے بعد بھی ظن و تخمین سے چھٹکارا نہ پا سکیں

نوٹ:۔ اب اگرچہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ آنحضورؐ کے اپنے اقوال وحی نہیں تھے۔ لیکن اگر بفرض محال بقول اہلحدیث مان لیا جائے کہ قرآن کے علاوہ بھی حضورؐ کے بعض قول وحی سے بھی ہوتے تھے (کیونکہ تمام اقوال کے وحی ہونیکے اہلحدیث بھی قائل نہیں ہیں) تو اس فرضی نظریہ کے مطابق ہونا یہ چاہیئے تھا کہ جب کوئی راوی کسی محدث کے سامنے کوئی حدیث بیان کرتا تو اس محدث کا اولین فرض یہ ہوتا کہ وہ اس سے پوچھتا کہ کیا یہ حدیث وحی سے ہے یا بغیر وحی کے ہے۔ مگر محدثین نے راویوں سے یہ کبھی دریافت نہیں کیا کہ تم جو حدیث سنا رہے ہو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی سے فرمائی تھی یا بغیر وحی کے بتلائی تھی۔ انہوں نے تو حدیثوں کو اپنے خیال میں صرف اسوقت کے واقعات کے لحاظ سے ہی جمع کر لیا تھا وہ صحابہؓ کے اقوال و افعال کو بھی اسی طرح لے آئے ہیں جس طرح خود رسول اللہ کے اقوال و افعال کو، پس اگر حدیثوں میں غیر وحی کے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کوئی ایسی وحی بھی موجود ہے جو قرآن مجید میں نہیں لائی گئی اگرچہ حوالۃً ہی سہی تو بالضرور اہل حدیث ابھی تک اس بوجھ کے تلے دبے ہوئے ہیں کہ حدیثوں کی وحی کو غیر وحی سے محض اپنے خیال کے ماتحت ہی سہی ممتاز کر کے دکھلائیں۔ کتنی تعجب خیز بات ہے کہ پرانی کتب الٰہیہ میں تحریف، یعنی موضوعات کے داخل ہونے اور وحی کے غیر وحی سے مخلوط ہو جانے پر تو اللہ تعالےٰ نے انہیں منسوخ کر دیا اور غیر مخلوط اور تحریف سے پاک وحیوں کا مجموعہ قرآن مجید کی صورت میں نازل فرمایا۔ لوگوں پر یہ بات نہیں چھوڑی گئی کہ وہ خود اپنی تحقیق اور اپنے اجتہاد سے اس مخلوط وحی میں سے اصل وحی کو ممتاز کر کے دکھلائیں۔ مگر آخری نبی کی وحیوں کے ایک حصہ کو مخلوط صورت میں رہنے دیا اور بیچارے اہلحدیثوں پر یہ بوجھ آپڑا کہ وحی خفی کے مخلوط حصوں کو غیر وحی سے اپنے اجتہاد اور تحقیق سے ممتاز کریں مگر اللہ کا شکر ہے کہ اس نے بذریعہ قرآن ہمیں اس مصیبت سے بچا لیا ہے ۔ فالحمد للہ ثم الحمد للہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
اهدنا الصراط المستقيم

قرآن مجید اور حدیث

یعنی

کلام الٰہی اور قولِ البشر میں فرق

حدیث کے متعلق لوگوں کے خیالات میں سخت گڑبڑ مچی ہوئی ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں ہی سُنی جاتی ہیں۔ عام لوگ تو علیحدہ رہے۔ ذی علم اور فاضل اصحاب بھی مختلف اوقات میں مختلف خیالات کا اظہار فرماتے ہیں۔ کمترین نے برہان القرآن میں اس کا ایک واضح نمونہ ہدیہ ناظرین کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خاکسار کو جواب دینے میں لوگوں کے مختلف اقوال کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

بڑے شکر کا مقام ہے کہ رسالہ معارف جلد ۱۵ نمبر ۴ میں مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے اپنا خیال حدیث کے متعلق بہت کچھ وضاحت کے ساتھ ظاہر فرما دیا ہے۔ لیکن ابھی تک کئی ایک باتیں قابلِ استفسار باقی ہیں۔ مولانا ممدوح کے اخلاق سے بفضلِ الٰہی امید ہے کہ آنجناب ان استفسارات کے متعلق پوری روشنی ڈالیں گے۔ع

مولانا صاحب نے اپنے مضمون میں یہ تو تسلیم فرما لیا ہے کہ قرآن مجید کے برخلاف کوئی حدیث قابلِ تسلیم نہیں اور یہ بھی ارشاد کیا ہے کہ عقلی پہلو سے بھی بعض احادیث پر اعتراضات کئے گئے ہیں۔ لیکن چند حدیثوں کے متعلق لکھا ہے کہ "نقلی حیثیت سے متعدد حدیثوں کی قطعیت اور صحت پر خود محدثین وفقہا کے زمانہ میں کافی بحث ہو چکی ہے"۔

صحیح حدیثوں کے دو حصے: اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ متعدد حدیثیں بالضرور قطعی اور صحیح یعنے خود

ع حضرت خواجہ احمد کا یہ مقالہ مولانا عبدالسلام ندوی کے مضمون "اجتہادات نبویہ" پر ایک تبصرہ ہے جسے ہم خواجہ صاحب ہی کے الفاظ میں پیش کر رہے ہیں تاکہ ناظرین انکے اصل طرزِ تحریر کو بھی ملاحظہ فرمائیں۔

رسولِ کریمؐ کی ہیں پھر مولانا موصوف نے ان حدیثوں کے جو یقیناً رسولِ کریمؐ کی ہیں۔ دو حصے کئے ہیں ؏ بڑے حصے کے متعلق آنجناب نے بصفائی تمام تسلیم فرما لیا ہے کہ ان حدیثوں میں رسولِ کریمؐ کا معرا عن الخطا نہ ہونا بے شبہ صحیح ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امت کو ایسی ثابت شدہ حدیثوں کی حسبِ ضرورت ترمیم و تنسیخ کا پورا اختیار ہے۔ باقی رہا قطعی حدیثوں کا وہ تھوڑا سا حصہ جو عبادات و معاد وغیرہ سے تعلق رکھتا ہے مولانا موصوف کے نزدیک یہ حصہ وحی یا اجتہاد بمنزلہ وحی ہے۔

اگر یہ بات صحیح ہے تو کیا اس صورت میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ان متعدد حدیثوں کو جو بمنزلہ وحی ہیں اور جن کو قرآن مجید کی طرح بنیادی اصول بنانا لازم سمجھا جاتا ہے۔ الگ کر کے ایک رسالہ کی صورت میں دنیا کے آگے پیش کیا جائے۔ بمنزلہ وحی حدیثوں کو ان حدیثوں کے ساتھ مخلوط رکھنے سے جو بمنزلہ وحی نہیں ہیں۔ بڑے نقصان پیدا ہوتے ہیں مثلاً

اوّل:۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک بمنزلہ وحی حدیثوں کی کچھ قدر نہیں۔ ان کے نزدیک بمنزلہ وحی حدیثوں کو ان حدیثوں کے ساتھ جو معرا عن الخطا اور بمنزلہ وحی نہیں ہیں۔ مخلوط رکھنے میں کچھ حرج نہیں پایا جاتا۔

لیکن یہ بات سورج کی طرح روشن ہے کہ خدا تعالیٰ کے تصرف اور دخلِ خاص سے بمنزلہ وحی بنائی ہوئی حدیثیں قرآن بے مثل کی مثل ہونی لازم ہیں اور رسولِ خدا کی اپنی بشری عقل کی باتیں جو بقول مولانا صاحب بے شبہ معرا عن الخطا نہیں محض بشری اجتہادات ہیں۔ ان دونوں قسم

؏ احادیث کی یہ تقسیم علامہ شبلی نے الفاروق و سیرۃ النعمانی میں بحوالۂ فاروق اعظمؓ و امام اعظمؒ و شاہ ولی اللہ وغیرہ پیش کی ہے۔ بہت سے علمائے مصر بھی اسی کے قائل ہیں، اپنی کتاب رسائل و مسائل میں یہی فرق مودودی صاحب نے داڑھی کی بحث میں کیا ہے لہٰذا یہ تمام اعتراضات ان پر بھی وارد ہوتے ہیں۔

کی حدیثوں کی عزت و منزلت میں زمین و آسمان کا تفاوت ہونا لازم ہے۔ جسطرح قرآن محفوظ کا آمیزش غیر سے پاک رہنا ضروری ہے۔ یہی حال بمنزلہ وحی حدیثوں کا بھی ہونا چاہیئے۔ مگر افسوس ہے کہ علماء کرام نے آج تک بمنزلۂ وحی حدیثوں کو غیر وحی حدیثوں سے الگ کر کے دکھلانے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ علماء کے نزدیک خدا تعالیٰ کے تصرف خاص کی باتوں اور رسول کے اپنے بشری اجتہادات میں امتیاز کر کے دکھلانے کی کوئی ضرورت نہیں اور خدائی اور بشری باتوں کے گڈ مڈ ہو جانے میں کوئی حرج نہیں اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یا تو الٰہی تصرف کی باتیں ہیچ ہیں :۔ انہیں بشری باتوں سے ممتاز کر کے دکھلانے کی کوئی ضرورت نہیں اور یا رسول کے وہ اجتہادات جو معرا عن الخطا نہیں وہ بھی خدائی فرمانوں کے برابر اور ان کے ساتھ مخلوط رہنے کے حقدار ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

دوم :۔ اندریں صورت ہر شخص اپنی اپنی رائے سے کسی حدیث کو وحی ٹھہرائے گا۔ اور کسی کو غیر وحی۔ اس طرح اجتہادی اختلافات کے علاوہ خود بنیادی وحی میں بھی مسلمانوں کے درمیان نئے نئے اختلافات پڑتے رہیں گے۔

سوم :۔ اگر بمنزلہ وحی حدیثیں معین و مشخص کر کے ایک رسالہ کی صورت میں دنیا کے آگے پیش کر دی جائیں تو مسلمانوں کے آپس کے لڑائی جھگڑے بہت کچھ کم ہو جائیں اور بات بات میں ایکدوسرے پر جو تشدد غیر وحی حدیثوں کی بنا پر کئے جا رہے ہیں ان میں بڑی حد تک تخفیف ہو جائے لیکن دونوں قسم کی حدیثوں کے مخلوط رہنے کے سبب اس نقصان سے بچاؤ نہیں ہو سکتا۔

چہارم :۔ اگر غیر مذاہب کے لوگ کسی حدیث پر اعتراض کریں تو دونوں حدیثوں کے مختلط ہونے کے باعث مسلمان انہیں کس طرح جواب دے سکتے ہیں کہ یہ حدیث بمنزلہ وحی نہیں اس لئے تمہارا اعتراض باطل ہے اگر بمنزلہ وحی حدیثیں ایک رسالہ کی صورت میں الگ موجود ہوتی تو مسلمان ان معترضین کو اس رسالے کے باہر کسی اعتراض کرنے کا موقعہ ہی نہ دیتے صرف اتنی بحث باقی

رہ جاتی کہ آیا اس رسالہ کی حدیثیں بمنزلہ وحی ہیں یا نہیں۔ لیکن بڑے انبار کی ذمہ داری سے تو جان چھوٹ جاتی۔

ہمارا طرزِ عمل پنجم: ہم لوگ حدیثوں کو ہرگز ہرگز بمنزلہ وحی نہیں مانتے لیکن بطور معقول ان کے لینے کے قائل ہیں جب ہم اپنی عقل سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور شیخ سعدی اور مولانا روم کی باتوں سے مستفید ہو سکتے ہیں تو کیا جناب رسولِ خدا کی عقلی و اجتہادی باتیں ہی مفید یا معقول ہونے کی صورت میں ہمیں ڈنگ مارتی ہیں ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں!

اندریں حالت اگر وہ متعدد حدیثیں جنہیں بمنزلہ وحی قرار دیا جاتا ہے الگ کر کے ایک رسالہ کی صورت میں پیش کی جاتیں اور ہم انہیں معقول یا مفید یا اپنی کسی ضرورت کو پورا کرنے والی دیکھتے تو عملاً ہمیں بھی ان سے خواہ مخواہ اختلاف پیدا کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہ رہتی وغیرہ وغیرہ۔

برادران! اگر خدا تعالےٰ نے متعدد حدیثوں کو اپنے تصرف اور دخلِ خاص سے بمنزلہ وحی بنایا ہوتا تو کیا اس ذات بابرکات کا تصرف اس بات میں بھی نہیں ہونا چاہیئے تھا کہ وہ انہیں الگ کر کے ہمارے پاس پہنچا دیتا۔ اچھا اگر معاذ اللہ خدا تعالیٰ نے اپنا کام خود نہیں کیا، تو اب مولانا صاحب ہی جنہیں بمنزلہ وحی اور غیر وحی حدیثوں کے پرکھنے کا گر ہاتھ آ گیا ہے، بمنزلہ وحی حدیثوں کو الگ کر کے ایک رسالہ کی صورت میں دُنیا کے آگے پیش کر دیں۔ کیا ہم امید کر سکتے ہیں کہ مولانا ممدوح کبھی بھی ایسا کر کے دکھلائیں گے اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تو کیا ایسے بزرگوں کو زیبا ہے کہ عام خیالات کو پرچانے کے لئے ایسی باتیں بنائیں۔ بمنزلہ وحی حدیثوں کو تو الگ کر کے نہ دکھلا سکیں لیکن ان کے بمنزلہ وحی ماننے پر زور دیتے جائیں۔

مولانا کا روئے سخن اپنے مضمون میں اگرچہ خواجہ عباد اللہ صاحب اختر بی۔ اے کی جانب ہے مگر چونکہ حق کے ثبوت کے لئے یہ کچھ ضروری نہیں کہ

کہ سامنے فلاں پہلوان ہی کھڑا ہو۔ بلکہ ہر ایک کو سمجھانا مقصود ہوتا ہے اس لئے امید ہے کہ مولانا موصوف خاکسار کی کمزوری کو خیال میں نہیں لائیں گے بلکہ کمترین کے استفسارات کا جواب دیکر اپنے ہی مضمون کو مکمل اور مبرہن بنادیں گے۔

کمترین نے بفضل الٰہی اعتراضات کے جوابات کا سلسلہ شروع کر دیا ہے اور بتوفیق الٰہی ایک اعتراض کا جواب بھی دے چکا ہوں۔ اس لئے اب مولانا صاحب کے مضمون "اجتہاداتِ نبویہ" کو پیش کرتا ہوں۔ پھر اس مضمون کے جواب میں انشاء اللہ تبارک وتعالےٰ چند استفسارات ہدیہ ناظرین کروں گا۔ اگر مولانا صاحب ان پر روشنی ڈال کر ممنون فرمائیں گے تو عین سعادت سمجھوں گا۔

اجتہاداتِ نبویہ

(از مولانا عبدالسلام صاحب ندوی)

"نقلی حیثیت سے متعدد حدیثوں کی قطعیت اور صحت پر خود محدثین و فقہاء کے زمانے میں کافی بحث ہو چکی ہے اور عقلی پہلو سے بھی بعض احادیث پر اعتراضات کئے گئے ہیں۔ قرآن مجید کو بھی احادیث کی صحت کا معیار قرار دیا گیا ہے۔ اور جو حدیثیں اس کے مخالف نظر آئی ہیں۔ ان کو خود صحابہ نے بھی ناقابلِ تسلیم قرار دیا ہے لیکن بایں ہمہ اصولی حیثیت سے اتنا سب نے تسلیم کر لیا ہے کہ حدیث ایک حجت شرعی بلکہ وحی غیر متلو ہے اور اس کا ایک معتدبہ حصہ اصلی و نقلی اعتراضات سے محفوظ ہے لیکن اس زمانہ میں بعض لوگ اس متفقہ رائے سے اختلاف کرتے ہیں اور وہ حدیث کے کسی حصہ کو بھی حجت نہیں خیال کرتے۔ چنانچہ خواجہ عباداللہ اختر بی۔ اے امت مسلمہ کے ماہوار رسالہ بلاغ بابت اپریل ۱۹۲۵ء میں ایک مضمون کے سلسلے میں احادیث کے

متعلق لکھتے ہیں کہ اگر بالغرض۔

"ان کی صحت کسی علمی شہادت سے پایۂ ثبوت کو (بھی) پہنچ چکی ہو (تو وہ) اجتہادات نبوی ہیں اور انہی حالات خارجی اور ذہنی کے تحت قابل عمل ہیں جو رسول کریمؐ کے زمانے میں یا اس قرن میں رونما ہوئے"۔

کیونکہ ہمارے رسول کریمؐ

"خارجی اور ذہنی حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انہی اصول کی بنا پر جو قرآن میں مفصل مذکور ہیں۔ اجتہاد فرمایا کرتے تھے جنہیں ہم احادیث سے موسوم کرتے ہیں"۔

لیکن ان میں اور قرآن مجید کے اصول میں یہ فرق ہے کہ

"احکام حالات کے مناسب وضع ہوتے ہیں اور اصول فطری ہوتے ہیں جو کبھی تبدیل و تحویل نہیں ہوتے"۔

اگرچہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان غیر متبدل اصول سے جو نتائج نکالے جائیں گے وہ بھی غیر متبدل ہوں گے۔ اس لئے احادیث میں جو احکام اصولی طور پر قرآن مجید سے اخذ کر کے بیان کئے گئے ہیں ان کو بھی غیر متبدل ہونا چاہیئے لیکن با اینہمہ غور و فکر کے بعد احادیث پر نظر ڈالنے سے جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا ہے۔ خواجہ صاحب کو معلوم ہوتا ہے کہ

"یہ اجتہاد وقتی تھا"

اب ان اقتباسات کو پڑھ کر قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان وقتی اجتہادات کی حیثیت کیا ہے؟ اور ان میں اور عام امت کے اجتہاد میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟ خواجہ صاحب کے نزدیک "اجتہادات نبویہ" کو عام امت کے اجتہاد پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے بلکہ تمام اجتہادات کی طرح ان میں بھی غلطی کا احتمال ہے اور اگر یہ اجتہادات صحیح بھی ہوں تو قرآن کی طرح ابدی نہیں ہیں غرض یہ کہ رسول کریمؐ کے اجتہادات

بھی معرّا عن الخطا نہ تھے۔ نہ ابدی تھے۔

اب اس مضمون میں عقلی و نقلی حیثیت سے صرف یہ مسئلہ تنقیح طلب ہے کہ

۱۔ اجتہادات نبویہ میں غلطی کا احتمال ہو سکتا ہے؟ یا نہیں؟

خواجہ صاحب اگر اہلِ قرآن یا اتباعِ سید احمد خان میں ہیں تو سرِ دست ہمارا خطاب ان سے نہیں ہے۔ لیکن عام امتِ مسلمہ کے نزدیک یہ سوال بالکل صاف ہے اور آئمہ و محققین نے اکثر مسلمانوں کے دلوں کو شک و شبہ کے زنگ سے پاک کر کے اس قدر جلا دیدی ہے کہ ان کے دل میں اس قسم کے سوالات پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔ مثلاً شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں "مبحث استنباط الشرائع من حدیث النبی صلے اللہ علیہ وسلم" کا ایک خاص باب باندھا ہے۔ اور اس میں سب سے پہلے "علوم نبویہ" کی نوعیت پر بحث کی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:۔

رسول اللہ صلعم سے جو حدیثیں روایت کر کے کتب حدیث میں جمع کی گئی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ وہ حدیثیں جو منصب رسالت و تبلیغ شریعت سے تعلق رکھتی ہیں اور خداوند تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ

وما اتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتھوا

پیغمبر جو کچھ تم کو دیدے اس کو لے لو اور جس چیز سے روکدے اس سے رُک جاؤ۔

اسی قسم کی حدیثوں سے تعلق رکھتا ہے اور معاد اور عجائبات ملکوت سے جو علوم تعلق رکھتے ہیں وہ بھی اسی قسم میں داخل ہیں اور یہ تمام علوم وحی کی طرف منسوب ہیں۔

شرائع۔ عبادات اور اجتماعیات کے گذشتہ تعینات بھی اسی منصب

رسالت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان میں بعض وحی کی طرف اور بعض اجتہاد کی طرف منسوب ہیں۔ لیکن رسول اللہ صلعم کا اجتہاد بھی بمنزلہ وحی کے ہے کیونکہ خدا نے آپکو اس سے محفوظ و معصوم رکھا ہے کہ آپ کی رائے غلطی پر قائم ہو۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ آپ کا اجتہاد کسی نص سے مستنبط ہو جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے بلکہ زیادہ تر اس کی صورت یہ تھی کہ خداوند تعالی نے آپکو شریعت کے مقاصد۔ تشریع۔ تیسیر اور احکام کے اصول سکھا دیئے تھے اور آپ نے انہی مقاصد کو جو وحی کے ذریعہ سے حاصل ہوئے تھے ان اصول و قوانین کے ذریعہ سے بیان فرمادیا۔ متفرق حکمت کی باتیں اور عام غیر موقت و غیر منضبط مصلحتیں، مثلاً اخلاق صالحہ اور اخلاق غیر صالحہ کا بیان بھی اسی منصب تبلیغ رسالت میں داخل ہے۔ اور ان میں اکثر اجتہاد کی طرف منسوب ہیں یعنی خداوند تعالے نے آپکو اجتماعی اور تمدنی قوانین سکھا دیئے تھے۔ اور آپ نے انہی سے حکمت کی باتوں کو اخذ کیا۔ اور انہی سے کلیات بنائے۔ فضائل اعمال۔ اور مناقب اعمال بھی اسی منصب سے وابستہ ہیں اور میرے خیال میں ان میں بعض وحی سے اور بعض اجتہاد سے تعلق رکھتے ہیں۔

۲۔ دوسری قسم وہ ہے جس کو منصب تبلیغ رسالت سے تعلق نہیں اور رسول اللہ صلعم کا یہ ارشاد کہ "میں تمہاری طرح کا ایک آدمی ہوں جب تمہارے دین کے متعلق کوئی حکم دوں تو اسکو قبول کرلو اور جب تم کو اپنی رائے سے حکم دوں تو میں صرف ایک انسان ہوں" اس طرح کھجوروں کے جفت ہونے کے معاملہ میں آپ کا یہ ارشاد کہ میں نے ایک رائے قائم کی تھی تم لوگ میری رائے پر عمل نہ کرو۔ البتہ جب میں خدا کی طرف سے تمہارے سامنے کوئی بات بیان کروں تو اس کو قبول کرلو

کیونکہ میں خدا کے معاملے میں جھوٹ نہیں کہتا اسی غیر تبلیغی منصب سے متعلق ہے طبی مسائل بھی اسی دوسری قسم میں شامل ہیں اور آپ کا یہ فرمانا کہ تم لوگ سیاہ اور سفید پیشانی کے گھوڑے کو استعمال کیا کرو۔ اسی سلسلے میں داخل ہے اور اس کا دار و مدار تجربہ پر ہے آپ نے علی سبیل العادت نہ علی سبیل العبادت اور اتفاقاً نہ کہ قصداً جو کچھ کہا ہے وہ بھی اسی قسم سے تعلق رکھتا ہے اپنی قوم کے خیالات کے موافق آپ نے جو کچھ بیان کیا ہے مثلاً ام زرع کا واقعہ اور خرافہ کی حدیث تو یہ بھی اسی قسم سے متعلق ہے۔

اور زید بن ثابت سے جب کچھ لوگوں نے حدیث بیان کرنے کی خواہش کی تو انہوں نے اسی نکتہ کو ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ میں آپؐ کا پڑوسی تھا۔ جب آپ پہ وحی نازل ہوتی تھی تو آپ مجھے بلوا لیتے تھے اور میں اس کو لکھ لیتا تھا ہم جب دنیا کی باتیں کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ شریک کلام ہوتے تھے اور جب ہم کھانے پینے کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہماری طرح اس کا ذکر فرماتے تھے تو کیا میں آپ کی ان تمام باتوں کو بطور حدیث کے بیان کردوں اس زمانہ کی جزئی مصلحتیں بھی جو تمام امت کے لئے لازمی نہیں ہیں وہ بھی اسی دوسری قسم میں شامل ہیں مثلاً فوجوں کی آراستگی اور اس کے شعار کی تعیین۔ حضرت عمر کا یہ قول کہ اب ہم کو رمل سے کیا کام ہم اس طریقہ سے ایک قوم پر اپنی قوت و توانائی کا اظہار کرتے تھے لیکن اب خدا نے اس کو ہلاک کر دیا۔ اسی دوسری قسم سے تعلق رکھتا ہے بہت سے احکام بھی اسی دوسری قسم پر محمول ہیں۔ مثلاً آپ کا یہ ارشاد کہ جس مسلمان نے کافر کو قتل کیا اس کا تمام سامان جنگ اسی کے لئے ہے۔ آپ کے مخصوص فیصلے بھی اسی دوسری قسم میں شامل ہیں۔ کیونکہ آپ ان میں صرف گواہوں اور قسموں

پر اعتماد کرتے تھے۔"

ان تصریحات کے پیشِ نظر ہو جانے کے بعد خواجہ صاحب کے ان فقروں کا کہ

"اجتہادات خواہ کسی رسول یا نبی یا امام کے ہوں محض وقتی ہوتے ہیں اور اگر صحیح ہوں تو بلاشبہ حجت شرعی وقتی ہوتے ہیں۔ اجتہادات میں غلطی کا احتمال ہے اور رسول کریم کے اجتہادات بھی معرا عن الخطا نہ تھے۔"

کیا مطلب ہے؟ اگر وہ ان سے وہ اجتہادات مراد لیتے ہیں جو علوم نبویہ کی دوسری قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ تو یہ بے شبہ صحیح ہے لیکن ان کے مضمون کا عنوان "شریعت اسلام اور رجم" ہے اور یہ ظاہر ہے کہ رجم کا تعلق حدود و قصاص سے ہے جو ایک منضبط چیز ہے اور منصب تبلیغ رسالت سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لئے آپ نے جو حدود مقرر فرما دیئے ہیں وہ اگر منسوب الی الوحی ہیں تو ان میں غلطی اور وقتی پابندی کا کسی طرح احتمال ہی نہیں ہو سکتا، لیکن اگر ان کی تعئین و تحدید اجتہاداً ہوئی ہے تو اس میں بھی جیسا کہ شاہ صاحب کی عبارت سے معلوم ہوا ہوگا۔ کسی قسم کی غلطی و تعئین وقت کا احتمال نہیں ہے البتہ علوم نبویہ کی دوسری قسم میں اس قسم کی بعض چیزیں نکل سکتی ہیں لیکن افسوس ہے کہ رجم کا مسئلہ اس قسم سے تعلق نہیں رکھتا۔"

جواب

معارف نمبر ۴ جلد ۱۵ بابت ماہ اپریل ۱۹۲۵ء میں مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے "اجتہادات نبویہ" پر جو مضمون شائع کیا ہے اس کی نقل (بصورت اعتراض دوم) لفظ بہ لفظ بلاغ جون ۱۹۲۵ء میں دی جا چکی ہے۔ اس کے جواب میں ذیل کے چند استفسارات پیش کئے جاتے ہیں۔ اگر مولانا ممدوح ان پر روشنی ڈالیں گے تو عین نوازش ہوگی۔

حدیثوں کا قرآن کی طرح محفوظ نہ ہونا اور ختم نبوت

استفسار اوّل اگر یہ بات سچ ہے کہ ہمارے رسول کریمؐ فی الواقع خاتم النبیین ہیں تو حضور کی ختم نبوت سے کم ازکم اتنی بات تو ضرور ماننی پڑتی ہے کہ تشریعی وحی جو تمام نوع انسان کے لئے مقصود تھی بالضرور حضور پر ختم ہو چکی ہے۔ لیکن ہمارے اس اعتقاد کو ذیل کی دو باتیں سخت صدمہ پہنچانے والی بلکہ جڑ سے اکھیڑنے والی ہیں۔

اوّل:۔ تشریعی وحی رسول مقبول کے بعد بھی آسکتی ہے تو وہ ضرور کسی اور نبی کے ذریعہ سے ہی آئے گی اور یوں ہمارے رسول خدا معاذ اللہ خاتم النبیین نہیں رہیں گے اس سے صاف کھل جاتا ہے کہ تشریعی وحی کی ضرورت کو اس وقت بھی مسلّم رکھنا ہمارے رسولِ خدا کی ختم نبوت کو مٹانا ہے۔

دوم:۔ اگر وہ تشریعی وحی جو ہمارے رسولِ خدا صلعم کے واسطے سے دنیا میں جلوہ گر ہوئی ہے ظنّی یا مخلوط یا گم ہو جائے تو بھی ظنّی کو یقینی بنانے اور مخلوط کو صاف و خالص کرنے اور گمشدہ کو دوبارہ لانے کے لئے کسی اور نبی کی ضرورت ہوگی۔ اور اس طرح بھی ہمارے رسول خدا کا خاتم النبیین ہونا قائم نہیں رہے گا۔ پس اگر تشریعی یا بنیادی وحی کا کوئی حصہ ظنی یا ضعیف بن گیا ہے یا غیر وحی کے ساتھ مخلوط ہو گیا ہے یا اس کا کوئی حصہ کھو یا گیا ہے یا تمام امت کی یاد سے بھلایا گیا ہے تو چونکہ اس صورت میں خیر منھا او مثلھا[ع] کا لانا ضروری ہو جاتا ہے اس لئے حضور کی کسی تشریعی وحی کے متعلق ایسا اعتقاد رکھنا ہمارے رسولِ خدا کی ختم نبوت کے قطعاً منافی ہے۔

بڑے افسوس کا مقام ہے کہ بہت سے لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ

ع اشارہ ہے سورۂ بقرہ کی آیت ۱۰۶ کی طرف جس کے الفاظ یہ ہیں مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا (جب ہم اپنے کسی ارشاد کو منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے بھلا کر غیر محفوظ کر دیتے ہیں تو پھر یا تو نئے حالات کے مطابق اسی جیسا یا پھر اس سے بھی بہتر ارشاد نازل کر دیتے ہیں)۔

حدیثوں میں بھی تشریعی وحی موجود ہے جو ساتھ ہی زائد از قرآن بھی ہے اور یہ بات بھی واضح ہے کہ جب وحی غیر وحی کے ساتھ یعنی صحیح احادیث غیر صحیح احادیث کے ساتھ مخلوط ہو کر مشتبہ ہو جائے تو وہ وحی کا کام نہیں دے سکتی اسی طرح جب وحی ظنی بن جائے اور اس کی قطعیت و صحت مجتہدین و محدثین کی آئندہ تحقیقات اور ان کی کافی بحث کی محتاج ہو جائے یا وہ عقل و درائت کی بناء پر رد کی جا سکے یا مخالف قرآن نظر آنے کے سبب نا قابل تسلیم قرار پائے تو اگرچہ وہ کبھی وحی ہو بھی لیکن جب وہ ایسی ظنی اور مخلوط حالت میں آجائے تو وہ وحی کی جگہ ہرگز ہرگز کفایت نہیں کر سکتی۔

پس حدیثیں اگر عام لوگوں کے خیال کے مطابق رسول خدا کی طرف تمام امت کے لئے کسی قسم کی وحی کے ذریعے سے ملی تھیں اور اب ظنی و ضعیف و مخلوط وغیرہ ہو گئی ہیں تو اس سے لازم آتا ہے کہ ان کو یقینی و خالص بنانے اور اصلی حالت پر لانے کے لئے کوئی اور نبی آئے اور رسولِ مقبول خاتم النبیین نہ رہیں لیکن اگر کمترین کے اعتقاد کے مطابق یہ مانا جائے کہ حدیثیں ابتداءً بھی کسی قسم کی وحی نہ تھیں تو اب ان کے بگڑ جانے سے کسی وحی کے بگڑنے کا کوئی حرج نہیں واقع ہوگا۔

اب مسلمانوں کا اختیار ہے کہ ان دونوں باتوں میں سے جس کو رسولِ مقبول کی رسالت کو ہمیشہ کے لئے مستقل بنانے والی سمجھیں اختیار کریں۔

حدیثوں کی حفاظت کا خدا تعالیٰ نے کوئی ذمہ نہیں لیا۔ اور کوئی شخص قسم کھا کر نہیں کہہ سکتا کہ رسولِ کریم کے تمام اقوال و افعال ہمارے پاس بلا کم و کاست پہنچ گئے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص قرآن مجید کے متعلق ایسا خیال بھی کرے کہ وہ بحفاظت الٰہی تمام و کمال ہمارے پاس نہیں پہنچا تو وہ قرآن مہیمن و محفوظ کو خاتم الکتب اور اس لئے رسول کریم کو خاتم النبیین نہیں مان سکتا۔

اہلحدیث صاحبان حدیثوں کو ظنی کہہ کے اور کئی حدیثوں کو ضعیف

تسلیم کرکے اور بعض کو عقل و درائت سے رد کر کے اور بعض کو مخالف قرآن نظر آنے کی وجہ سے ناقابل تسلیم قرار دیکر اور وحی والی حدیثوں کو غیر وحی حدیثوں کیساتھ مخلوط مان کے بھی اہلحدیث ہی بنے رہتے ہیں لیکن کیا کوئی شخص قرآن کے متعلق ان باتوں میں سے ایک کا بھی اقرار کر کے قرآن پر ایمان کا دعویٰ کر سکتا ہے؟ حاشا وکلاّ!

حاصل یہ ہے کہ اگر حدیثیں صحیح صحیح وحی تھیں تو وہ موجودہ حالت میں اگر وحی الٰہی کی جگہ کام نہیں دے سکتیں۔ پس ان کو اصلی ویقینی وحی کی صورت میں پیش کرنے کی خاطر کسی اور نبی کی ضرورت باقی ماننی پڑے گی اور اوپر ثابت ہو چکا ہے کہ یہ بات رسول کریمؐ کی ختم نبوت کے قطعاً منافی ہے۔

اندریں صورت ذیل کی دو باتوں میں سے ایک ماننا ضروری ہو جاتا ہے۔

(۱)۔ یا تو حدیثیں ابتداءً بھی رسول کریمؐ کو بذریعہ وحی کے نہیں ملی تھیں۔ اس صورت میں ان کے ظنی یا مخلوط یا گم ہو جانے سے وحی الٰہی میں کسی طرح کے نقصان کا واقع ہونا لازم نہیں آتا۔

(۲)۔ یا اگر حدیثیں ابتداءً وحی تھیں اور اب ظنی اور مخلوط ہیں یا ان کا کوئی حصہ ضعیف یا گم ہو گیا ہے تو اس صورت میں کسی اور نبی کا انتظار لازم ہوگا جو ان ظنی یا مخلوط یا گم شدہ حدیثوں کے عوض "خیر منھا او مثلھا" لادے۔ جس طرح قدیم انبیاء کی وحی مثلاً تورات و انجیل وغیرہ کے غیر محفوظ اور غیر وحی کے ساتھ مخلوط ہو جانے کی بنا پر قرآن مجید کا نزول ہوا۔

مولانا عبدالسلام صاحب کے مضمون کے مطابق مذکورہ بالا دو باتوں میں سے ایک کا ماننا بالضرور لازم آتا ہے امید ہے کہ مولانا صاحب حدیثوں کے متعلق ایسی باتیں مان کے پھر بھی ان کا بنیادی وحی رہنا ثابت کریں گے اور دکھلائیں گے کہ کیا ایسی باتیں قرآن مجید کے متعلق ماننے سے وہ وحی کا کام دے سکتا ہے کیا وحی ہونا اور ظنی ہونا دونوں باتیں ایک ہی چیز میں ایک ہی وقت میں جمع ہو سکتی ہیں۔

بعض لوگ مثلاً شیعہ اور قادیانی حضرات حدیثوں کی اس کمزوری

سے فائدہ اٹھا کر اپنے پیشوا کو نبی یا غلطیوں سے پاک امام معصوم بناتے ہیں اور بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ہمارے حضرت جی اپنے الہام و وحی کے ذریعہ سے ضعیف حدیثوں کی صحت کو معلوم کر لیتے تھے اور صحیح سمجھی ہوئی حدیثوں کے غلط ہونے کا پتہ لگا لیتے تھے اگر حدیثیں ابتداءً سچ مچ وحی تھیں اور اب ایسی حالت میں آ گئی ہیں تو وہ لوگ بلاشبہ ایسا دعوےٰ کر سکتے ہیں لیکن اس سے رسول کریم صلعم کی ختم نبوت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

کیا حضرت مسیح علیہ السلام کا دنیا میں دوبارہ لانا اسی غرض کے لئے ہے کہ وہ اپنے وحی سے ظنی حدیثوں کو یقینی بنا دیں اور اپنی اس وحی کے ساتھ قرآن مجید کی وحی کو مکمل کر دیں معاذ اللہ!

علاوہ بریں لوگوں کے اس خیال کے مطابق کہ پیغمبر کے اقوال بھی وحی خفی ہوتے ہیں۔ حضرت مسیح کے دوبارہ تشریف لانے پر حضرت مسیح علیہ السلام کے خود اپنے اقوال و افعال بھی وحی خفی قرار پائیں گے۔ اور قرآن و حدیث پر وحی کا ایک اور نیا اضافہ کر دیں گے۔

اس جگہ نئے اور پرانے نبی کے آنے میں فرق کرنا محض فضول ہے۔ اس بحث کا مدار تو صرف اس بات پر ہے کہ کیا تشریعی اور بنیادی وحی کی اصلاح کرنے اور ظنی اور مخلوط کو یقینی وحی بنانے کی خاطر کسی نبی کی وساطت کی خواہ جناب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کے دوبارہ آنے کے ذریعے کیوں نہ ہوں۔ کوئی ضرورت باقی ہے۔

مولانا عبد السلام صاحب کی خدمت فیض درجت میں کمترین نے پہلے بھی بادب گذارش کی تھی کہ اگر انہیں مخلوط حدیثوں میں سے یقینی وحی اور غیر وحی کے پرکھنے کا سچ مچ کوئی گر ہاتھ آ گیا ہے۔ تو وہ اصل وحی شدہ حدیثوں کو الگ کر کے ایک کتاب کی صورت میں دنیا کے آگے پیش کر دیں لیکن اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے اور نہ دوسرے علماء سے ہی ایسا

کرا سکتے ہیں، تو مہربانی فرما کر ذیل کی دو باتوں میں سے ایک کا اقرار کریں کہ

(۱) یا تو کام کوئی نبی اگر ہی کر سکتا ہے۔

(۲) اور یا حدیثی وحی کی یہی قدر ہے کہ غیر وحی کے ساتھ اس کے مخلوط ہو کر پڑے رہنے میں کوئی حرج نہیں۔

استفسار دوم یہ بات سورج کی طرح واضح ہے کہ رسول کریمؐ کی زندگی میں خدا تعالےٰ قرآن مجید کے ذریعہ سے حضورؐ کے بعض اقوال وافعال کی تردید کیا کرتا اور غلطیاں نکالا کرتا تھا۔ بذریعہ قرآن ان غلطیوں کے نکالنے سے ذیل کی دو باتوں میں سے ایک کا سکھانا لازم آتا ہے۔

اوّل:۔ یہ غلطیاں یا تو اس امر کے سکھلانے کے لئے نکالی جاتی تھیں کہ رسول کریم قرآن مجید میں کسی کمی بیشی کرنے کے مجاز نہیں۔ لیکن رسولِ مقبول کی غلطیاں بذریعہ قرآن ہمیشہ نکالی جا سکتی ہیں۔ اگر بات یوں ہے تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے علاوہ رسولِ خدا کے اپنے اقوال وافعال ہرگز ہرگز وحی یا ہمپایۂ وحی نہ تھے۔

دوم:۔ یا ان غلطیوں کے نکالنے سے یہ سکھلانا مقصود ہے کہ رسول مقبولؐ کے اقوال وافعال کی غلطیاں بذریعہ قرآن صرف آپ کی زندگی میں ہی نکالی جا سکتی تھیں۔ آپ کی وفات کے بعد ہرگز نہیں نکالی جا سکتیں۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے آں جناب کی تمام غلطیاں آپ کی زندگی میں اس لئے نکال دی تھیں کہ آپ کی باقی باتوں کا تمام امت کے لئے مصدقہ الٰہی ہونا ثابت ہو جائے اور امت جان لے کہ اگر حضور کی باقی باتوں میں سے کوئی ایک بھی غلط ہوتی تو خدا تعالےٰ اس کی غلطی بھی خود ہی نکال دیتا۔

اب اگر رسولِ مقبولؐ کی غلطیاں نکالنے سے خدا تعالےٰ کو یہی منظور تھا کہ حضور کی باقی تمام باتیں امت کو صحیح صحیح مل جائیں اور رسول خدا کی وفات کے بعد کسی کو بھی بذریعہ قرآن یا بذریعہ عقل و درائت ان باتوں پر لے دے

کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ تو لازم تھا کہ خدا تعالےٰ کا یہ منشاء ضرور پورا ہو کر رہتا۔

جب خدا تعالےٰ نے رسولؐ خدا کی حیات میں ہی حضورؐ کی تمام غلطیاں بذریعہ قرآن نکال دی تھیں اور نکالی بھی اس لئے دی تھیں کہ حضورؐ کی باقی تمام باتیں بلا شائبہ غلطی اور بلا کسی شک و شبہ کے ہمیشہ کے لئے صحیح مانی جا سکیں اور آئندہ ان کی صحت میں کسی شبہ کی گنجائش نہ رہے۔ بلکہ آئندہ بذریعہ قرآن بھی ان پر کوئی اعتراض نہ کیا جا سکے۔ تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ رسولِ خدا کی ان باتوں میں حضورؐ کے بعد بھی (خواہ کسی اور باعث سے ہی سہی) ویسے ہی بلکہ ان سے بڑھ کر شبہات پڑ جائیں اور احکم الحاکمین کی اٹل منشاء کے برخلاف بذریعہ عقل و قرآن ان کی تردید کرنا جائز بلکہ ضروری بن جائے۔

لیکن یہ بات سورج کی طرح روشن ہے اور مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے بھی بڑی صفائی کے ساتھ اسے تسلیم فرما لیا ہے کہ

> "عقلی پہلو سے بھی بعض احادیث پر اعتراضات کئے گئے ہیں۔ قرآن مجید کو بھی احادیث کی صحت کا معیار قرار دیا گیا ہے۔ اور جو حدیثیں اس کے مخالف نظر آئی ہیں۔ ان کو خود صحابہ نے بھی ناقابل تسلیم قرار دیا ہے"۔

اس بیان سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید صرف رسولِ خدا کی زندگی میں ہی حضورؐ کی باتوں کی غلطیاں نہیں نکالا کرتا تھا۔ بلکہ حضورؐ کی وفات کے بعد بھی حضورؐ کی باتیں ایسی ہی حیثیت میں دُنیا کے آگے پیش ہوئیں کہ اب بھی ان کی تردید بذریعہ قرآن مجید بلکہ عقلی پہلو سے بھی کی جا سکتی ہے۔ اگر خدا تعالیٰ کا منشاء یہ ہوتا کہ قرآن مجید صرف حضورؐ کی زندگی تک ہی آپ کی غلطیاں نکالے بعد کو نہ نکال سکے تو اللہ تعالےٰ عملی طور پر آئندہ کے لئے اس کی کوئی گنجائش باقی

نہ چھوڑتا۔ اور حدیثوں کو ظنی و مخلوط وغیرہ نہ ہونے دیتا۔ بلکہ قرآن مجید کی طرح محفوظ رکھتا۔

کمترین کے نزدیک حدیثوں کو ظنی اور ضعیف خود رسول کریمؐ نے ہی بنایا ہے۔ جنہوں نے صحابہ کو ان کے لکھنے سے منع فرما دیا اور لکھے ہوئے کو مٹانے کا حکم دیا اور خود اپنی تاکیدی وصیت کے لکھانے سے قرآن پاک کے کافی ہونے کے باعث باز رہے۔

صحابہ نے حدیثوں کو نہ لکھ کر بلکہ حسب استطاعت تمام لکھے ہوئے کو مٹا کر اس پر پورا پورا عمل کر کے دکھلایا۔ افسوس امام بخاری کی شہادت در شہادت کے طور پر تیار کی ہوئی کتاب کو تو پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن کسی صحابی کا کوئی چھوٹا سا رسالہ بھی نہیں دکھلایا جاتا۔ اور اس پر تماشہ یہ ہے کہ ایسی ہی ممنوعۂ کتابت حدیثوں کو وحی اور ہمپایۂ وحی اور "ما اتاکم الرسول" بتلایا جاتا ہے اور رسول کریم کی منتظمانہ اور حاکمانہ ضروری اطاعت سے چشم پوشی کر کے ایسی ہی حدیثوں کی اعتقادی اور عابدانہ اطاعت کو "اطیعوا الرسول" کا مصداق بنایا جاتا ہے۔

اس بیان سے سورج کی طرح روشن ہو جاتا ہے کہ رسول مقبولؐ کی غلطیاں بذریعہ قرآن نکالنے سے خدا تعالےٰ کا یہ منشاء ہرگز نہیں تھا کہ حضور کی غلطیاں صرف حضور کی زندگی تک ہی بذریعہ قرآن نکالی جائیں۔ بلکہ بالضرور یہ منشاء تھا کہ ہمیشہ کے لئے بذریعہ قرآن نکالی جا سکیں۔ حضورؐ کی حیات میں بھی اور پس از وفات بھی۔

اگر یہ بات صحیح ہے تو حضورؐ کی غلطیاں بذریعہ قرآن نکالنے کے مذکورہ بالا دو مقاصد میں سے دوسرا قطعاً غلط ہے۔ اس لئے پہلا مقصد ہی یقیناً صحیح ہے جس سے صاف ثابت ہو جاتا ہے کہ

رسولِ کریمؐ کی حدیثیں یقیناً وحی یا ہم پایۂ وحی نہ تھیں۔ بلکہ وقتی معلومات اور اس زمانے کے ماحول کے مطابق نیک نیت بشروں کے اجتہادات کی مانند ہی تھیں۔

اِستفسار سوم:۔ مولانا عبدالسلام صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

> زید بن ثابت سے جب کچھ لوگوں نے حدیث بیان کرنے کی خواہش کی تو انہوں نے اسی نکتہ کو ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ:۔
>
> میں آپ کا پڑوسی تھا۔ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپ مجھے بلوا لیتے تھے اور میں اس کو لکھ لیتا تھا۔ ہم جب دُنیا کی باتیں کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ شریکِ گفتگو ہوتے تھے اور جب آخرت کے متعلق کلام کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اسی طرح ہم کلام ہوتے تھے۔ اور جب ہم کھانے پینے کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہماری طرح اس کا ذکر فرماتے تھے تو کیا میں آپ کی ان تمام باتوں کو بطور حدیث کے بیان کروں"۔

اس کے متعلق عرض ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے لوگوں نے خواہش کی تھی کہ ہمیں کچھ حدیثیں سنائیے۔ یہ نہیں کہا کہ تمام رطب و یابس حدیثیں بیان کر دیجئے۔ سو اگر کوئی حدیث نبوی بطور احسن الحدیث وقرآن کی طرح واجب التبلیغ تھی تو آپ اس سے ہرگز دریغ نہ فرماتے۔ بلکہ بالضرور کوئی نہ کوئی حدیث سنا دیتے اور ان کی آرزو کو پورا کر دیتے۔ حضرت زیدؓ نے اگر کچھ سنایا تو یہ سنایا کہ

رسولِ کریمؐ کی صرف دنیاوی باتیں ہی ہماری طرح نہیں ہوتی تھیں بلکہ آخرت کی باتیں بھی ہمارے ساتھ آپ اسی طرح یعنے ہماری مانند ہی کیا کرتے تھے پھر کیا میں حضورؐ کی دنیا و آخرت کی تمام باتوں کو بطور اصل حدیث یعنے احسن الحدیث قرآن کے بیان کروں یا انہیں کسی ضروری قابلِ ذکر بات کی طرح سناؤں۔

حضرت زید کے اس بیان سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید ایسی ضروری حدیث ہے کہ جسے میں فوراً حسب الحکم حاضر ہو کر لکھ لیا کرتا تھا۔ لیکن رسولِ کریمؐ کی باقی دُنیا و آخرت کی باتیں ہماری طرح ہی کی جاتی تھیں اور قرآن کی طرح نہیں ہیں۔ کہ انہیں باوجود تمہاری خواہش کے بطور کسی قابل ذکر وحی کے سُنایا جائے۔ اس سے یہ بھی صاف کھُل جاتا ہے کہ رسولِ کریمؐ کی وہ باتیں جو آخرت یعنے معاد کے متعلق بھی ہوتی تھیں سب کی سب وحی کے ذریعہ سے نہیں کی جاتی تھیں۔

امید ہے کہ مولانا صاحب اس بات پر ضرور روشنی ڈالیں گے کہ اس حدیث سے یہ نکتہ کیسے معلوم ہوتا ہے کہ معاد کے متعلق حدیثیں ضرور وحی ہوتی تھیں۔ اس حدیث سے کسی حدیث کا وحی ہونا تو علیحدہ رہا۔ اس کا قابلِ بیان حدیث (یعنے اہم بات) ہونا بھی نہیں نکلتا۔

اِستفسار چہارم :۔ مولانا عبدالسلام صاحب فرماتے ہیں:۔

"قرآن مجید کے ان غیر متبدل اصول سے جو نتائج نکالے جائیں گے وہ بھی غیر متبدل ہوں گے۔"

کمترین عرض کرتا ہے کہ جو بشر قرآن مجید کے غیر متبدل اصول سے نتائج اخذ کرے گا تو اگر وہ نتائج بالکل واضح اور صاف ہوں گے تو ان میں غلطی کرنے سے ہر شخص بچایا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر ان نتائج کے نکالنے میں

غور و فکر کی ضرورت ہو گی یا ابھی انسانی معلومات اس حد تک نہیں پہنچے ہوں گے تو ضرور ہے کہ ان میں ہر شخص اپنے حاصل کردہ معلومات اور وقتی حالات کے ماتحت ہی غور کرے گا اور اپنے سمجھ کے مطابق ہی نتیجے نکالے گا۔ انسان اسی کے مطابق مکلف ہے جو اسے دیا گیا ہے اس حکم سے کوئی فرد بشر باہر نہیں اندریں صورت ضرور ہے کہ بشروں کے اخذ کئے ہوئے نتائج میں غلطی کا امکان ہو اور اس لئے قابل تبدیل بھی ہوں کوئی بشر اپنی موجودہ بشری طاقت سے بڑھ کر نتائج اخذ نہیں کر سکتا

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

"وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ"۔ دشمنوں کی مدافعت کے لئے جو بھی قوت تمہاری طاقت میں ہو تیار کرو۔ (۸/۶۰)

حدیثوں کے مطابق رسول کریم ؐ نے اس آیۂ مبارکہ سے اپنے زمانہ کے موافق یہ نتیجہ نکالا تھا کہ قوت سے مراد تیر اندازی ہے لیکن ہمارے زمانہ میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ قوت سے مراد ایروپلین وغیرہ ہیں۔ اس سے صاف کھل جاتا ہے کہ قرآن مجید سے جو نتائج حسب زمانہ اخذ کئے جاتے ہیں ضروری نہیں کہ وہ غیر متبدل بھی ہوں۔

رسول کریم ؐ نے قوت کی تفسیر تیر اندازی کے ساتھ کی۔ لیکن اس وقت قوت کی تفسیر تارپیڈو وغیرہ قرار دی جاتی ہے۔ اب للہ کوئی صاحب یہ بتلادیں کہ ان دونوں تفسیروں میں سے کونسی تفسیر ہمپایۂ وحی ہے۔

استفسار پنجم

مولانا ممدوح نے تمام بحث میں یہ امر تنقیح طلب قرار دیا ہے کہ

"اجتہادات نبویہ میں غلطی کا احتمال ہو سکتا ہے یا نہیں"

بلاشبہ اس بحث میں یہی امر تنقیح طلب ہے لیکن اس پر مولانا صاحب نے مدلل طور پر کوئی روشنی نہیں ڈالی صرف اتنا کہہ دیا ہے کہ "جو اجتہادات نبوی منصب رسالت اور تبلیغ شریعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں

غلطی کا احتمال نہیں باقی تمام اجتہادات جو فلاں فلاں قسم کے تھے بلاشبہ معرا عن الخطا نہیں تھے۔"

مولانا کے اس عرفان کے مطابق امر تنقیح طلب یہ ہونا چاہیئے تھا کہ:

اجتہادات نبویہ میں سے کن کن میں غلطی کا احتمال ہوسکتا ہے اور کن میں نہیں۔

پھر اس پر بھی کوئی روشنی نہیں ڈالی کہ منصب رسالت کیا ہوتا ہے۔ کمترین کے نزدیک منصب رسالت تبلیغ شریعت ہی ہے۔ (مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ) اور شریعت کا شارع صرف خدا ہے (اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ) پس کسی رسول کا منصب رسالت ہرگز ہرگز یہ نہیں ہوسکتا کہ اس کے اپنے اجتہادات سے بھی ایک حصہ وحی والی شریعت کا تیار ہو۔ جس میں کسی دوسرے انسان کو تغیر تبدل کا کوئی اختیار نہ ہو۔ جب رسول کے اپنے اجتہادات کا منصب رسالت کے ساتھ کوئی مخصوص علاقہ ہی نہ رہا۔ تو رسول کے کسی قسم کے اجتہادات کا بالکلیہ معرا عن الخطاء ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اجتہاد کسی کا بھی ہمپایۂ وحی نہیں ہوا کرتا۔ اجتہاد اور وحی دو جدا جدا حقیقتیں ہیں۔

مولانا نے اپنے مقرر کردہ امر تنقیح طلب کا کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ بلکہ اس کا تحقیقی جواب دینے سے بھی انکار کیا ہے جیسا کہ آں جناب کا ارشاد ہے کہ

(خواجہ صاحب اگر اہل قرآن یا اتباع سید احمد خاںؒ میں ہیں تو سردست ہمارا خطاب ان سے نہیں ہے۔"

کمترین کے نزدیک کسی بات کا تحقیقی جواب دینے والا ایسے کلمات اپنی زبان سے نہیں نکال سکتا امید ہے کہ مولانا صاحب اپنے پیش کردہ امر تنقیح طلب پر اپنی دوسری تحریر میں روشنی ڈالیں گے اور بتائیں گے کہ اپنا البشری اجتہاد اور رسول کی وحی الٰہی دونوں ایک کس طرح بن سکتے ہیں۔ اور اگر ایسا ہونا ممکن ہے تو رسولؐ کو وحی الٰہی دینے کی کیا ضرورت تھی؟

یہ ایک مسلّمہ قاعدہ ہے کہ:۔

اَلْمُجْتَہِدُ قَدْ یُخْطِیْ وَیُصِیْبُ"۔ اجتہاد کرنے والا چونکہ بشر ہوتا ہے اس لئے اس کا اجتہاد کبھی صحیح ہوتا ہے اور کبھی غلط۔

کیا کسی رسولؑ کے اپنے بشری اجتہادات اس قاعدہ سے مستثنےٰ ہیں؟

اِستفسارِ پنجم: مولانا صاحب بحوالہ شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں۔

خداوند تعالےٰ نے آپ کو شریعت کے مقاصد، تشریح، تیسیر، اور احکام کے اصول سکھا دیئے تھے اور آپ نے انہی مقاصد کو جو وحی کے ذریعہ سے حاصل ہوئے تھے ان اصول وقوانین کے ذریعہ سے بیان فرما دیا"۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے رسولِ کریمؐ کو شریعت کے مقاصد کی وحی کر دی تھی اور پھر اس وحی سے احکام نکالنے کے اصول وقوانین سکھا دیئے تھے۔ پس آپ نے ان اصول وقوانین کے ذریعہ سے ان وحی شدہ مقاصد کی تشریح کر دی۔

اگر یہ بات صحیح ہے تو خدا تعالےٰ نے فہمِ قرآن کے جو اصول وقوانین رسولِ خدا کو سکھائے تھے وہ کہاں ہیں۔ مہربانی فرما کر وہ اصول وقوانین ہمیں بھی سکھا دیں تاکہ ان اصول وقوانین کے مطابق تمام دُنیا کو قرآن مجید کی اصل تفسیر کا پتہ لگ جائے اور غلط و صحیح حدیثوں کا بھی فیصلہ ہو جائے۔ اگر مفسرین کو وہ اصول وقوانین یاد ہوتے تو انہیں نئے نئے اصول تفسیر اپنی طرف سے نہ گھڑنے پڑتے لیکن اگر وہ اصول وقوانین جو خدا تعالےٰ نے رسولِ مقبولؐ کو سکھائے تھے حضور نے لوگوں کو نہیں پہنچائے تو بندہ رسولِ امینؐ پر ایسا فاسد گمان نہیں کر سکتا۔

حاصل یہ ہے کہ قرآن مجید سے خارج حضور پُرنور کو کوئی اور اصول تفسیر خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں سکھایا گیا۔ صحیفہ فطرت اور عقل سے تمام لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

خدا تعالےٰ نے تدبر و تفکر و تعقل قرآن کا مکلف تو ہم سب کو بنایا لیکن اصولِ تفسیر صرف رسولِ خدا کو ہی سکھائے۔ تعجب ہے!

استفسار ہفتم:۔ جناب مولنا عبدالسلام صاحب ندوی نے جو مضمون بحوالہ جناب شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم تحریر فرمایا ہے۔ اس میں آیت کے ایک الگ کئے ہوئے ٹکڑے کے سوائے کوئی اور دلیل نہیں دی گئی وہ ٹکڑا جو ہمیشہ اپنے سیاق وسباق سے علیحدہ کر کے پیش کیا جاتا ہے حسب ذیل ہے:۔

وَ مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا۔

(۵۹/۷)۔ یعنے جو تم کو رسول دیوے اسے لے لو اور جس کے لینے سے روکے اس سے رُک جاؤ۔

اس حکم کے آگے پیچھے مالِ فئے کے دینے لینے اور روکنے رُکنے کا حکم مالِ فئے سے تو بالضرور تعلق رکھتا ہے اور اگر اس حکم کو عام بھی کر لیا جائے تو بھی مالِ فئے کا حکم اس سے قطعاً خارج نہیں ہوسکتا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جس چیز کے لئے ایک حکم دیا جائے اسی چیز کو اس حکم سے باہر قرار دینا یقیناً نامعقول ہے۔ حاصل یہ ہے کہ مالِ فئے کا سب سے پہلے مذکورہ بالا حکم میں داخل ہونا ازبس ضروری ہے۔

اور یہ بھی واضح ہے کہ مال فئے کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا رسول کریمؐ کے ساتھ ہی کوئی خاص تعلق تھا۔ مال فئے انہی شرائط کے ساتھ اب بھی خلیفوں اور بادشاہوں کے ہاتھوں میں آسکتا ہے پس اسوقت مالِ فئے کا حسبِ ضرورت تقسیم کرنا موجودہ خلفاء وملوک سے بالضرور تعلق رکھتا ہے۔

مال فئے کے لینے سے اغنیاء کو روکا گیا ہے۔ خدا تعالیٰ نے عہدِ رسالت میں ایسا مال مہاجروں فقیروں کو دلایا تھا جن کا بار انصار کے ذمہ پڑا ہوا تھا۔ اس سے مہاجر فقیر بھی آسودہ حال ہو گئے اور انصار کے سر سے بھی بوجھ اُتر گیا۔

اس وقت اگر کسی خلیفہ یا بادشاہ کو مالِ فئے مل جائے تو مناسب دیکھ کر زیادہ حاجتمندوں کو ہی دے گا اور یوں اس کے متعلق بھی یہ کہنا صحیح ہوگا کہ حاکم جو تمہیں دے اسے لے لو اور جس کے لینے سے روکے اس سے رُک جاؤ۔

رسل وانبیاء بھی مومنین سے ہی ہوتے ہیں۔ سورۂ والصافات)
وہ بھی خدا تعالیٰ کے فرمانبردار بندے ہیں۔ پس ان کے متعلق جو حکم آئے گا وہ دوسرے مومنوں پر بھی برابر عائد ہوگا۔ ہاں اگر اس حکم کا خاصۂ رسول ہونا ثابت کر دیا جائے تو یہ امر دیگر ہے۔ رسول کے کسی حکم کو اس کا خاصہ ثابت کئے بغیر پہلے ہی بطور خاصہ کے پیش کر دینا قطعاً غلط ہے۔ بہت سی آیات میں رسول و نبی کے الفاظ صراحتاً آئے ہیں۔

مگر وہ آیات رسول کے ساتھ خاص تعلق نہیں رکھتیں مثلاً

یَا ایھا النبی اتق اللہ ولا تطع الکافرین والمنافقین۔ (۳۳/۱)

یعنی اے نبی! اللہ سے ڈر، اور کافروں اور منافقوں کا کہا نہ کر۔

اب کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ حکم نبی کے ساتھ ہی مختص ہے؟

ہرگز نہیں!

پھر کون نہیں جانتا کہ صدقات کی تقسیم رسول خدا کے ساتھ خاص نہ تھی آنجناب لوگوں میں مناسب دیکھ کر صدقات تقسیم کیا کرتے تھے بعض لوگ ایسے بھی ہوتے تھے کہ اگر انہیں صدقہ دیا جاتا تو خوش ہوتے تھے اور اگر نہ دیا جاتا تو ناراض ہو کر رسولِ خدا پر طعن کرتے تھے۔ اللہ تعالے فرماتا ہے کہ:۔

"اگر وہ اس پر راضی ہوتے جو اللہ اور رسول نے انہیں دیا ہے اور یوں کہتے کہ اللہ ہمارے لئے کافی ہے قریب ہے کہ اللہ ہمیں اپنے فضل سے دے گا اور اس کا رسول بھی بالتحقیق ہم تو اللہ کی طرف راغب ہیں۔ (تو کیا خوب ہوتا)۔ (۹/۵۹)

اس آیت سے صاف واضح ہوتا ہے کہ صدقہ نہ ملنے والوں کو بجائے ناراض ہونے اور عیب لگانے کے مذکورہ بالا آیات کہنی چاہیئے۔

اس وقت بھی حکام کو ناداروں کی اعانت وامداد کے لئے صدقات تقسیم کرنے لازم ہیں تو کیا اس وقت مذکورہ بالا حکم کے مطابق لوگوں کو یہ کہنا

چاہیئے کہ خود رسولِ خدا ہمیں صدقات دینے آئیں گے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اللہ اور ہمارے حاکم ہمیں دیں گے۔ ہم اللہ کی طرف راغب ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ ان خدمات کی بجا آوری کے لئے جو رسول سے دوسرے حکام کی طرف منتقل ہو سکتی ہیں ۔ رسول کے موجود نہ ہونے کے وقت دوسرے منتظمین مراد ہوتے ہیں۔

پھر دیکھو کہ رسولِ خدا عرب کے لوگوں کی حفاظت اور قیام آزادی کے لئے اپنی جان کو خطرے میں ڈالتے تھے یہ تمام عربوں کا مشترکہ کام تھا ان کے لئے مناسب نہیں تھا کہ اپنی جانوں کو عزیز رکھ کر گھروں میں بیٹھے رہتے اور نبی کا ساتھ نہ دیتے۔ ان کا ایسا کرنا حق شناسی سے بالکل دور تھا۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

"مدینہ والوں اور ان کے اردگرد کے اعراب کے لئے لائق نہیں تھا کہ رسولِ خدا کا ساتھ چھوڑ کر پیچھے رہ جاتے اور نہ یہ (مناسب تھا) کہ اس کی جان کی پرواہ نہ کر کے اپنی جانوں کی طرف راغب ہوتے۔" (۹/۱۲۰)

اب عنایت فرما کر للہ کوئی صاحب بتلائیں کہ کیا یہ آئت رسولِ خدا کے ساتھ ہی خصوصیت رکھتی ہے اور کیا یہ حکم صرف اہل مدینہ اور ان کے اردگرد کے اعراب کے ساتھ ہی چل بسا۔ اور کیا یہ آئت اسوقت نکمی بلکہ مردہ ہو گئی ہے ہرگز نہیں اسوقت دیگر بادشاہوں اور خلیفوں کے متعلق بالکل یہی حکم ہے۔ اس آیہ مبارکہ سے پہلی آیت میں مؤمنوں کو ارشاد کیا گیا ہے کہ صادقوں کا ساتھ دو اور اس آیت کے بعد جو اس حکم کی دلیل دی ہے وہ بھی بطور کلیہ اصول اور دائمی صداقت کے بیان فرمائی گئی ہے پس ایسی آیتوں میں رسول خدا کے گذر جانے کے بعد یقیناً یقیناً دیگر حکام و خلفاء ہی مراد ہوتے ہیں۔

پھر جب مدینہ میں اسلامی عدالتیں قائم کی گئیں اور طاغوتی کچہریوں کی طرف جانے سے مسلمانوں کو روکا گیا تو منافق لوگ مسلمان کہلاتے ہوئے

بھی وہاں جانے سے باز نہ آئے لیکن جب ان کو ان طاغوتوں سے نقصان پہنچتا تھا تو رسولؐ خدا کے پاس آتے اور جھوٹ بول کر اپنی صفائی جتاتے۔ لیکن اپنے قصور کا اقرار کرنے اور معافی چاہنے کا سیدھا راستہ اختیار نہ کرتے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

(اے رسول) جب انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تو اگر وہ تیرے پاس آتے پھر اللہ سے بخشش مانگتے اور رسول بھی ان کے لئے بخشش مانگتا تو اللہ کو تواب و رحیم پاتے۔ ($\frac{4}{64}$)

بلا شبہ رسولِ خدا کے ساتھ صفائی کرنے کے لئے حضور کے پاس ہی حاضر ہونا مناسب تھا لیکن کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس وقت بھی حکام کی مخالفت کرنے والوں کو رسولؐ خدا کے مزار پر ہی حاضر ہونا اور خود رسولِ خداؐ کے ساتھ ہی بالمواجہہ صفائی کرنا اور حضور سے بخشش منگوانا لازم ہے۔ ایسی باتیں اسوقت عملی طور پر نہیں کرائی جا سکتیں اسوقت اپنی موجودہ حکام کے پاس جا کر ہی صفائی کرنا لازم ہے حکام کو بھی چاہیئے کہ وہ ہمارے لئے خدا تعالےٰ سے بخشش مانگ کر اپنی رضامندی کا ثبوت دیں۔ پس اس قسم کی تمام آیات میں رسول خدا کے موجود نہ ہونے کے وقت رسول سے مراد آپ کے خلفاء ہی ہوں گے۔

پھر یہ بات بالکل واضح ہے کہ خدا تعالےٰ نے قرآن مجید میں کوئی کجی نہیں رکھی (ولم یجعل لہ عوجا $\frac{18}{1}$) لیکن دشمن ہمیشہ اعتراضات کرتے آئے ہیں اور اس کتاب پاک میں کجیاں ڈالنے کی خواہش کرتے رہے ہیں (یبغونہا عوجا۔ اور تبتغونہا عوجا ($\frac{3}{99}$، $\frac{7}{45}$، $\frac{7}{86}$، $\frac{11}{19}$، $\frac{14}{3}$) اسلام کے دشمن ہر وقت آیات کو عاجز کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں (والذین سعوفی آیاتنا معاجزین $\frac{22}{51}$، $\frac{34}{5}$ والذین یسعون فی آیاتنا معاجزین ($\frac{34}{38}$) دشمن اس طرح سے چاہتے ہیں کہ لوگوں کو قرآن حکیم کی طرف سے روک رکھیں اور اگر ہو سکے تو ضعیف الایمان لوگوں کے دلوں میں شبہات پیدا کر کے انہیں

مرتد بنالیں۔ لیکن جب دشمن دیکھتے ہیں کہ وہ شبہات پیدا کرنے کی بناء پر لوگوں کو اسلام سے نہیں روک سکتے۔ تو وہ ان کو گوناگوں مصائب و آلام میں پھنساتے اور مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے ان پر چڑھائی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

ولا یزالون یقاتلونکم حتی یردوکم عن دینکم ان استطاعوا۔ (۲۱۷/۲)۔ یعنے یہ لوگ تمہارے ساتھ جنگ کرنے سے کبھی نہیں ٹلیں گے جب تک تمہیں تمہارے دین سے نہ پھیرلیں اگر اُن کا بس چلے۔

اندریں حالات نہایت ضروری ہے کہ مسلمانوں میں آیات الٰہی کے عالم بالضرور موجود ہوں جو نئے نئے اعتراضات کا تسلی بخش جواب دے سکیں۔ اور یہ بھی لازم ہے کہ ان کے لئے ایسے ہمدرد بادشاہ اور خلیفے بھی ہوں جو اُن سے ظالموں کے جبر کو ٹال سکیں۔

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ حدیثوں پر آیات الٰہی سے سینکڑوں گنے زیادہ اعتراضات وارد کئے جاتے ہیں۔ سو اگر حدیثیں بھی فرضاً قرآن مجید کی مثل ہی ہیں تو ان کے عالم بھی مسلمانوں میں موجود ہونے لازم ہیں جو ان سے اعتراضات کا دفعیہ کر سکیں۔

حاصل یہ ہے کہ آیات اللہ کے ساتھ یا قرآن و حدیث دونوں کیساتھ بھی مسلمانوں کی ایمانی و جانی حفاظت کے لئے ایسے عالم و حاکم ہونے ضروری ہیں جو ظالموں کے بہتانوں اور جنگوں کی مدافعت کر سکیں۔ قرآن مجید کے نزول کے وقت ایسے عالم و حاکم خود رسولِ خدا موجود تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"تو کہدے اے کتاب والو تم اللہ کے رستے سے اس کے لئے کجیاں ڈھونڈتے ہوئے اس شخص کو جو ایمان لایا کیوں روکتے ہو۔ حالانکہ تم خبر رکھتے ہو۔ اور اللہ تمہارے کاموں سے غافل نہیں اے ایمان والو اگر تم اہل کتاب کے ایسے فریق کی اطاعت کرو گے تو وہ تم کو تمہارے ایمان کے بعد کافر بنا کے موڑ لیں گے۔

اور تم کس طرح کفر میں پھنس سکتے ہو حالانکہ تم پر آیات اللہ پڑھی جاتی ہیں اور تمہارے درمیان اس کا رسول موجود ہے۔ (جو تم سے ظالموں کے بہتانوں اور ان کے ظلموں کی مدافعت کر رہا ہے) اور جو اللہ کو مضبوط کر کے پکڑ لیوے تو وہ سیدھے رستے کی طرف چلا گیا۔

اے ایمان والو اللہ سے ڈرو، جیساکہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور مت مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو" اور اللہ کی رسی کو اکھٹے ہو کر مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو اور فرقے فرقے مت بن جاؤ۔ اور اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے یاد کرو۔ جبکہ تم آپس میں دشمن تھے سو اللہ نے تمہارے دلوں کے درمیان جوڑ لگا دیا۔ سو تم اس کی نعمت (قرآن) سے بھائی بھائی ہو گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے۔ یعنی جہالتوں اور شرارتوں اور بدامنیوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ سو تم کو اس سے رہائی بخشی۔ یوں اللہ تمہارے لئے اپنی آیات بیان فرماتا ہے تاکہ تم ہدایت پاتے رہو۔ اور چاہیئے کہ تم میں ایسی جماعت موجود رہے جو خیر کی طرف بلائیں اور معقول بات کا حکم کریں اور نامعقول سے منع کریں اور وہی لوگ بامراد ہونے والے ہیں اور ان لوگوں کی مانند مت بننا جو فرقے فرقے ہو گئے اور انہوں نے روشن بیانات کے آنے کے بعد اختلاف کیا۔ اور وہی لوگ ہیں جن کے لئے بڑا عذاب ہے" ($\frac{۳}{۱۰۵،۱۰۲}$)

ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان ایمانداروں کا کافر بننا ایک حیرت انگیز بات ہے جن پر قرآن مجید پڑھا جاتا ہو۔ اور رسول جیسے نگرانی کرنے والے ان کے درمیان موجود ہوں۔ اگر رسول سے مراد صرف محمد رسول اللہ ہی ہیں اور ان کے بعد کوئی ان کی جگہ کام دینے والا نہیں۔ تو ان آیات سے صاف معلوم ہوگا کہ پچھلی امت کا کافر بننا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ معاذ اللہ!

اور چونکہ رسول خدا اپنی حین حیات میں بھی ہر جگہ موجود نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے لازم تھا کہ مسلمان ہر جگہ بھائی بھائی بن کر ایک تنظیم میں پروئے جائیں اور ان میں ہمیشہ مبلغ بھی موجود رہیں۔ جو رسولِ خدا کی جگہ کام دے سکیں اور اسی لئے ان تمام آیات میں ان تمام مراتب کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ پس ایسی آیات میں جہاں رسولِ خدا نہ ہوں وہاں ان کی جگہ کام کرنے والے مراد ہوتے ہیں جن خدمات کی بجا آوری رسولِ خدا سے دوسروں میں منتقل ہو سکتی ہے ان خدمات کو رسولِ خدا کے ساتھ ہی خاص کرنے کے کوئی معنے نہیں۔

پھر دیکھیئے کہ حق تعالیٰ کا منشا ہے کہ ہم حق کی پیروی کریں اور اس پر چلیں حق کا علم وحی الٰہی اور عقل سے ملتا ہے جو حق وحی الٰہی سے صفائی کے ساتھ نظر آجاتا ہے وہ یقینی ہوتا ہے۔ اور جس حق کی دریافت میں غور و فکر کا دخل ہے وہ انسانی عقل کی کمزوری کے باعث بدل بھی سکتا ہے اور غلطی کے معلوم ہو جانے پر نئے سرے سے تحقیق کر کے پھر حق کو ہی پانے کی کوشش کرنی لازم ہوتی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ وحی کے بتلائے ہوئے حق پر چلنا تو صراحتہً خدا تعالےٰ کی اطاعت ہے اور عام عقل سے بھی یہی مقصود ہونا چاہیئے کہ اپنی بساط کے مطابق خدا تعالےٰ کا ہی منشا معلوم کیا جائے اور اس طرح یہ بھی خدا تعالےٰ کی ہی فرماں برداری ہے مگر اس قسم کی جس میں خطا کا امکان ہے۔

اور یہ بھی واضح ہے کہ ان قوانین وحی اور قوانین عقلی کے موجود ہوتے ہوئے بھی اکثر لوگ اپنے معاملات و مقدمات کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان قوانین کے ساتھ حکام کا موجود ہونا بھی لازم ہے۔ اور تاکہ مقدمات کی زیادہ تحقیق کا موقعہ مل سکے عدالت اپیل کا ہونا بھی ضروری ہے اعلیٰ عدالت اپیل کے حکم کی اسی عدالت سے نظر ثانی کرانا بھی جائز ہے۔

رسولِ خدا کے عہد میں اعلےٰ عدالت اپیل خود رسول خدا کے ہاتھ میں تھی اور ماتحت حکام (اولوالامر) بھی موجود تھے۔ جو انہیں لوگوں سے مقرر کئے جاتے تھے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

بالتحقیق اللہ تم کو حکم کرتا ہے کہ امانت والوں کو ان کی امانتیں پہنچادو۔ اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو، تو عدل کیساتھ فیصلہ کرو۔ بیشک اللہ تمہیں نہایت عمدہ بات کا حکم دیتا ہے۔ بلاشبہ اللہ سمیع و بصیر ہے۔ اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول و اولی الامر کی جو تمہیں میں سے ہیں۔ پھر اگر تم کسی بات میں جھگڑا کرو۔ تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیرو۔ اگر تمہیں اللہ اور روز آخرت پر ایمان ہے یہ بات بہتر ہے اور نتیجہ کے لحاظ سے بہت خوب ہے۔ (۴/۵۸–۵۹)

اب یہ بات ظاہر ہے کہ قواعد و قوانین خواہ کسی قسم کے بھی کیوں نہ سمجھے جائیں ان کے مطابق فیصلہ کرانے کے لئے نہ گذشتہ اولوالامر ہی لائے جاسکتے ہیں اور نہ خود رسول خدا ہی تشریف لا سکتے ہیں۔ پس ان آیات کے حکم کے مطابق اعلےٰ حاکم اور ماتحت حکام ہمیں میں سے ہونے لازم ہیں اور اگر ہمیں اللہ اور آخرت پر ایمان ہے تو ہمیں ان کی اطاعت اسی طرح کرنی فرض ہے جس طرح آیت میں حکم ہے۔ ایمان کے بعد وصف فسوق بہت بری بات ہے (۴۹/۱۱) جس طرح ٹھٹھا کرنا اور عیب لگانا اور نام دھرنا۔ وصف ایمان کے ساتھ بہت بری چیز ہے (۴۹/۱۱) اسی طرح حکام کی نافرمانی بھی وصف ایمان کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "مطلقات کے لئے حلال نہیں کہ جو اللہ نے ان کے پیٹوں میں پیدا کیا ہے اسے چھپائیں۔ اگر انہیں اللہ اور آخرت پر ایمان ہے (۲/۲۲۸)" اور یہ ظاہر ہے کہ کہ مطلقات اپنے حمل اپنے خاوندوں سے ہی چھپائیں گی۔ پس خاوندوں

سے چھپانا بھی وصفِ ایمان کے منافی ہے۔ ایسی باتوں سے رسول کی خصوصیت نہیں ثابت کی جا سکتی۔ خصوصیات گھڑنے والے قرآن پاک کی اکثر آیات کو مردہ ٹھہرانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ افسوس!

پھر اور لیجئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"اور جب ان کے پاس کوئی بات امن یا خوف کی آتی ہے تو اسے پھیلا دیتے ہیں اور اگر یہ لوگ اس (افواہ) کو رسول و اولو الامر کے آگے جو انہی میں سے ہیں پیش کرتے تو ان میں سے جو استنباط کرتے ہیں۔ اسے جان لیتے اور اگر تم پر اللہ کا فضل (قرآن) اور اس کی رحمت (استنباط و تنظیم) نہ ہوتی تو تم شیطان کے پیچھے لگ جاتے مگر تھوڑے۔ (۱۴/۸۳)

اب کوئی صاحب خدا تعالیٰ کے لئے مجھے بتائیں کہ کیا ہمیں اس وقت افواہوں کو رسولِ خدا کے حضور میں پیش کرنا اور ان کے متعلق حضور سے استنباط کرانا جائز بلکہ ممکن ہو سکتا ہے اور کیا حضور انور اس وقت ہماری نئی سنی ہوئی افواہوں میں استنباط کر کے ہمیں بتلا سکتے ہیں کہ فلاں خبر صحیح معلوم ہوتی ہے اور فلاں غلط ہرگز نہیں۔

حاصل یہ ہے کہ رسول سے مراد رسول یا ان کی جگہ دوسرے کام کرنے والے (خلیفہ) ہوتے ہیں رسولِ خدا کو مشورہ کا حکم تھا۔ اب ان کی جگہ دوسرے حکام کریں گے۔ رسولِ خدا اپنے ذاتی خدمات و افعال کی بجا آوری کے لئے بھی دنیا میں موجود نہیں ہیں اس قسم کی آیات سے قرآن مجید بھرا پڑا ہے۔ ذیل میں چند ایک کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

(۱) سورۂ حجرات کا پہلا تمام رکوع بالخصوص "لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی" (۲) سورت النور کا ششم و نہم رکوع

(۳) فأذنوا بحرب من اللہ و رسولہ ۔۔۔ (سورۂ بقرہ)

(۴) قل الانفال للہ والرسول (۹/۱) (۵) انما جزاؤ الذین یحاربون اللہ ورسولہ۔ (۵/۶) (۶) واذ کنت فیھم فاقمت لھم الصلوٰۃ۔ (۴/۱۲)
(۷) قل للمخلفین من الاعراب ستدعون الی قوم (۴۸/۱۶)
(۸) أحب الیکم من اللہ ورسولہ وجہاد فی سبیلہ (۹/۲۲) وغیرہ

حاصل یہ ہے کہ چونکہ "ما اٰتکم الرسول فخذوہ ومانھاکم عنہ فانتھوا" کا تعلق حکم فے سے ہے اس لئے یہ

خاصۂ رسولِ اکرم نہیں

اور جب یہ حکم مذکورہ مسئلہ کے لحاظ سے خاصہ نہیں بن سکتا تو ان مسائل کے لحاظ سے کیونکر خاصہ ہو سکتا ہے جن کا اس کے آگے پیچھے کوئی ذکر ہی نہیں۔

علاوہ بریں قرآن مجید رسول خدا نے ہمیں بطور کتاب کے پہنچایا ہے۔ لیکن حدیثوں کے لکھنے سے منع کیا ہے حضور اکرم وصیت جیسی ضروری حدیث کے لکھنے سے بھی باز رہے۔

استفسار ہشتم:۔ مولانا کا ارشاد ہے کہ رسول کریم کے وہ اجتہادات جو دینی امور سے علاقہ رکھتے تھے وحی الٰہی ہوا کرتے تھے لیکن یہ بات محض خوش اعتقادی سے فرض کرلی گئی ہے۔ انسانی اجتہاد کو وحی الٰہی قرار دینا بالکل بے معنی بات ہے ہاں تصدیق الٰہی سے ہر شخص کی بات صحیح مانی جا سکتی ہے۔ اگر حضرت عمرؓ کی بعض باتوں کی تائید قرآن فرماتا ہے تو ان کا انکار یقیناً قرآن کا انکار ہے (یہ مسائل علماء میں موافقات عمرؓ کے نام سے مشہور ہیں)

لیکن یہ بڑی حیرانی کی بات ہے کہ کوئی رسول محض اپنی بشری عقل سے کرے تو اجتہاد۔ اور خدا تعالیٰ اس اجتہاد کی تصدیق بھی نہ فرمائے باوجود اسکے اس بشری اجتہاد کو محض الٰہی خاموشی کی سند سے عین وحی الٰہی بنا دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول مقبول کو غیر وحی والے لوگوں کے ساتھ مشورہ کرنے کا

حکم دیا ہے اور ہمیں بھی مشورہ کرنے کا ارشاد کیا ہے۔ اب یہ کیسے خیال میں آسکتا ہے کہ اگر ہم کسی دینی امر کے متعلق یا کسی دینی اختلاف کو مٹانے کی خاطر آپس میں مشورہ کریں تو ہمارا مشورہ وحی نہ قرار پا سکے۔ لیکن اگر رسول کریمؐ صحابہ کے ساتھ اسی طرح کسی دینی بات مثلاً نماز کے لئے بلانے کے متعلق مشورہ کریں تو ایسا مشورہ وحی الٰہی بن جائے۔ حاشا وکلّا۔ کوئی بات انسان کا مشورہ ہونے کے لحاظ سے وحی الٰہی کا درجہ نہیں پا سکتی۔ مشورہ کے بعد بھی مشورہ کیا جا سکتا ہے اگر پہلا مشورہ وحی سمجھا جائے تو آئندہ مشورہ کی اجازت دینا محض فضول ہو جائے گا۔

رسول مقبول کے بعد اجتہاد کی ضرورت برابر قائم رہی ہے۔ بڑے بڑے مجتہدوں نے اجتہاد کئے ہیں۔ خدا تعالےٰ بھی ہمیں تدبر و تفکر و تعقل و تذکر کا دائمی حکم دیتا ہے لیکن یہ بات ہماری سمجھ سے بالا ہے کہ عہدِ رسالت کا بشری اجتہاد تو وحی الٰہی سمجھا جائے مگر بعد کے کسی ویسے ہی ضروری اجتہادوں کے لئے وحی الٰہی ہونے کی کوئی ضروری شرط نہ ہو۔ اگر ہمارے زمانہ میں معمولی اجتہادوں سے کام چل سکتا ہے تو عہدِ رسولؐ میں کیوں نہیں چل سکتا تھا۔ رسول خداؐ اور دیگر اولوالامر عہدِ رسالت میں بھی استنباط کیا کرتے تھے اب بھی استنباط کیا جاتا ہے۔ رسولِ خداؐ بھی دین میں بشری عقل سے کام لیتے تھے۔ ہمارے زمانہ میں بھی عقل سے کام لینے کی ضرورت ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے خداؐ اُن پر پلیدی ڈالتا ہے (ویجعل الرجس علی الذین لا یعقلون) اب کیا یہ پلیدگی دین سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی افسوس! ایک استنباط و عقل کو کسی جگہ وحی بنا دینا اور کسی جگہ غیر وحی کہدینا عجیب انصاف ہے۔ کیا پہلا اجتہاد پچھلے اجتہاد کے لئے اور پہلی بشری عقل پچھلی عقل کے لئے اور پہلا مشورہ پچھلے مشورہ کے لئے اور عہدِ رسالت کے منصفوں کا فیصلہ پچھلے منصفوں کے لئے روک ہو سکتا ہے۔ اگر روک ہے۔ تو ان باتوں کی اجازت کیوں دی گئی ہے؟

عہدِ رسالت میں مہاجر عورتوں کے ایمان کا امتحان کیا جاتا تھا۔ یہ امتحان بالکل ظاہری علامات کے لحاظ سے ہی ہوتا تھا۔ یہ دینی امتحان عہدِ رسالت میں بہمہ وجوہ اسی طرح سے کیا جاتا تھا جیسا کہ اب ہو سکتا ہے۔ ان عورتوں کے درحقیقت مومن ہونے کو عہدِ رسالت میں بھی صرف خُدا ہی جانتا تھا اور اب بھی خدا ہی جانتا ہے (اللہ اعلم بایمانھن) جب بات یہ ہے تو رسولِ خدا کی دینی حکموں میں بشری تحقیقات کو کیوں دوسرے بشروں سے الگ کیفیت کا قرار دیا جاتا ہے۔

مولانا صاحب بحوالہ شاہ صاحب رسولِ کریمؐ کے متعلق بیان فرماتے ہیں کہ:۔

"کھجوروں کے جفت ہونے کے معاملہ میں آپؐ کا یہ ارشاد کہ میں نے ایک رائے قائم کی تھی اور تم لوگ میری رائے پر عمل نہ نہ کرو۔ البتہ جب میں خدا کی طرف سے تمہارے سامنے کوئی بات بیان کروں تو اسکو قبول کر لو۔ کیونکہ میں خدا کے معاملہ میں جھُوٹ نہیں کہتا۔"

اس جگہ رسولِ کریم بیان فرماتے ہیں کہ میں دو قسم کی باتیں کرتا ہوں ایک وہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے لاکر تمہارے سامنے رکھ دیتا ہوں۔ اور دوسری وہ جو اپنی رائے سے بیان کرتا ہوں اور یہ ظاہر ہے کہ خدا تعالےٰ کی طرف سے لائی ہوئی باتیں وحی الٰہی تھیں۔ پس ضرور ہے کہ آپ کی رائے کی باتیں ہرگز ہرگز وحی الٰہی نہ ہوں۔ بلکہ بمنزلہ وحی بھی نہ ہوں کیونکہ حسب بیان مولانا صاحب رسولِ کریمؐ نے اپنی رائے کے متعلق صاف فرما دیا ہے کہ تم میری رائے پر عمل نہ کرو۔ اب کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ حضور کی رائے اور آں جناب کا کوئی اجتہاد بھی عین وحی الٰہی ہوتا تھا یا بلا تصدیق الٰہی خدا تعالےٰ کی محض خاموشی کے سبب

وحی الٰہی قرار دیا جا سکتا تھا۔

وحی الٰہی تو من عند اللہ ہوتی ہے۔ اس لئے وحی الٰہی میں اختلاف نہیں ہو سکتا۔ (ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً)

لیکن اجتہاد بندے کی طرف سے ہوتا ہے۔ پس اس میں اختلاف کا ہونا ممکن ہے۔

اگر کسی انسان کا اجتہاد بھی بمنزلہ وحی یا بے اختلاف ٹھہرایا جا سکتا ہے تو قرآن مجید بھی بے اختلاف ہونے کی دلیل سے صرف اسی قسم کا اجتہاد ہی ثابت ہوگا۔

دیکھئے اجتہاد نبی کو وحی قرار دینے سے قرآن مجید بھی نبی کے اپنے اجتہاد سے زیادہ نہیں ثابت ہو سکتا۔ جب لوگ اس اجتہاد کو بھی مثلہ معہ کہتے ہیں تو دو مثلوں میں بڑا کون اور چھوٹا کون؟

افسوس! نبی کے بشری اجتہاد کو بڑھانے کے لئے اس کی کچھ پروا نہیں کی جاتی کہ اس سے قرآن مجید کی کیا قدر باقی رہ جاتی ہے۔

استفسار نہم:۔ اللہ تعالےٰ نے جن باتوں کو ہمیں وحی یقینی کے ذریعہ سے دینا منظور فرمایا ہے وہ سب کی سب قرآن مجید میں آگئی ہیں۔ کوئی ضروری وحی قرآن مجید سے باہر نہیں چھوڑی گئی۔ اس کتاب عزیز کے بھیجنے سے خدا تعالےٰ کا یہ منشاء ہے کہ ہمیں ایک ہی بنیادی وحی عطا فرما کر کسی اور زائد وحی کی تلاش سے سبکدوش فرما دے یوں قرآن حکیم کے بعد ہمارے لئے دیگر غیر محفوظ باتوں کو بطور وحی یقینی کے تلاش کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رکھی گئی۔ ہاں عقلی اور اجتہادی طور پر ہم ہر جگہ سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اور جب کوئی بات غلط معلوم ہو تو اُسے بلا تکلف ترک بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن حقیقی وحی یعنی قرآن مجید کی کوئی آیت بھی کسی حال میں نظرانداز نہیں کی جا سکتی۔ قرآن عزیز رسولِ مقبول ؐ کی باتوں

کو برابر توڑتا رہا ہے لیکن رسولِ امین کو یہ منصب و اختیار کبھی نہیں ملا کہ حضورِ اکرم قرآن معصوم کی کسی آئت کو ترک کر دیں یا اسے بدل دیں۔ (فلعلک تارک بعض مایوحی الیک وضائق به صدرک (۱۱/۱۲) اور (قل مایکون لی ان ابدلہ من تلقاء نفسی (۱۰/۱۵)

رسولِ کریمؐ خدا تعالیٰ کے دخلِ خاص سے قرآن مجید کے پانے اور اسے لوگوں کو پہنچانے میں محفوظ و معصوم رکھے جاتے تھے اب بھی قرآن پاک ذمہ الہٰی کے سبب معصوم ہو کر ہی پہنچ رہا ہے۔ تبلیغ قرآن کے علاوہ تمام بشر ایک ہی کیفیت کے ہیں۔ کوئی بھی اپنی ذات میں سارے کا سارا معصوم نہیں۔ اگر رسولِ کریمؐ کی بشریت دوسرے بشروں سے کوئی الگ حکم رکھتی تھی تو خدا تعالےٰ کا یہ فرمانا ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا کہ اگر تم اس چیز سے جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے، شک میں ہو تو تم اس رسولؐ جیسے کسیؐ بندے سے ایک سورت ہی بنوا کر لے آؤ۔ اگر رسولِ کریمؐ بے مثل بشر تھے۔ تو بے مثل کا بے مثل قران کو بنا لینا کیسے بعید ہو سکتا ہے یہ تو رسولِ کریمؐ کے خود ہی قرآن کو بنانے کی دلیل بن جائے گی۔

پھر جب رسول کی مانند کوئی بندہ تھا ہی نہیں تو یہ کہنا سراسر غلط ہوگا کہ اگر اس نے خود یہ قرآن بنا لیا ہے تو تم بھی اس جیسے کسی بندے سے ایک سورت ہی بنوا لاؤ۔ جب رسول جیسا کوئی بشر موجود ہی نہ تھا تو اس بات کے ثبوت کی کونسی صورت ممکن تھی کہ یہ قرآن رسولؐ نے خود ہی نہیں بنا لیا۔ قرآن مجید کا محض الہٰی تصرف سے ملنا صرف اسی صورت میں ثابت ہو سکتا ہے جبکہ وحی کے علاوہ رسولِ خدا دوسرے بشروں جیسے بشر ہوں۔ لیکن باوجود اسکے کوئی قرآن کی مثل نہ لا سکے۔ اس سے صاف کھل جاتا ہے کہ قرآن مجید کے علاوہ جو محض تصرف الہٰی سے ملا ہے۔ رسولِ خداؐ کی بشریت بہر کیف دوسرے بشروں کی بشریت جیسی ہی تھی۔ حضورؐ کی بشریت میں کسی ناقابل حصول خصوصیت کا لگانا قرآن کے محض خدا تعالیٰ کی طرف سے ہونے کی دلیل کو مٹانا ہے۔ پناہ بخدا!

پھر یہ بات بھی واضح ہے کہ عہدِ رسالت کے مختلف اوقات میں قرآن مجید کے مقابلہ کا چیلنج دیا گیا ہے اور فرمایا ہے کہ اگر اس رسول نے قرآن مجید کو از خود ہی بنا لیا ہے تو تم بھی بنا کر دکھلاؤ حتیٰ کہ مدنی (سورۂ بقرہ) میں ارشاد کیا ہے کہ تم اس رسول جیسے کسی بندے سے صرف ایک سورت ہی بنوا کر لے آؤ (فاتو بسورۃ من مثلہ) اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید کے بہت بڑے حصے کے نازل ہو جانے کے بعد بھی رسول خدا کی بشریت کسی نئی کیفیت کی نہیں بن گئی تھی خود مدینہ میں بھی رسولؐ جیسی بشریت والے لوگ موجود تھے پس رسول مقبولؐ کی بشریت نہ پہلے ہی کسی اور رنگ کی تھی اور نہ نزولِ قرآن کے بعد ہی کسی اور ڈھنگ کی ہو گئی تھی۔ آپ کی بشریت پر کسی حال میں بھی کوئی نیا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

اندریں حالات ہمارے لئے کچھ ضروری نہیں رہتا کہ ہم قرآن مجید کے علاوہ رسول کریمؐ کے باقی اقوال و افعال کو بھی بطور وحی الٰہی کے تلاش کر کے مانیں ہاں عقلی طور پر انہیں احسن و اَہدیٰ دیکھ کر لے لینا بلا شبہ ضروری ہے۔ اَحسن و اَہدیٰ بات ہر جگہ سے لے لینی چاہیئے۔

حاصل یہ ہے کہ قرآن مجید کے ساتھ حدیثیں بطور وحی الٰہی ہرگز ہرگز نہیں لی جا سکتیں

لیکن اگر خدانخواستہ قرآن مہیمن کے ساتھ کسی اور شئے کا بطور وحی الٰہی کے ماننا ضروری سمجھا جائے۔ تو یہ حق احادیث کی جگہ تورات و زبور و انجیل اور دیگر کتب الٰہی کو ہی ملنا لازم ہے۔

اللہ تعالےٰ اپنے رسول کو فرماتا ہے کہ "تو ملّتِ ابراہیمؑ کی پیروی کر" اور یہ بھی اِرشاد کیا ہے کہ "تو ہدایت والے لوگوں کی ہدایت پر چل" (فبھدٰھم اقتدہ) دوسرے لوگوں کو بھی فرمایا ہے کہ "تم ملتہ ابراہیمؑ پر چلو" علاوہ بریں صحف ابراہیمؑ اور صحف موسیٰؑ اور انجیل کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ تورات کے متعلق فرمایا ہے کہ اس میں ہدایت و نور ہے اور یہ بھی کہ انبیا اور ربانی لوگ اور

احبار اسی پر فیصلے کرتے آئے ہیں۔ یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ خدا تعالےٰ نے حضرت عیسےٰؑ کو بھی تورات سکھا دی تھی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس وقت سے یہود کے ساتھ نصاریٰ بھی تورات کے محافظ بن گئے تھے یہ دونوں ایسی قومیں ہیں۔ جن میں سخت دشمنی چلی آتی ہے۔ ہمارے رسول کریمؐ کی زبان سے بھی کہلوایا کہ تم قرآن و تورات سے زیادہ ہدایت والی کوئی اور الٰہی کتاب لے آؤ۔ میں اس کی پیروی کروں گا اور تورات کے متعلق ہمیں یہ ڈر سنایا کہ "من لم یحکم بما انزل اللّٰہ فاولئک ھم الکافرون" اور فاولئک ھم الظلمون"۔

یہودی لوگ اپنے بھائیوں کو ان کے گھروں سے نکال دیتے تھے۔ لیکن جب وہ غیر اقوام کی قید میں پھنسکر آتے تو فدیہ دیکر انہیں چھڑا دیتے تھے۔ حالانکہ ان کو پہلے نکال دینا بھی ان پر حرام تھا۔ اللّٰہ تعالیٰ ان کو عتاب کرتا ہے کہ "کیا تم کتاب کے ایک حصہ کو مانتے ہو۔ اور دوسرے حصّہ کا کفر کرتے ہو" اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ تورات کا ماننا اور اس کے مطابق فیصلہ دینا اور اس پر عمل کرنا کسقدر ضروری ہے۔

اسی طرح انجیل والوں کو حکم کیا کہ اللّٰہ نے جو کچھ اس میں اتارا ہے۔ اس کے مطابق فیصلے کریں۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی شخص اللّٰہ کے اتارے ہوئے پر صرف اسی صورت میں ہی عمل پیرا ہو سکتا اور فیصلہ کر سکتا ہے جبکہ اسے معلوم ہو سکے کہ یہ کچھ اللّٰہ نے اتارا ہے۔ آگے فرمایا کہ جو کوئی اللّٰہ کے اتارے پر فیصلہ نہ کرے تو وہی لوگ فاسق ہیں۔ (ومن لم یحکم بما انزل اللّٰہ فاولئک ھم الفاسقون)

اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ خود عہدِ رسالت میں بھی انجیل میں آئی ہوئی خدائی تعلیم پر فیصلہ نہ کرنا کس قدر بُرا ٹھہرایا گیا ہے۔ پھر اللّٰہ تعالےٰ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "اہل کتاب سب کے سب

یکساں طور پر بُرے نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں سے ایسے بھی لوگ ہیں۔ جو راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن آیات کو وہ رات کے وقت اپنی نمازوں میں پڑھا کرتے تھے۔ وہ سچ مچ آیات اللہ ہی تھیں۔ یہ ہے تورات اور انجیل کی تصدیق۔ پھر کیا قرآن مجید میں حدیث کے وحی الٰہی ہونے پر بھی ایسی ہی دلائل موجود ہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں!

اس بیان سے روشن ہو جاتا ہے کہ اگر قرآن مجید کے ساتھ کسی اور چیز کو بطور وحی الٰہی کے شامل کرنے کی ضرورت ہوتی یا اُسے الٰہی خاموشی کی سند سے بمنزلہ وحی بنانا ہوتا تو یہ حق قرآن مجید کے ساتھ صرف تورات و انجیل اور دیگر کتب انبیاء کو ہی دیا جا سکتا تھا۔ نہ کسی رسول کی احادیث کو۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید نے جس بات کو بطور وحی الٰہی کے منوانا چاہا ہے اسے اپنی محفوظ وحی میں شامل کر لیا ہے۔ اپنے سے باہر نہیں رہنے دیا۔ ہمارے رسولِ کریمؐ کے اقوال و افعال و خدمات و گھر بار کے حالات دیگر رسل و انبیاء کی نسبت بہت زیادہ قرآن مجید میں لائے گئے ہیں۔ سو جب دیگر تمام کتب الٰہی کی تعمیل اور رسل و انبیاء کی پیروی اسی قرآن کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے اور اسی سے ان کا اسوۂ حسنہ مل سکتا ہے تو کیا رسولِ کریمؐ کی اطاعت کے لئے قرآن مجید سے باہر جانے اور اس کے ساتھ ایک دوسری وحی کو شامل کرنے کی ضرورت باقی ہے۔ افسوس!

استفسار دہم: مولانا صاحب مخدوم بحوالہ شاہ صاحب مرحوم رسولِ کریمؐ کے اقوال و افعال کی دو قسمیں قرار دیتے ہیں۔ اوّل حضور کے وہ اقوال و افعال جو منصب رسالت و تبلیغِ شریعت اور عبادت اور معاد اور عجائبات ملکوت اور اجتماعیات کے گذشتہ تعینات سے علاقہ رکھتے ہیں۔ مولانا اور شاہ صاحب ایسی تمام باتوں کو ہمپایۂ وحی قرار دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ رسول مقبولؐ کے

عہ یعنی جن تحریفات (غلطیوں) کی نشاندہی قرآن نے کر دی، اسکے علاوہ باقی تمام تورات و انجیل وحی الٰہی ہوں، کیونکہ اصل میں تو وہ وحی ہی تھیں۔

باقی تمام اقوال وافعال کو وہ ہمپایۂ وحی نہیں سمجھتے۔ بلکہ ان کے متعلق مولٰنا صاحب بلا خوف تردید نہایت صفائی کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں کہ ان کا معراعن الخطا نہ ہونا بے شبہ صحیح ہے رسولِ کریمؐ کے ایسے اقوال وافعال مولینا اور شاہ صاحب کے بیان کے مطابق حسب ذیل ہیں:۔

اوّل:۔ رسولِ کریمؐ کی رائے سے بیان کردہ حکم جیسے کھجوروں کے پیوند لگانے سے آپ نے روک دیا تھا۔ اور اسکا نتیجہ صراحتاً نقصان دہ ہوا۔

دوم:۔ حضورؐ کے بیان کردہ طبّی مسائل

سوم:۔ آپؐ کے وہ حکم جن کا دارومدار تجربہ پر ہے مثلاً آپ نے فرمایا کہ تم لوگ سیاہ وسفید پیشانی کے گھوڑے کو استعمال کیا کرو۔

چہارم:۔ آپ نے جو کچھ علی سبیل العادت نہ علی سبیل العبادت اور اتفاقاً نہ کہ قصداً کیا ہے۔

پنجم:۔ اپنی قوم کے خیالات کے موافق آپ نے جو کچھ بیان کیا ہے جیسے ام زرع کا واقعہ اور خرافہ کی حدیث۔

ششم:۔ اس زمانہ کی جزئی مصلحتیں جو تمام اُمت کے لئے لازمی نہیں ہیں مثلاً فوجوں کی آراستگی اور اس کے شعار کی تعیین یا حضرت عمرؓ کا یہ قول کہ اب ہم کو رمل سے کیا کام ہم اس طریقہ سے ایک قوم پر اپنی قوت و توانائی کا اظہار کرتے تھے۔ اب خدا نے اسکو ہلاک کر دیا۔

ہفتم:۔ آپ کے بہت سے احکام بھی اسی دوسری قسم پر محمول ہیں مثلاً آپ کا یہ ارشاد کہ جس مسلمان نے کافر کو قتل کیا اس کا تمام سامانِ جنگ اسی کے لئے ہے۔

ہشتم:۔ آپ کے مخصوص فیصلے بھی اسی دوسری قسم میں شامل ہیں کیونکہ آپؐ ان میں گواہوں اور قسموں پر اعتماد کرتے تھے۔

برادران! آپ نے دیکھ لیا کہ حدیثی وحی کی قدر اللہ تعالٰی کے نزدیک کیا ہے خدا تعالٰے نے اسکو غیر وحی کے ساتھ اس طرح مخلوط کر دیا کہ اسے سونگھ

سونگھ کر دریافت کرنے کی ضرورت ہے لیکن افسوس ہے کہ میری قوت شامہ ایسی تیز نہیں ہے، خدا تعالےٰ نے قرآن مجید کی طرح ممتاز کر کے اسے پہنچانا ہی نہیں چاہا۔ قرآن پاک بالیقین ممتاز مجموعہ وحی ہے اس میں حکومت و تجارت اور بیاح و قرضہ اور رہن اور دیگر مالی انتظامات اور کاتبوں کی کتابت اور نکاح اور طلاق اور نہانے دھونے اور رشتہ داروں کے گھروں سے کھانے اور اکھٹے یا علیحدہ کھانے اور شکاری جانوروں کو سکھانے اور ان سے شکار کرانے اور شہد میں شفا ہونے اور جنگ کرنے اور سزائیں دینے اور ایسے ہی اور بہت سی باتوں کا بیان ہے قرآن مجید میں ان باتوں کی تردید و تصدیق بھی موجود ہے جو رسول کریمؐ اور دوسرے لوگوں کو پہلے ▪ بیوں اور پہلی روایتوں سے اور پہلے تجربوں سے معلوم تھیں۔ قرآن مجید میں پہلے رسم و رواج اور خیالات اور آراء کی تصدیق پائی جاتی ہے۔ اگر وحی و غیر وحی کے پرکھنے کے یہی قاعدے ہیں جو مولانا اور شاہ صاحب نے فرمائے ہیں تو کیا ہم اس طرح سے قرآن مجید کی کسی بات کو وحی اور کسی بات کو غیر وحی ٹھیرا سکتے ہیں کیا تورات اور انبیائؑ پر بھی یہی قواعد جاری کر سکتے ہیں۔

برادران! رسول کریمؐ کے گھر میں لوگ کھانے کے لئے آتے اور کھانا کھا کر باتوں کی دلچسپی میں بیٹھے رہتے تھے۔ حضور کو اس سے بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ آنجنابؐ پوری طرح سے جانتے تھے کہ لوگوں کی یہ حرکت اچھی نہیں ہے۔ لیکن حضور حیا کے سبب سے انہیں کچھ نہیں کہتے تھے۔ جب قرآن مجید میں وہی حکم نازل ہوا تو اس وقت آنجنابؐ نے اسے وحی کا حکم سمجھ کر اور حیا کے خیال کو بالائے طاق رکھ کر کھلم کھلا پہنچا دیا۔ اگر آنجنابؐ کے پاس کوئی ایسا گُر ہوتا جو مولانا نے پیش کیا ہے اور جس سے بلا تصدیق قرآن وحی و غیر وحی میں فرق ہو سکتا تو حضور انورؐ بالضرور قرآن سے پہلے ہی پہچان لیا کرتے کہ میری یہ بات ہمپایہ وحی ہے اور اس لئے اس کی تبلیغ ضروری ہے۔ اندریں صورت آنجناب حیا کے باعث اس کی تبلیغ سے ہرگز نہ رُکے رہتے اگر رسول مقبولؐ کو کوئی

ایسا قاعدہ معلوم ہوتا تو آنجناب اپنی معلومات کے متعلق پہلے ہی سمجھ لیتے کہ یہ وحی ہے اور یہ وحی نہیں۔ قرآن مجید کے اترنے کا انتظار نہ کرتے اور اپنی ایسی رائیوں پر عملدرآمد نہ کرتے جس کا نتیجہ نقصان دہ اور ایذا رساں ہوتا تھا۔

اس سے سورج کی طرح واضح ہوجاتا ہے کہ کسی بات کو اس کی ذاتی حیثیت کے لحاظ سے وحی یا غیر وحی سمجھنے کا کوئی عام قاعدہ موجود ہی نہیں تھا۔ قرآن مجید کی تصدیق کے بغیر نہ تورات کی کوئی بات اب ہمارے لئے وحی کی طرح ماننے کے قابل ہے اور نہ انجیل کی۔ حدیث تو صرف لوگوں کو خاص طریقوں کا غلام بنانے کے لئے اور قابلِ اعتراض باتوں کو منوانے کے لئے وحی یا ہمپایہ وحی ٹھیرائی گئی ہے۔

افسوس لوگوں نے قرآن مجید کو حدیثی تفہیم کے ماتحت کر کے اس کی فراخی اور عالی ظرفی اور حکمت کو تباہ کر دیا ہے۔ اور آئندہ اصلاح کرنے اور ترقیات پانے سے روک دیا ہے۔ اور قرآنِ حکیم کی حکیمانہ تبلیغ میں روڑا اٹکا دیا ہے۔ اور کافرگردں کے ہاتھ میں ایک حربہ دیدیا ہے۔ کمترین نے احادیث کے متعلق برہان القرآن اور رسالہ بلاغ میں اور بھی بہت کچھ ہدیہ ناظرین کیا ہے۔ امید ہے کہ مولانا صاحب ان باتوں کا معقول جواب دیکر حدیث کا مثل قرآن وحی الٰہی ہونا ثابت کر کے دکھلائیں گے۔ یا اللہ تعالٰے کو حاضر ناظر جان کر حدیث کو وہی درجہ دیں گے جس کی وہ مستحق ہے۔

ازمرتب: اس کا جواب تو مولانا عبدالسلام نے نہیں دیا۔ مگر ایک تحریر میں یہ تصریح کر دی کہ احادیث قانون کا ماخذ نہیں ہوسکتیں۔ کیونکہ قانون کے لئے باللفظ منقول ہونا ضروری ہے۔ یہ اقتباس ہم مقدمہ میں مولانا عبدالسلام ندوی کے تذکرے میں بحوالہ ماہنامہ "ندیم" گیا پیش کر چکے ہیں۔

تفسیر منسوخ القرآن	علامہ رحمت اللہ طارق
تفسیر القرآن	سر سید احمد خان
احکام القرآن	پروفیسر رفیع اللہ شہاب
عورتوں کے بارے میں قرآنی احکام	پروفیسر رفیع اللہ شہاب
عیسیٰ خود بولے	پروفیسر رفیع اللہ شہاب
سیرت قائد اعظم	پروفیسر رفیع اللہ شہاب
بہبود آبادی کا اسلامی تصور	پروفیسر رفیع اللہ شہاب
انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ	علامہ عبداللہ یوسف علی
تاریخ الامت	علامہ اسلم جیراجپوری
تاریخ اسلام کا جائزہ	علامہ اسلم جیراجپوری
قرآن کی فریاد (مجھے سمجھ کر پڑھو)	پروفیسر علی محسن مظفر
ملایا اسلام	پروفیسر علی محسن مظفر
جاگ مسلمان جاگ	پروفیسر علی محسن مظفر
صنم	پروفیسر علی محسن مظفر
فلطات	محمد یعقوب آسی
قرآن اور فنون لطیفہ	عطاء اللہ پالوی
اسلام میں فرقہ بندی کی ابتداء	[illegible]
آئین اسلام	



تسہیل

برہان القرآن

جس میں قرآن مجید کے بے مثل و بے نظیر
ہونے پر حیرت انگیز دلائل دیئے گئے ہیں

از افادات

مفسر قرآن مجدد عصر حضرت خواجہ [illegible] الازہری